اردو ادب کی ترویج میں انیسویں صدی گجرات کے

رؤساء و امراء کی ادبی خدمات

مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی۔

اردو

نگراں
پروفیسر (ڈُکٹر) محمود ایچ صدیقی
سابق صدر شعبۂ فارسی، اردو و عربی

مقالہ نگار
ذاکرہ بوکس والا

شعبۂ فارسی، اردو و عربی
مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی، بڑودہ، گجرات

2012

URDU ADAB KI TARVEEJ MEN UNNISWIN SADI GUJARAT KE RO'ASA WA UMARAA KI ADABI KHIDMAAT

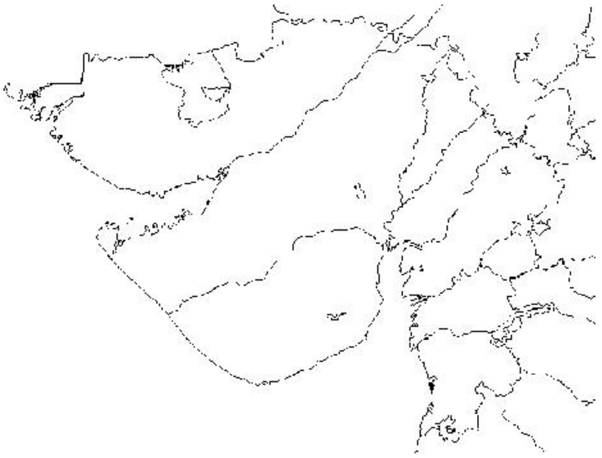

Thesis to be submitted for the
Ph. D. Degree
in

Urdu

Under the Guidance of :
Professor (Dr.) M.H. Siddiqi
HOD (Former), Emeritus Fellow
Deptt of Persian Urdu & Arabic

Submitted by
Zakera Boxwala.

The Maharaja Sayajirao University of Baroda, Gujarat

2012

DECLARATION

I here by undertake that my thesis entitied "URDU ADAB KI TARVEEJ MEN UNNISWIN SADI GUJARAT KE RO'ASA WA UMARA KI ADBI KHIDMAAT" is my original research work and has not previously formed the basis for the award of any digree or diploma or any other similar title or recognition.

Zakera Boxwala
Research Scholar
The M.S.U. of Board,
Baroda
/ / 2012

Under the guidance of
Prof. Dr. M. H. Siddiqui
HOD (Former) Emiritus Fellow
Dept. of Persian, Urdu & Arabic
2012

فہرست مشمولات

گاہے گاہے باز خواں	۵
نقطۂ آغاز	۷
اردو ادب کی تشکیل	۱۰ سے ۱۸

باب اوّل

انیسویں صدی میں گجرات کی مختلف ریاستوں کے سیاسی، سماجی و ادبی حالات	۱۹ سے ۳۴

باب دوم

انیسویں صدی گجرات کی مختلف ریاستوں کے رؤسا و امراء کی ادبی خدمات	۳۵ سے ۴۹

باب سوم

انیسویں صدی میں سورت اور ریاستِ سچین میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں رؤسا و امرا کی خدمات	۵۰ سے ۹۸

باب چہارم

انیسویں صدی میں اردو ادب کے فروغ میں احمدآباد، بڑودہ اور بھروچ کے شعراء و اُدبا کی خدمات اور رؤسا و امراء کی ادبی سرپرستی	۹۹ سے ۱۸۳

باب پنجم

انیسویں صدی میں کھمبات، پالن پور، مانگرول اور جوناگڑھ کی ریاستوں میں اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں رؤسا و امراء کا حصّہ	۱۸۴ سے ۲۵۶

باب ششم

(i) گجرات میں اردو نثر - انیسویں صدی میں	۲۵۷-۲۵۹
(ii) گجرات میں فارسی ادب انیسویں صدی میں	
(iii) گجرات کے ہندو ناگروں کی فارسی خدمات انیسویں صدی میں	
ماحصل	۲۶۰-۲۶۱
کتابیات	۲۶۲ سے ۲۶۶

گاہے گاہے بازخواں ......

اردو جدید ہند آریائی عہد کی ایک یادگار زبان ہے۔ یعنی دو عظیم تہذیبوں کے ملنے کی انمٹ نشانی ہے۔ نہ یہ صرف زبان ہی نہیں بلکہ ہندو مسلم تہذیبی اتحاد کی بنیاد بھی ہے۔ قومی یکجہتی کا سنگ بنیاد ہے۔ اردو اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ ملک کی رنگ برنگی تہذیبوں، مختلف رنگ برنگی زبانوں اور مختلف علاقائی علامتوں کا ایک حسین گلدستہ ہے۔ ان لسانی پھولوں میں فارسی، عربی، ترکی، انگریزی، پورتگولی، سنسکرت، پالی، ہریانوی گویا بے شمار زبانوں کا رنگ ہے۔ اردو قومی یکجہتی، حب الوطنی، بھائی چارگی اور دیش بھگتی کی تاریخ ہے۔

اردو مختلف زبانوں میں ہندی، ہندوی، ریختہ، زبان دہلی، اردوئے معلیٰ اور ہندوستانی ناموں سے پہچانی گئی ہے۔ چنانچہ میر تقی میرؔ نے نکات الشعراء میں اور میر حسن نے ''تذکرۃ الشعراء'' میں نیز مصحفیؔ نے ''تذکرۂ ہندی'' میں''سخن آفریان ہندی''اور''سخن گویان ہندی'' جیسے جملوں کے ساتھ اس زبان کا تذکرہ کیا ہے۔ سولہویں صدی کے صوفی شعراء حضرت شاہ برہان الدین باجنؔ شیخ ملا اشرف اور ملا وجہیؔ نے اس زبان کو ہندی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ غالب اسے ہندی اور اردوئے معلیٰ دونوں ناموں سے یاد کرتے ہیں۔

اردو زبان کی پیدائش کے سلسلے میں مختلف آراء پیش کی گئی ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر تک یہ مانا جاتا رہا کہ شاہجہانی دور میں لال قلعہ اور جامعہ مسجد کے تعمیری کام کے سلسلے میں دور دراز سے مختلف قوموں کے کاریگر' معمار و تاجر وغیرہ جو مختلف مذہب کے ماننے والے اور زبان بولنے والے تھے۔ آباد ہوئے یہ جگہ آج اردو بازار کے نام سے جانی جاتی ہے۔ ان لوگوں میں عرب' ایرانی' ترکی' افغانی اور مقامی آپس میں

سمجھنے اور سمجھانے کا جو ذریعہ زبان بنی وہ اردو کہلائی۔شاہجہان نے اس کو لشکر شاہی کی مناسبت سے اردو کا لقب عطا کیا۔بیسویں صدی میں اس مسئلہ پر مزید سائنٹیفک طریقہ سے تحقیق کا کام ہوا ہے۔جناب محمود شیرانی پنجاب کو اردو کی جائے پیدائش قرار دیتے ہیں۔مسعود حسین خاں نے دوآبِ گنگ وجمن کی پیداوار قرار دیا ہے۔سید سلیمان ندوی اور دیگر حضرات نے اسے مخلوط بولی کی حیثیت سے سندھ کو اصلی وطن بتا یا ہے۔ان تمام محققین نے اپنے اپنے نظریہ کی توضیح میں ہندوستان کی سیاسی' سماجی' اور تجارتی اسباب کو بنیاد بنایا ہے۔اور لسانیات کی روشنی میں جانچ پڑتال کی ہے۔ ان نظریات میں بڑی حد تک اصلیت پائی جاتی ہے۔لیکن محققین نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اگر گجرات کے دعوے کو بھی انہیں کسوٹی پر پرکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اردو کا اصل وطن گجرات ہی ہے۔

☆

نقطۂ آغاز

تاریخ گواہ ہے کہ سر زمین گجرات کی بندرگاہیں تقریباً دو ہزار قبل مسیح سے لے کر اٹھارویں صدی تک ' تاجروں' صوفیائے اکرام' علماو ادبا ملکی و غیرملکی حکمرانوں کی آماجگا بنی رہی۔در حقیقت اردو پندرھویں صدی کے نصف آخر میں ادبی شکل اختیار کر چکی تھی۔کیونکہ سولھویں صدی کی شروعات مین باقاعدہ تصانیف پائی جاتی ہیں۔اس ابتدائی دور کے شعراء و علماء میں شاہ باجن' قاضی محمود دریائی' شاہ علی جیو کامدھنی'اور خوب محمد چشتی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔جن کی تصانیف بھی شائع ہو چکی ہیں۔زیادہ تر محققین اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ اردو زبان کو ادبی شکل سب سے پہلے صوبۂ گجرات میں ملی۔

گجرات صدیوں سے علم و ادب کا سر چشمہ رہا ہے اور صیح معنوں میں ہندوستانی مشترکہ کلچر کا گہوارہ ہے۔علم و ادب کی روایت کو پروان چڑھانے میں گجرات کے حاکم' امراء و رؤسا و صوفیہ حضرات کی خدمات قابل ذکر باعثِ تحسین ہے۔ان شعراء و ادبا میں ولی گجراتی' غزلت سورتی' میاں سجھوؔ میاں داد خاں سیاح و فدا جیسی ھستیاں گزری ہیں۔جن کے کارناموں نے اردو ادب کی تاریخ میں گجرات کا مقام متعین کرنے میں رہنمائی کی ہے۔اردو کی نشو نما کے لئے گجرات ایسا سازگار ثابت ہوا ہے کہ شعری و نثری ادب کے فروغ کا سلسلہ انیسویں صدی کے اواخر تک پروان چڑھتارہا۔لیکن اس کے بعد بیسویں صدی کے آغاز اور بعد مین گجرات میں اردو ادب کو قعر گمنامی نصیب ہوئی۔

آج تک یہ مانا گیا کہ ڈاکٹر سید ظہرالدین مدنی مرحوم کی مایۂ ناز تصنیف سخنوراں گجرات'' گجرات کی اردو ادبی تاریخ کے سلسلے کی آخری کڑی ہے۔اور اب

اس میں مزید اضافہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔آج سے بیس پچیس سال قبل یہ بات صحیح ہوگی۔ لیکن ادھر چند سالوں میں لوگوں میں بیداری آئی ہے۔جو اپنے پرکھوں کے ادبی کارناموں کو منظر عام پر لانے کے متمنی ہیں۔گجرات اردو اکادمی نے اس سلسلے میں پہل کی ہے۔اور نادر و نایاب مخطوطات کو کتابی شکل میں شائع کرنا شروع کیا۔مثلاً کائنات فخر میاں داد خاں سیاح کلیاتِ اثر سالیری وغیرہ۔ اس سلسلے میں گجرات کے مختلف شہروں میں بنی انجمنوں نے بھی توجہ دینا شروع کی ہے۔اس تحریک میں گجرات اردو اکادمی کے چیرمین پروفیسر وارث علوی صاحب کی محنت و کاوش قابل تحسین ہیں۔احمدآباد کی پیر محمد شاہ لائبریری کے ڈائریکٹر پروفیسر محی الدین بمبئی والا صاحب کی کوششوں سے اردو فارسی عربی کے مخطوطات کا کیٹلاک سات جلدوں میں شائع ہوا ہے۔یہ نہایت ہی اہم کام انجام دیا گیا ہے۔پروفیسر مذکور شکریہ کے مستحق ہیں۔ان کی سرپرستی میں گجرات اردو اکادمی کا سہ ماہی''سابر نامہ''کئی سالوں سے باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ ان جدید کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ انیسویں صدی میں گجرات کے رؤسا و امراء نے اردو کی ترویج و اشاعت میں قابل ستائش خدمات انجام دیں ہیں اس دور میں ان کے کارنامے ان کی پسندو صلاحیتوں کا ثبوت ملتا ہے جو آج تک پردۂ خفا میں تھا۔

سلاطین گجرات کا عہد ہر اعتبار سے دورۂ زرین گردانا گیا ہے۔حکومت کو استحکام و خوشحالی مہیا کرنے میں سلاطین گجرات کے کئی وفادار و بہادر شریف النفس امراء و رؤسا کا بیش بہا تعاون حاصل رہا۔ان کے توسط سے گجرات کے جاہ جلال کی شہرت دور دور تک پھیلی۔مختلف تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکِ ایاز'ملکِ شعبان' امیر سید بخاری' ملک اختیار خاں و دیگر اعلیٰ درجہ کے امراء و روئسا بیک وقت نہ صرف سیاست سے منسلک تھے بلکہ اہل گجرات کی فلاح و بہبودی کو اپنا اولین فرض سمجھتے تھے۔ان کا سماج سے گہرا تعلق تھا۔ علماء و ادیبوں کے قدردان تھے۔ اور صوفیوں کے دلدادہ۔ انیسویں صدی میں گجرات مختلف ریاستوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ان ناگفتہ

حالات میں بھی رؤسا و امراء کی ادبی خدمات اور سماجی کارنامے' تاریخی کتابوں اور سرکاری گزٹوں میں ضبط ہیں۔ ان کے خاندان کے بعض افراد خود صاحب تصانیف تھے۔ اور اعلیٰ درجہ کے شاعر بھی تھے۔ ان کے دم سے شعر و سخن کا چرچا ہوتا رہتا تھا۔ اور اس طرح اردو زبان کو فروغ ملا۔ یہ مقالہ بعنوان''انیسویں صدی میں گجرات کے رؤسا و علماء کی ادبی خدمات'' میں انیسویں صدی کی شروعات سے پہلے اور بیسویں صدی کے اوائل کے چند شعراء اور صاحب تصانیف علماء رؤسا کا احاطہ بھی کیا ہے جو میرے لئے ناگزیر تھا۔ تاہم مجھے اس بات کا احساس ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا صدی، زمانے کی قید کی وجہ سے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنا تحقیقی حق مکمل طور پر ادا نہ کر پائی۔ پھر بھی مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ گجرات اور اس کے ادب کے متعلق میں نے اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

☆

اردو ادب کی تشکیل

اس قادرالمطلق اور خالق باری تعالیٰ نے جب دنیا کی تخلیق کی اور اس سرزمین پر طرح طرح کے ذی روح پیدا کیے جس میں حیوانات اور انسان بھی وجود میں آئے تب اس نے انسان اور حیوان میں ایک بڑا فرق یہ رکھا کہ انسان کو نطق عطا کیا۔ یہ صفت حیوانوں میں نہیں رکھی۔ اور یہی قوتِ نطق انسان کے شعور کی گواہی دیتی ہے اور اس کے دکھ درد، خوشی وغم، خیالات، احساسات، جذبات، فکر و تجربات کا اظہار کرتی ہے۔ زبان ہی کے ذریعہ انسان نے اپنی زندگی میں نئے نئے رنگ بھرے۔ اس کی زندگی بامقصد و بامعنی ہونے کی دلیل ہے۔ اس نے اپنی عقل وفہم کا اظہار زبان ہی کا سہارا لے کر کیا۔ [1]

کسی بھی زبان کو بنتے بنتے صدیاں گزر جاتی ہیں۔ پہلے بولیاں وجود میں آتی ہیں اور بعد ازاں زبان۔ اس کی شکل اور اس کے خد و خال ہمارے سامنے آتے ہیں۔ زبان کے ارتقاء کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب محسوس کرنے والا انسان اور سوچنے سمجھنے والا ذہن اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے والے افراد اس زبان میں اپنی صلاحیتوں کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں تو ادبی تخلیق کی شروعات ہوتی ہے۔ [2]

اردو زبان کو بھی منظر عام پر ظہور پذیر ہونے میں صدیوں کا وقت درکار رہا۔ اور اس نے بھی ادبی دنیا میں اپنے قدم جمائے۔ اس زبان کی ابتدار سے متعلق تاریخ میں مختلف آراء ہیں۔ اس کا کوئی خاص زمانہ مقرر کرنا مشکل ہے۔

ایک نظریے کے مطابق دیکھا جائے تو جب مسلمانوں نے سندھ اور ملتان کو فتح کیا اور وہ یہاں تقریباً ۳۰۰ سال تک چھائے رہے۔ اس عرصے میں ان کی زبانیں

ان کی تہذیب و تمدن زبان کو بڑی حد تک متاثر کرتی رہی۔ ۱۰۰۱ء سے جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملے شروع کیے مغربی ہندوستان پر مسلمانوں کا اثر اور ان کی تہذیب یہاں پر اپنے قدم جما چکی تھی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت برعظیم چھوٹی چھوٹی راجپوت ریاستوں میں منقسم تھا۔ اور وہ آپس میں خانہ جنگیوں میں مصروف تھیں۔ بقول ڈاکٹر تاراچند ''مسلمانوں کی فتح کے وقت ہندوستان کی بالکل ایسی حالت تھی جیسے مقدونیا کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے یونان کی حالت تھی۔ دونوں ملکوں میں ایسی سیاسی وحدت بنانے کی اہلیت کا فقدان تھا۔ ۳؎

محمود غزنوی کے بعد حکومت غوریوں کے ہاتھ آئی۔ اس وقت شمال، مغرب اور پنجاب میں ''ناتھ پنتھیوں'' کا زور تھا۔ یہ جوگی-مورتی پوجا کے مخالف تھے۔ ظاہری رسوم اور تیرتھ یاترا کو بھی برا سمجھتے تھے۔ یہ وحدانیت کے قائل تھے اور معرفت نفس کو سب سے بڑا درجہ دیتے تھے۔ ان کے خیالات صوفیائے کرام سے بے حد ملتے جلتے تھے۔ ان کی زبان میں ہندوی لہجہ کا احساس ہوتا ہے۔ جب اس زبان پر عرب ایرانی تہذیب اور زبانوں نے اپنا اثر ڈالا اور اس میں نئے لفظ اور تلفظ شامل ہوئے نئی آوازوں نے اس زبان کے سوئے ہوئے تاروں کو چھیڑا تو اس کے اندر ایک ایسا عملی امتزاج شروع ہوا جس نے اس میں سڈول پن پیدا کر کے نرمی، شائستگی اور قوتِ اظہار کو بڑھا دیا۔ رفتہ رفتہ یہ زبان نئے لفظوں کی مدد سے اپنا رنگ روپ اور چولا بدلنے لگی۔ بے ڈول ان گھڑ، مشکل اور قدیم آوازوں والے الفاظ خودبخود خارج ہوتے گئے۔ نئی تہذیب اور معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرنے والے الفاظ داخل ہوتے گئے یہ وہ مثبت دوررس اور گہرا اثر تھا جو مسلمانوں کی فتح نے تہذیب و معاشرت کے ساتھ ساتھ اس برعظیم کی زبانوں پر بھی ڈالا۔ اس گہرے اثر کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مسلمان جب یہاں آئے تو واپس جانے کے ارادے سے نہیں آئے بلکہ آریوں کی طرح انھوں نے اس ملک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا وطن بنا لیا۔ ۴؎

دوسری وجہ یہ کہ یہاں والوں کی تہذیب کمزور، پارہ پارہ اور زوال پذیر تھی۔

باہر سے آنے والوں کے پاس جاندار زبانیں بھی تھیں اور ان کے خیالات و عقائد میں توانائی اور گہرائی بھی تھی جو چڑھتے سورج اور ابھرتے پھیلتے نظامِ خیال میں ہوتی ہے۔ ایک دوسرے نے اپنے الفاظ ملا کر بولنے اور اپنی بات دوسرے تک پہنچانے کی کوشش کی۔ جب قوی کلچر کمزور کلچر سے ملا تو یہاں کی تہذیب کی طرح زبانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ اور زبان کا منجمد پتھر پگھلنے لگا۔ ۵؎

مسلمانوں کی آمد کے بعد یہاں لسانی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ جدید ہند آریائی زبانوں کی پیدائش اور ان کے اندر ادب کی تخلیق مسلمانوں کے زیر اثر ایک نئے تہذیبی دور کا آغاز ہوا۔ مسلمان فاتحوں نے اس ملک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا وطن بنا لیا۔ اس سرزمین میں جہاں جہاں مسلمان پھیلتے گئے زندگی گہما گہمی اور تہذیب کی ہماہمی اثرانداز ہونے لگی۔ یہ امن سندھ و ملتان سے پھیل کر سرحد پنجاب اور میرٹھ و نواحِ دہلی تک پہنچ گیا۔ قطب الدین ایبک سے لودھیوں تک آتے آتے تہذیبی و لسانی سطح پر یہ اثرات اتنے واضح ہو گئے کہ زبان و تہذیب دونوں کو نئے نئے سانچے میں ڈھال کر ایک الگ رنگ و روپ دے دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایک مشترکہ زبان کے خد و خال بھی اجاگر ہوتے گئے۔ بقول شمس اللہ قادری ''سلطان محمد تغلق کے زمانے میں یہ جدید زبان عام طور پر بولی جاتی تھی اور وہ مسلمان جو ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے یا جنھوں نے عرصۂ دراز سے بود و باش اختیار کر لی تھی اسی زبان میں بات کرتے تھے۔'' ٦؎

محمد بن قاسم سے محمود غزنوی تک تقریباً ۳۰۰ سال ہوتے ہیں۔ محمود غزنوی سے بابر کی فتح تک کا زمانہ تقریباً ۵۰۰ سال مانا جاتا ہے۔ اس عرصے میں ہندوستان میں زندگی کی ہر سطح پر بہت ہی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ بابر کے آنے تک یہاں کی تہذیب پورے پھیلاؤ اور وسعتوں کے ساتھ ایک نیا رنگ اور ایک نیا روپ اختیار کر چکی تھی۔ ۷؎ یہاں تک کہ سماجی اور لسانی ڈھانے کا اپنا مقام نمایاں طور پر نظر آنے لگا تھا۔ غرض کہ ۱۱ ویں صدی سے لے کر ۱۲ ویں صدی عیسوی تک یہ زبان جسے ہم آج اردو کے

نام سے پکارتے ہیں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دہلی سے نکل کر برعظیم کے دور دراز گوشوں تک پہنچ کر سارے برعظیم پر چھا چکی تھی۔ یہ زبان یہیں کی زبان تھی، مسلمانوں نے اسے اپنایا۔ اپنے خون سے اسے سینچ کر شائستگی کا سلیقہ پیدا کر کے سارے ہندوستان میں پھیلا دیا۔ پروفیسر محمود شیرانی کا خیال ہے کہ ''مسلمان اقوام نے ہندوستان میں اپنے لیے ایک زبان مخصوص کر لی ہے اور جوں جوں ان کے مقبوضات فتوحات کے ذریعہ وسیع تر ہوتے جاتے ہیں یہ زبان بھی ان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں پھیلتی جاتی ہے۔'' [8]

اردو زبان کی ترویج و اشاعت پر ہم کچھ سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالنے کی سعی کرتے ہیں۔ جسے ہم چند نکات کے ذریعہ آسانی سے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

(۱) محمود اور آل محمود تقریباً ۲۰۰ سال تک سندھ و ملتان سے لے کر پنجاب و نواحِ دہلی تک حکمرانی کرتے رہے ان کی سلطنت کے الگ الگ لسانی و تہذیبی علاقوں میں ایک ایسی زبان کی ضرورت کا احساس پیدا ہوتا ہے جو سب کے لیے مشترکہ درجہ رکھتی ہو۔ اسی تہذیبی و سیاسی صورت حال نے اردو زبان کی تشکیل اور پھلنے پھولنے میں مدد دی۔ اس زبان کی لچک نے علاقے کی سب زبانوں کے رنگ و مزاج کو اپنا کر اپنا منفرد رنگ و مزاج بنا لیا۔ [9]

(۲) علاؤالدین خلجی نے ۱۲۹۷ء میں گجرات فتح کیا جو تقریباً ۱۰۰ سال تک سلطنت دہلی میں شامل رہا۔ اور اس تمام عرصے میں گجرات اور سلطنت دہلی کے مختلف علاقوں میں کافی میل جول رہا۔ ۱۲۹۵ء تا ۱۳۱۵ء میں علاؤالدین نے سارے دکن اور مالوہ کو فتح کر کے سلطنت دہلی میں شامل کر دیا۔ یہ علاقے دہلی سے کافی دوری پر تھے۔ اس لیے علاؤالدین خلجی نے ان مفتوحہ علاقوں کے انتظام کو بہتر اور مؤثر بنانے کے لیے گجرات سے لے کر دکن تک کے سارے علاقے کو مضافات میں تقسیم کر کے انتظامی حلقے بنا دیے۔ ہر حلقے پر ایک ترک افسر شمال سے بھیجا جاتا تھا۔ یہ ''امیر صداح'' کہلاتا تھا۔ [10] مال گذاری وصول کرنے کے علاوہ قیام، امن، انتظام اور

مرکزی حکومت کی فوجی ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار تھا۔ اس انتظامی ضرورت کے تحت بے شمار ترک خاندان اپنے متعلقین کے ساتھ گجرات، دکن اور مالوہ کے طول و عرض میں آباد ہو گئے۔ تیس پینتیس سال کے عرصے میں ہی یہ ترک خاندان اور ان کے متعلقین ان علاقوں میں اس طرح آباد ہو گئے کہ دکن اور گجرات ان کا وطن بن گیا۔ شمالی ہند سے آنے والے یہ حکمران خاندان جب گجرات، دکن تک سارے علاقوں میں آباد ہوئے تو تہذیبی و لسانی سطح پر بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ یہ لوگ ترک نژاد ضرور تھے لیکن شمالی ہند میں شمال مغرب سے لے کر دہلی تک آباد ہوئے صدیاں گزر چکی تھی۔ یہ لوگ شمالی ہند سے اپنے ساتھ وہ زبان لے کر آئے جو بازار میں بولی جاتی تھی اور جس کے ذریعہ یہ معاملات زندگی طے کرتے تھے۔ امیران صداح کی اپنے حلقوں کی زبان اس زبان سے مختلف تھی جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ نہ وہ ان علاقوں کی زبان بول سکتے تھے اور نہ ترکی فارسی کے ذریعہ معاشرتی سطح پر لین دین کر سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے ساتھ لائی ہوئی زبان میں یہاں کی مقامی زبانوں فارسی، عربی اور ترکی کے الفاظ کو شامل کر کے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا اور اس طرح اس زبان کو سیاسی معاشرتی تقاضوں کے تحت نئے ماحول میں قابل قبول بنا دیا۔ اس نظام کی وجہ سے شمال کے لیے دکن اور گجرات کے راستے کھلے رہے۔ تجارت، لین دین اور دوسرے معاشرتی امور مضبوط ہونے لگے اور ساتھ ساتھ اردو زبان کا اثر بھی بڑھتا پھیلتا رہا اور ان علاقوں میں یہ زبان بھی بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے پھیلتی اور بڑھتی رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ بول چال کی زبان سے گزر کر ادبی سطح پر استعمال میں آئی۔ صوفیوں اور شاعروں نے اسے اپنے اظہار مقصد کا ذریعہ بنایا تو گجرات کے ادبی رخ کو گجری کا نام دیا گیا اور دکن میں یہ دکنی کہلائی۔

(۳) محمد تغلق جب سلطنت دہلی کا حاکم بنا تو اس جدت پسند بادشاہ نے دکن، گجرات اور مالوہ پر زیادہ مؤثر طریقے سے حکومت کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ یہ علاقے دہلی سے کافی فاصلے پر تھے۔ اس لیے محمد تغلق نے دہلی کے بجائے دولت آباد کو پایۂ

تخت بنانے کا فیصلہ کیا۔ ۱۳۲۷ء میں ایک فرمان جاری کیا کہ دہلی کی ساری آبادی مع اعمال حکومت، فوج، افسران اور متعلقین دولت آباد ہجرت کر جائیں۔ اتنی بڑی آبادی کی ہجرت تاریخ کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے لیکن اس عمل نے لسانی تبدیلیوں کو بڑی اہمیت دی۔ شمال کی آبادی کے دولت آباد پہنچنے کے عمل نے شمال کی تہذیب کے اثرات کو تیز تر کر دیا اور امیران صداح کے نظام کے زیر اثر وہاں جو ماحول پیدا ہو چکا تھا اس کی وجہ سے ایک اچھا اثر ہوا۔ ۱۱

(۴) محمد تغلق کی وفات کے بعد دکن میں بغاوت پھیل گئی اور انھیں امیران صداح میں سے ۱۳۴۷ء میں ان لوگوں نے اپنا ایک بادشاہ منتخب کر کے بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اب حکومت ان ترک خاندانوں کے ہاتھوں میں آ گئی تھی جو خود کو دکنی کہنے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ دکنی ان کی زبان تھی جس پر انھوں نے دکنی قومیت اور کلچر کی بنیاد رکھی۔ بہمنی سلطنت کی زبان ہندوی تھی۔

(۵) ادھر گجرات میں بھی محمد تغلق کی سلطنت کمزور ہوتے ہی صوبیدار خودمختار ہو گئے تھے۔ ۱۳۹۷ء میں ایک واقعہ درپیش ہوا کہ ایک خبر تمام ہندوستان میں پھیل گئی کہ امیر تیمور بہت بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ ہندوستان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس وقت دہلی میں تغلق بادشاہ ناصرالدین تھا جو خود دہلی چھوڑ کر گجرات آ گیا اور گجرات سے مایوس ہو کر مالوہ چلا گیا۔ جب بادشاہ خود ہی حکومت چھوڑ کر بھاگ جائے تو رعایا کب ٹھہرنے والی تھی۔ شمالی ہندوستان میں شمال-مغرب کو لے کر دہلی تک افرا تفری مچ گئی تھی۔ ایک جم غفیر تھا جس نے گجرات کا رخ کیا۔ اس وقت شمالی ہند والوں کے لیے گجرات پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس ہجرت کرنے والی آبادی میں ہر قسم کے لوگ عوام و خاص صوفیائے کرام اور اہل حرفہ جیسے لوگ شامل تھے۔ ۱۲

(۶) تیمور کے اس حملے کے بعد سلطنت دہلی انتہائی کمزور ہو گئی۔ یہاں گجرات کے صوبیدار ہمایوں ظفر خان نے ۱۴۱۰ء میں جو خود نسلاً ہندوستانی تھا آزادی کا اعلان کر کے مظفر شاہ کا لقب اختیار کیا اور گجرات میں بادشاہت کی بنیاد ڈالی۔ اس نے

اہل علم، ارباب ہنر، مشائخ دین کی سرپرستی کی۔ جس کی وجہ سے کئی علماء اور درویش عرب و عجم، روم و شام سے یہاں پہنچنے لگے۔ ان عام واقعات اور حالات کی وجہ سے شمالی ہند سے لے کر دکن و گجرات تک اس زبان کے پھلنے پھولنے اور بڑھنے کے لیے ایک سازگار ماحول پیدا ہو گیا۔ یہ زبان ان سارے علاقوں کی مشترک زبان بن کر تیزی سے ترقی کے زینے طے کرنے لگی۔ صوفیاے کرام نے اس زبان کو تبلیغ دین اور اخلاق کے لیے استعمال کیا۔ قوالی، موسیقی، شاعری اور درس اخلاق کی یہی زبان تھی۔ عام معاملاتِ زندگی اور دربار سرکار کے مختلف طبقوں کے درمیان بھی یہی زبان اظہار کا ذریعہ بنی۔ اردو زبان کا اب تک یہی مزاج قائم ہے۔ ۱۳

مندرجہ بالا نکات کے ذریعہ زبان کی تشکیل کے سیاسی اسباب ہم نے سمجھ لیے لیکن یہاں ہم ایک بات پھر دہرا رہے ہیں کہ اس زبان کا مولود تو شمال ہے۔ لیکن سیاسی اور تہذیبی تقاضوں کے تحت اس نے ادبی زبان کا درجہ شمال سے صدیوں پہلے گجرات اور دکن میں حاصل کر لیا تھا اور اس کے چند اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔

دراصل دکن اور گجرات کی سلطنتیں شمال سے جدا ہو کر ہی وجود میں آئی تھیں اور وہ اپنی بقا کے لیے ایک ایسے کلچر کی تعمیر کرنا چاہتی تھیں جو ایک مشترکہ کلچر کی حیثیت رکھتا ہو اور جس میں یہاں کی ساری آبادی اپنائیت محسوس کر سکے تاکہ اس احساس کے ساتھ شمال کے حملوں کے خلاف ایک مدافعت کی دیوار کھڑی کی جا سکے۔ ۱۴

☆ گجرات اور دکن جیسے مختلف زبانوں والے علاقے میں اردو زبان کی حیثیت ایک مشترکہ بین الاقوامی زبان کی تھی۔ ان مختلف زبان بولنے والے عوام کے درمیان اس کو (اردو) سکھائے بغیر کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اس لیے یہ زبان ان علاقوں میں خوب پھلتی پھولتی رہی۔ مسلمانوں کے ترقی پذیر نظام خیال، ان کی قوت عمل اور فکری توانائی کی وجہ سے یہ ایک ترقی پذیر زبان بن گئی۔ یہ ایسی زندہ زبان تھی جس نے اپنے اندر علاقائی زبانوں کے الفاظ جذب کر لیے اور ان زبانوں سے قریب تر ہو گئی۔ ۱۵

شمالی ہند میں فارسی زبان ہر طرف چھائی ہوئی تھی اور اہل علم و ادب اسے اپنا

چکے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کی قدر و منزلت بڑھ گئی تھی۔ یہاں کے اہل علم فارسی ہی زبان میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے تھے۔ دکن اور گجرات میں شمال کے خلاف ہمیشہ سیاسی تنگ دلی رہی۔ جس کی وجہ سے اردو زبان کو گجرات اور دکن میں دربار سرکار کی سرپرستی اور اہمیت حاصل ہوگئی۔ جبکہ شمال میں وہ حیثیت فارسی کو حاصل تھی۔ حالانکہ شمال میں اردو عوام میں مقبول تھی۔ لیکن اہل علم نے اسے نہ اپنایا رؤسا و حکمران نے بھی فارسی ہی کو اپنایا تھا۔ لیکن جسے عوام تک پہنچنا ہوتا تھا وہ اردو زبان ہی کو ذریعۂ اظہار بناتا اسی لیے صوفیائے کرام نے تبلیغ دین کے لیے اسی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا اور اسے ادبی سطح پر لانے میں ایک اہم کردار ادا کیا انھیں صوفیائے کے ملفوظات اور شاعری زبان کے قدیم ترین نمونے بن کر آج بھی اردو زبان کی تاریخی و لسانی حیثیت رکھتے ہیں۔ [۱۶]

☆

حواشی

۱۔ تاریخ ادب اردو جلد اوّل صفحہ ۲، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۷ء
۲۔ ادبی نثر کا ارتقاء صفحہ ۲۰، ڈاکٹر شہناز انجم، پرنٹ سیٹ نوائڈا، غازی آباد ۱۹۸۵ء
۳۔ تمدن ہند پر اسلامی اثرات صفحہ ۲۲۳، ڈاکٹر تاراچند، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۴ء
۴۔ تاریخ ادب اردو صفحہ ۹، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۷ء
۵۔ ایضاً صفحہ ۹، ۱۰
۶۔ اردوئے قدیم صفحہ ۲۱، ۲۲ شمس اللہ قادری، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ
۷۔ تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۱، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۷ء
۸۔ مقالات حافظ محمود شیرانی جلد اول صفحہ ۱۳۲، مجلس ترقی ادب لاہور
۹۔ تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۲، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۷ء
۱۰۔ تاریخ ادب اردو محترمہ سیدہ جعفری صفحہ ۹۸، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان ۱۹۹۸
۱۱۔ تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۳، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۷ء
۱۲۔ ایضاً صفحہ ۱۴
۱۳۔ ایضاً صفحہ ۱۹
۱۴۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ صفحہ ۱۸، ۱۹، سید احتشام حسین، ترقی اردو بیورو دہلی ۱۹۸۳ء
۱۵۔ آب حیات شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، مطبع کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی ۲۰۰۴
۱۶۔ اردو لسانیات ڈاکٹر زور

باب اول

انیسویں صدی میں گجرات کی مختلف
ریاستوں کے سیاسی، سماجی و ادبی حالات

پالنپور
احمدآباد
بڑودہ
کھمبایت
بھروچ
جوناگڑھ
سورت

باب اول

انیسویں صدی میں گجرات کی مختلف ریاستوں کے سیاسی، سماجی و ادبی حالات

گجرات کے مختصر سیاسی و تاریخی پس منظر کو بیان کرنے سے پہلے ہمارے لیے ہندوستان کی تاریخ کا جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جب ہم گجرات میں مسلمانوں کی آمد پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ گجرات ہمیشہ سے شمالی بادشاہوں کی آمد کا آمجگاہ رہا ہے۔

علاؤالدین خلجی نے ۱۲۹۶ء میں گجرات کو فتح کیا اور اسے اپنی قلم رَو میں شامل کیا خلجی خاندان سے گجرات اسلامی حکومت کے تحت آ گیا تھا اور یہ علاقہ سلطنت دہلی ہی کا ایک حصّہ ہو گیا تھا۔ تقریباً سو(۱۰۰) سال تک دہلی والوں نے گجرات کو اپنے زیر دست رکھا۔ اور یہاں کا باقاعدہ انتظام و انصرام ناظم اعلیٰ کے ذریعہ ہوتا رہا۔ [۱]

سیاسی و تاریخی پس منظر :

تاریخ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور ان کی پرچم کشائی کے بعد مغلوں کی آمد پر اسلامی حکومت میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا۔ اس خاندان نے ایک طویل عرصے تک ہندوستان پر حکومت کی اور تقریباً دو سو سال کی تاریخ میں کئی مغل حکمران تخت نشین ہوئے۔ ''ہر عروج را زوال است'' کے مصداق صرف 40 سال کی مدت میں 10 بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ یہ بات صاف ظاہر کرتی ہے کہ مغل حکومت انتہائی درجے تک کمزور ہو چکی تھی۔ یہ ایک بہت ہی وسیع حکومت تھی جس کے لیے زبردست طاقتور حکمران کی ضرورت تھی۔ جو اب یہاں موجود نہیں تھا۔ [۲] اورنگ زیب عالمگیر نے

حکومت کو وسیع کرنے اور باغیوں کی سرکوبی میں تقریباً ایک چوتھائی صدی کا عرصہ صرف کردیا اور اپنا زیادہ تر وقت دکن کی سنگلاخ پہاڑیوں میں مرہٹوں کی سرکوبی میں گزارا، نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہند میں مغل حکومت کی جڑیں کمزور ہوگئیں۔ عرصۂ دراز تک بادشاہ کا دارالسلطنت سے دور رہنا انتشار کا سبب بن گیا۔ لہٰذا شمالی ہند میں سکھوں اور جاٹوں نے موقع پاتے ہی سر اٹھایا۔ محمد شاہ کے دور حکومت میں روہیلہ پٹھانوں نے بھی کچھ کم غارت گری نہیں کی۔ ادھر مرہٹوں کی لوٹ مار زوروں پر تھی۔ وہ بنگال اور مالوہ تک پے در پے حملے کرتے پہنچ چکے تھے۔ مرہٹہ سرداروں نے اندور، ناگپور، گوالیار، بڑودہ میں خود مختار حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ ۱۷۲۴ء میں نظام الملک نے حیدرآباد میں اپنی حکومت کا جھنڈا گاڑ دیا۔ ستم بالائے ستم ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ درانی نے زبردست حملہ کیا اور اس کے بعد احمد شاہ ابدالی بھی دہلی کی حکومت پر دوڑا چلا آیا تو مرہٹوں نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ پانی پت میں احمد شاہ ابدالی سے معرکہ آرائی کی لیکن چند ہی گھنٹوں میں مرہٹوں کی ایک لاکھ فوج نے منہ کی کھائی۔ اس جنگ کے بعد مرہٹوں نے پھر کبھی گجرات اور دکن سے آگے قدم نہیں بڑھایا۔[۳]

اس انتشار کے زمانے میں بادشاہ نااہل تھے اور امراء حریص۔ حکومت میں چاروں طرف بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ عالم یہ تھا کہ جب کوئی شاہی احکام صوبیدار تک پہنچتے؛ تو وہ انہیں ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا کرتے تھے۔ امراء اور شاہی افسران ڈکیتوں سے ملے ہوئے تھے۔ اس وقت میں فوجیوں کی بہت بری حالت تھی۔ انہیں مہینوں بلکہ سالوں تنخواہیں نہیں ملتی تھیں۔ جس کی وجہ سے اکثر بلوے ہوا کرتے تھے۔ دہلی کا شاہی قلعہ رذیلوں اور کمینوں سے بھرا ہوا تھا۔ کم ذات خطاب یافتہ بن کر امیر بن بیٹھے تھے۔ کئی شعراء حضرات نے اپنے کلام میں اس بدحالی کی ترجمانی کی ہے۔ چونکہ گجرات تقریباً دکن اور شمال کے درمیان میں واقع ہے اس لیے اس کی اور بری حالت تھی۔ یہاں مغل، مراہٹوں، نظام الملک اور انگریز جیسے چار چار حریفوں نے اپنی طاقت آزمائی کا اکھاڑہ بنا رکھا تھا۔[۴]

گجرات میں شیواجی نے ۱۶۶۴ء، ۱۶۶۶ء، ۱۶۶۷ء تین مرتبہ سخت یلغار کے بعد اپنی حکومت قائم کی۔ شیواجی کی وفات کے بعد پیشوا اور گائیکواڑ کی خانہ جنگیوں نے زور پکڑا۔ انہی دنوں شیر خان بابی کا ایک لڑکا جو کڑی کا حاکم تھا اور صفدر خان بابی پٹن پر اپنی حکومت چلا رہا تھا گائیکواڑ پر حاوی ہوگیا۔ اور اس نے زبردست شکست دی۔ بعد میں یہی صفدر خان بیجا پور کا حاکم مقرر ہوا۔ جسے ۱۷۰۵ء میں دھاناجی مادھو نے شکست دے کر قید کر لیا۔ اس زمانے تک گجرات میں بڑی لوٹ مچی ہوئی تھی۔ مختلف مقامات کے متصوی اور فوجدار بھی اپنے ذاتی مفاد کے لیے آپس میں دست و گریباں رہتے تھے۔ تقریباً دس سال تک کھانڈیراؤ دبھارے گجرات میں چوتھ وصول کرنے کے سلسلہ میں غارت گیری کرتا رہا تھا۔ ہلاجی راؤ نامی ایک مرہٹہ حاکم نے سون گڑھ پر قبضہ جما لیا۔ اب مرہٹوں نے گجرات کے کروڑپتیوں کے شہر ویسل نگر اور وڈنگر کو بھی جی بھر کر لوٹا۔ اور آصف جاہ نے حامد خان کو گجرات کا صوبیدار مقرر کیا۔ اس کا نائب ناظم شجاعت خان تھا۔ یہاں بھی پٹھانوں میں حکومت کی کھینچا تانی چلتی رہی۔ لہٰذا آصف جاہ نے مرہٹہ سردار کھاناجی سے میل جول بڑھا کر شجاعت خان سے جنگ کی اس لڑائی میں شجاعت اور اس کا بھائی ابراہیم خان مارے گئے۔ ادھر ان کا ایک اور بھائی رستم علی جو سورت میں تھا مرہٹوں سے بدلہ لینے نکلا اور وہ بھی اس جنگ میں مارا گیا۔ ۵؎

جب گجرات میں سربلند خان ناظم گجرات تھا۔ اور اپنے نائب کے ذریعہ یہاں کی نظامت کرتا تھا۔ ۲۶-۱۷۲۵ء میں وہ دہلی سے گجرات آیا اور مرہٹوں سے جنگ کی۔ اس کی امید کے خلاف دہلی سے اسے کوئی مدد نہ ملی، جس کی وجہ سے اس نے مرہٹوں کو سردیش مکھی کا حق دے کر معاہدہ کر لیا۔ مرکز نے یہ معاہدہ منظور نہیں کیا اور سربلند خان کی جگہ دہلی سے ابھے سنگھ کا تقرر کردیا گیا۔ ابھے سنگھ نے اپنے نائب رتن سنگھ کو گجرات کے اختیارات دے دیے اور وطن واپس چلا گیا۔ اس دوران دہلی سے کھمبایت کے متصدی مومن خان کو ناظم مقرر کیا گیا۔ مومن خان نے رتن سنگھ سے

اختیارات حاصل کرنے کی غرض سے مرہٹوں سے سازبازی کی۔ یہ ایک زبردست معاہدہ تھا۔ جس کی رو سے گجرات کا آدھا محصول اور احمدآباد کی آمدنی کے نصف حصّہ کے مرہٹے پیشوا حقدار بن گئے۔ اس معاہدے کی ایک بڑی کمی یہ تھی کہ اس حصّے میں سے سرداروں کے ہاتھ کچھ نہیں آتا تھا۔ لٰہذا پھر وہی کھینچا تانی والی بات پیدا ہوگئی۔ سرداروں اور پیشوا کے درمیان ۱۷۳۷ء میں ڈھبوئی مقام پر تصادم ہوا۔ پیشوا غالب آ گئے اور انہوں نے پالاجی کو اپنا نمائندہ مقرر کیا۔ اور دکن چلا گیا۔ یہاں پالاجی کے بیٹے داماجی نے اپنے قدم جما لیے۔ اور بڑودہ میں خود مختار حکومت کی بنیاد ڈالی۔

۱۷۴۳ء میں فخرالدولہ ناظم گجرات بنایا گیا۔ یہ بھی اوروں کی طرح گجرات میں اپنے نائب کے ذریعہ حکومت کی نگرانی کرتا تھا۔ اس وقت جوانمردخان بابی نامی شخص اس کا نائب ہوا کرتا تھا۔ جب ۱۷۴۸ء میں فخرالدولہ گجرات آیا تو جوانمردخان نے بغاوت کر دی اور اسے شکست دے کر خود ناظم بن گیا۔ اس طرح یہاں بابی خاندان کی کھٹ پٹ چلتی رہی۔ شیرخان بابی کو سربلند خان نے اپنا نائب ناظم بناکر جوناگڈھ بھیجا تھا۔ اس نے ۱۷۴۸ء میں جوناگڈھ میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ اس تمام عرصے میں گجرات کے سیاسی حالات بڑے ہی عجیب دور سے گزر رہے تھے۔ تقریباً دس سال تک اقتدار اور مال گذاری کی کھینچا تانی چلتی رہی۔ ۶؎ بیلگر خان کروا پتی تاجر ملا محمد علی جیسے حریفوں نے حکومت کو اکھاڑہ بنا رکھا تھا۔ یہ تینوں اشخاص اپنے مفاد کے لیے کبھی مرہٹوں کی مدد کرتے تو کبھی انگریزوں سے سازباز کر لیتے۔ انہیں کی وجہ سے گجرات میں کمپنی سرکار نے کافی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ اور اب وہ سیاست میں بھی دخل دینے لگے۔ ۱۷۵۹ء میں کمپنی نے مرہٹوں کی مدد سے سورت پر حملہ کر دیا۔ اور معاہدہ کی شکل میں کمپنی کو قلعہ دار بنایا گیا۔

۱۷۴۸ء میں جب احمد شاہ دہلی پر تخت نشین ہوا۔ اس وقت ہندوستان میں کئی چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ کاٹھیاواڑ میں مانگرول، کتیانہ، اوناسرا اور سومناتھ کے تھانیداروں نے ان مقامات کو اپنی جاگیریں بنا لی تھیں۔ ۱۷۲۹ء میں

بھاؤ نگر، ۱۷۳۰ء دھانگدرا ریاستیں ۱۷۴۸ء میں شیر خان بابی نے جونا گڑھ کو خود مختار حکومت بنا دیا۔ ۱۷۳۹ء میں بھروچ بھی خودمختار ریاست بن گیا۔ مومن خان دوم ناظم گجرات احمدآباد مرہٹوں کے سپرد کر کے کھمبایت کا خودمختار حاکم بن بیٹھا۔ ۷

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ احمدآباد کے نظم ونسق اور آمدنی میں پیشوا اور گائیکواڑ دونوں کی ساجھے داری تھی۔ اور دونوں کے نمائندے احمدآباد میں رہتے تھے۔ اس دوران کئی معاہدے ہوئے اور ٹوٹے بھی۔ آخر ۱۸۰۰ء میں گائیکواڑ کو احمدآباد کا ٹھیکہ دیا گیا۔ اور پیشوا کو اس کا سالانہ وظیفہ ادا کیا جاتا تھا۔ ۱۸۱۴ء میں جب اس ٹھیکہ کی تجدید کا وقت آیا تو پیشوا نے انگریزوں کو اپنا حق دے دیا۔ ۸ جس کے بدلے انگریزوں نے گائیکواڑ کو بھی چند پرے (پرگنے) دے کر احمدآباد کی نظامت کا حق لے لیا۔ اس طرح ۱۸۱۸ء میں انگریز احمدآباد پر قابض ہو گئے۔ احمدآباد تقریبا! 63 سال تک مراہٹوں کے قبضے میں رہا۔ مصنف مراتِ احمدی فرماتے ہیں۔

''جب مرہٹوں کے ہاتھ سے ۱۸۱۸ء میں انگریزوں نے احمدآباد کا قبضہ لیا۔ اس وقت شہر ایک ویرانہ تھا۔ شہر پناہ جگہ جگہ سے شکستہ تھی۔ صرف آدھے شہر میں آبادی تھی۔ دوسرے نصف حصّے میں جہاں بڑے بڑے محلات، مساجد و منادر تھے وہاں جانوروں کا شکار کیا جاتا تھا۔'' ۹

تقریباً ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک انگریزوں کی یہی کوشش رہی کہ وہ ہندوستانیوں کو غلامی کی زنجیروں سے جکڑ دیں۔ اور آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہے۔ اور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک انہوں نے ہندوستانیوں کو غلام بنائے رکھا۔ اور ہندوستانی آزادی حاصل کرنے میں مصروف رہے۔ اس عرصہ کے دوران یہاں کے دانشوروں نے قوموں کی کمزوریوں ان کی خامیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستانی ذہن کو تربیت دینے کے کئی طریقے اختیار کیے۔ ملک میں ۱۸۷۰ء سے قبل ہی کئی سیاسی انجمنوں کا قیام ہو چکا تھا۔ جیسے بمبئی کی ''سارو جنک سبھا'' یا بمبئی ایسوسی ایشن''، ''انڈین ایسوسی ایشن''، ''مہا جن سبھا'' سرسید کی برٹسٹ انڈین ایسوسی ایشن جیسی سیاسی انجمنیں قائم ہوچکی

تھیں۔ ان کمیٹیوں کا دائرۂ کار صوبوں اور ریاستوں تک ہی محدود تھا۔ لیکن سریندر ناتھ بینرجی نے ۱۸۸۲ء میں انڈین نیشنل کانفرنس کو وسیع پیمانے پر قائم کیا اور اس کی پاداش میں ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ہوا۔ اس کمیٹی کا قائم ہونا ایک بہت بڑی بات ہوئی ۱۹ ویں صدی کے آخر تک اخباروں، تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ سیاسی آزادی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اس زمانے میں انگریزوں نے ہندوستان پر نئے نئے ایکٹ لادنے شروع کر دیے جیسے آرمس ایکٹ، پریس ایکٹ آلبرٹ بل وغیرہ ان قوانین کی وجہ سے ہندوستانی اذہان گویا جاگ اٹھے اور اب وہ سیاسی آزادی کو حقیقت کا روپ دینا چاہتے تھے۔ ان کے مطالبات روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ اور انہوں نے اپنے مقصد بر آری کے لیے سختی اختیار کر لی تھی۔ یہاں تک کے ۱۹۰۵ء میں کانگریس نے مکمل سوراج کا مطالبہ پیش کر دیا۔ ۱۰

ادبی حالت :

ہندوستان کی تاریخ میں نصف ۱۹ ویں صدی ایک خاص اہمیت کی حامل رہی ہے۔ جب بھی ہم تاریخ کے اوراق پلٹے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کا واقعہ جسے لوگوں نے الگ الگ ناموں سے یاد کیا ہے۔ کہیں یہ حادثے کے طور پر پکارا گیا تو کہیں انقلاب تو کسی نے تو اسے غدر کا نام دے دیا۔ بہرحال یہ ایک عظیم واقعہ رہا اس کی نوعیت نے ہندوستان کی تاریخ کو بدلنے میں بڑا کام کیا۔ صدیوں سے ہندوستان میں حالات بدلتے رہے۔ لیکن یہ واقعہ جس نے نہ صرف ہندوستان کی قدروں کی بنیادیں ہلا دیں بلکہ اسے بدل کر رکھ دیا۔ ۱۱

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک ملک کے سیاسی سماجی حالات بدلتے گئے۔ اردو ادب کی اس 150 سال کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں صاف طور پر دو اہم دور دکھائی دیتے ہیں۔ ان ادوار کو ادب کے تاریخ نویسوں نے اردو شاعری کے عہد زریں کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ میرؔ و مرزاؔ، انشاءؔ و جرأتؔ، آتشؔ و ناسخؔ کے نام نمایاں طور پر لیے جاتے ہیں۔ انہیں ادوار میں سیاسی، سماجی، اقتصادی حالات کی بناء پر ادب

کے کئی رجحانات اور تصورات میں تبدیلی رونما ہوئی۔ اس زمانے میں اردو ادب نے کئی تعمیری کام کیے جس کی وجہ سے اس دور کے رجحانات بھی بہت نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

''اس وقت اردو ادب پر فارسی زبان کا گہرا اثر تھا۔ گویا اردو زبان فارسی کے جنگل میں دبی دبی سی نظر آتی ہے۔ غالب اسے ایک لچرسی زبان کہتے تھے اور فارسی کو اس پر فوقیت دیتے تھے۔ یہ عام شعراء کا رجحان تھا۔ شمالی ہند اور جنوبی ہند کے شعراء اور ادباء اپنے اپنے رجحانات کے مطابق شاعری اور نثر کی تخلیق میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن جنوبی ہند میں ایک بات نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے کہ وہاں اردو زبان پر فارسی کا کوئی خاص اثر نہیں تھا۔'' ۱۲؎ یہاں کے کئی شعراء حضرات نے شاعری میں خاص کر مثنویوں میں کمال حاصل کیا تھا۔ جن کی زبان شمالی ہند سے مختلف تھی۔ اور اسی زبان کا اثر وؔلی گجراتی پر بڑی حدتک پایا جاتا ہے وؔلی کی زبان فارسی سے مبراء تھی جب وؔلی اپنے دیوان کے ساتھ دہلی پہنچے تو وہاں ان کا بڑا خیرمقدم کیا گیا۔ وؔلی کی شاعری پر کسی نے اعتراض نہیں کیا بلکہ اسے سراہا گیا۔ ۱۳؎

بات دراصل یہ تھی کہ ولی کا درجہ شمال میں استاد کی حیثیت رکھتا تھا، اور اس کے بعد ہی شمال اردو ادب کا مرکز بن گیا۔ ۱۴؎ کیونکہ وہاں عظیم سخنور پیدا ہوتے گئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میر تقی میر اور مرزا کے دور سے شمالی ہند کو ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہوا۔ اب گجرات اور دکن کے شعراء بھی شمالی ہند کی شاعری کا بھی لوہا ماننے لگے۔ ۱۵؎ اور یہی وجہ تھی کہ شمالی ہند کی شاعرانہ خصوصیات کا اثر گجرات اور دکن پر ہوا۔ شمال میں وؔلی پہنچے اس وقت حاتؔم اور آبرؔو کا دور تھا۔ دکن میں آزاؔد، سراؔج اور گجرات میں عزلتؔ اور تجرؔد وغیرہ مشہور تھے۔ ولی کے بعد مظہؔر جان جاناں، سراؔج اور گجرات میں تجرؔد، اقدسؔ، رحمتؔ وغیرہ نے صوفیانہ تصورات کو قائم رکھا یہاں ایک بات صاف نظر آتی ہے کہ اس دور کے شمال اور جنوب کے تمام شعراء وؔلی ہی کی زبان میں اشعار کہنے لگے تھے۔ عشق مزاجی حسن وعشق کا تصور رواج پا چکا تھا۔ پھر

بھی ان کے خیالات اور شریفانہ رکھ رکھاؤ، اُن کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ شمال میں صنعت ایہام گوئی اور رعایت لفظی کی بھرمار تھی۔ جو بہت کھٹکتی تھی۔ لہٰذا اس کے برخلاف حاتم اور جان جاناں نے بڑی تحریک چلائی تھی۔ ۱۶

میرؔ اور مرزاؔ نے شاعری کو عروج کے لب بام تک پہنچا دیا۔ ان لوگوں نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کر کے شاعری کا بلند معیار قائم کیا۔ ادھر لکھنؤ میں جب شعراء حضرات کی قدردانی ہونے لگی تو وہاں کا کچھ اور ہی رنگ نظر آیا۔ کیونکہ کئی شعراء نے فرمائشی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور اب وہ اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے شعر کہتے تھے۔ شاعری سے سنجیدگی، متانت رخصت ہو چکی تھی۔ تصورات بدل گئے تھے، حسن و عشق کا پاکیزہ تصور کوٹھے تک چلا گیا تھا۔ ادنیٰ جذبات کی ترجمانی نے شاعری میں جگہ پا لی تھی۔ لیکن پھر بھی کئی شعراء حضرات ادبی جذبات میں بھی اعلیٰ شاعرانہ صلاحیتیں رکھتے تھے۔ اور ان کی شاعری قابل داد مانی جاتی تھی۔ اسی دور میں ریختی نے جنم لیا۔ مشکل سے مشکل زمینوں میں دو غزلیں کہنے کا رواج ہو گیا۔ نئے نئے قافیوں کے تجربے عمل میں آئے۔ شاعری کی کئی اصناف میں طبع آزمائی ہوئی۔ انہیں دنوں ''میر حسن'' کی شہرۂ آفاق مثنوی ''سحرالبیان'' تخلیق ہوئی جس نے صنف مثنوی کا ایک بلند معیار قائم کر دیا۔ ۱۷

جب انشاءؔ اور مصحفیؔ کے بعد لکھنؤ میں آتشؔ اور ناسخؔ، دہلی میں غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ اور نصیرؔ کا دور آیا تب تک کئی نئے تصورات قائم ہو چکے تھے۔ اس زمانے کے طرز معاشرت اس کی نفاست، نزاکت، تکلفؔ، تصنعؔ نے بھی ادب میں جگہ پائی جس کی وجہ سے زبان کی کافی تراش خراش ہوئی۔ اور اس نے جلا پائی۔ صرف و نحو کے قواعد تیار کیے گئے۔ مبالغہ، قافیہ پیمائی، سنگلاخ زمینوں میں غزلیں کہنا، رعایت نفظی، عربی فارسی الفاظ اور علمی اصطلاحوں نے شاعری میں خصوصیات کے ساتھ جگہ پائی۔ ۱۸ ابھی دہلی میں داخلی شاعری جاری و ساری تھی کہ لکھنؤ سے اساتذہ کا کلام دہلی پہنچنے لگا۔ وہ لوگ اس کلام سے بڑے متاثر ہوئے اور شاہ نصیر نے لکھنوی خصوصیات کو دہلی میں رواج دیا۔ دہلی

کے باکمال شعراء حضرات نے دہلی اور لکھنؤ کے ملے جلے تصورات کا ایک نیا اسلوب قائم کیا۔ ان کے یہاں اشتعاروں، تشبیہوں کی جدّت، فارسی کی اچھوتی ترکیبیں، خوش انداز بیان، اشاروں اور کنایوں اور علامتوں کے ذائقہ حسن و عشق کی کیفیات بیان کرنا۔ نازک خیالوں کی اچھی مثالیں سامنے آئیں۔ غرض اس دور میں غزل نے ادب شاعری میں ایک خاص مقام پایا اور اس کے مخصوص انداز و بیان رونما ہوئے۔ ۱۹

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ولؔی کے بعد اردو کا مرکز شمال میں منتقل ہو گیا تھا۔ لہٰذا گجرات اور دکن کے لیے شمال کی ادبی تحریکیں مشعل راہ کا کام دیتی تھیں۔ گجرات میں عزلتؔ کا نام بہت مشہور ہوا۔ حالانکہ اس زمانے میں ان کے ہم عصر شعراء میں کوئی ان کے مد مقابل نہیں تھا۔ تاہم گجرات میں اردو ادب کی شمع اپنی آب و تاب کے ساتھ نہ سہی لیکن ٹمٹماتی ہوئی بھی جل رہی تھی۔ اور اس کی حفاظت کرنے میں **گجرات کے رؤساء اور امراء کا حصّہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔** اس دور میں گجرات میں نوابی ریاستیں او جاگیرداریاں قائم ہو چلی تھی۔

سورت میں عمدۃ التجار شیخ فاضل کے خاندان میں فاضلؔ، محمودؔ، حامدؔ، بخشؔ، بہادرؔ وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔

عمدۃ التجار ملّا عبدالغفور کے خاندان میں ملّا فخرالدین مضطرؔ، ملّا قطب الدین قطبؔ

ریاست سچین کے نواب خاندان میں نواب سیدی عبدالکریم خان کریمؔ، نواب سیدی ابراہیمؔ، محمد یاقوت خان محبؔ، اخلاصؔ، غنیؔ وغیرہ۔

بڑودہ کے نواب حسین خان نصیری، بھروچ کے نواب حامد بیگ اور نواب معزالدین گذرے۔

ان رؤسا اور امراء کے دربار سے کئی شعراء منسلک تھے۔ جرأت کے شاگرد مجبورؔ مسکار سچن سے تعلق رکھتے تھے۔ قطب نے حیدرآباد کے ایک شاعر کو اپنے زیر سایہ رکھا اور نوازا۔ عباسؔ نامی شاعر نواب آف بھروچ کے دربار سے منسلک تھے۔ انہی شاعر عباس سے ایک رزمیہ مثنوی یادگار ہے۔

یہ شعراء حضرات اردو شاعری میں خاص کر صنفِ غزل کی طرف زیادہ راغب تھے۔ تہواروں، تقریبوں کے موقعوں پر ان کے دربار منعقد ہوتے جہاں قصیدے بھی پڑھے جاتے تھے۔منشی میر حیدر کے دربار میں منشی لطف اللہ نے ایک زبردست قصیدہ پڑھا تھا۔ نواب میر غلام بابا خان کے دربار میں منشی میاں داد خان سیاح نواب کے مصاحب تھے۔

اس دور میں گجرات میں کئی مختلف مثنویاں لکھی گئیں۔ غرض گجرات کے ان اُمراء حضرات نے اردو ادب اور ادیبوں کی سرپرستی کر کے اردو کا چراغ روشن رکھا۔

سماجی حالات

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان کو برصغیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے تو اتنے بڑے ملک میں کئی قسم کے لوگ تھے۔ اور انگریزوں کی پالیسی کی وجہ سے یہاں سیاسی، سماجی، مذہبی، لسانی تعصّبات پیدا ہو چکے تھے۔ اور کئی لوگوں نے اس نااتفاقی کا فائدہ اٹھائے ہوئے اپنے انتقامی جذبے کو ہوا دی۔ نتیجتاً یہ نفرت کہیں قومیت کہیں صوبائیت اور کہیں لسانی روپ میں نمودار ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب ہمارے ملک کے ہر قوم و فرقہ اپنی جماعت اپنے دھرم اور اپنے مذہب کی حفاظت اور ترقی کے لیے کوشاں تھے۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے سر سید کو قوم کی فلاح اور بہبود کی فکر ہوئی۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمان تعلیم میں بالکل صفر ہو چکے ہیں۔ حکمرانوں اور حکومت کی وجہ سے ان کے اقتصادی حالات کو زبوں حالی تک پہنچ چکے تھے۔ نوابوں، رئیسوں اور نااہل حکمرانوں کی وجہ سے مسلمانوں کی معاشی حالات انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اور ساتھ ہی وہ مذہب سے بھی نابلد ہوتے جا رہے تھے۔ سماجی حالات بھی قابل اصلاح تھے۔ اردو ادب کو انہوں نے ذہنی تلذذ اور عیاشی کا ذریعہ بنا لیا تھا۔[۲۰] 'ادب برائے ادب' کا زور تھا۔ اس پر 'ستم بالائے ستم' ان میں سے کئی لوگ اپنی کمزوری اور نااہلی کے باوجود سیاسی آزادی میں لگے ہوئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں سب سے زیادہ

مسلمانوں کو ہی ذِک پہنچی تھی۔ وہابی فرقے کے ہزاروں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کئی مسلمانوں کو کالا پانی کی سزا ہوئی امراء کی جاگیریں غصب کر لی گئیں۔ ان تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے انعقاد کے موقع پر ایک نئی سیاسی پارٹی قائم ہوئی۔ جس کا نام مسلم لیگ تھا۔ انگریزوں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اس دور میں سکون اور اتفاق قائم نہ ہو۔ لہٰذا انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفاق و منافرت ڈالنے کی حددرجہ کوشش کی اور ۱۹۰۴ء میں بنگال کو تقسیم کر کے ایک نیا باب کھول دیا۔ ہندوستانیوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ نتیجتاً انہوں نے ۱۹۱۱ء میں اس تقسیم کو منسوخ کر دیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان میں آزادی کی سرگرمیوں نے زور پکڑا۔ ہر تنظیم آزادی حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھی اور ایک وقت ایسا آیا کہ یہ تمام چھوٹی چھوٹی تنظیمیں گاندھی جی کے زیر قیادت آ گئیں۔ اسی زمانے میں انگریزوں سے ناخوش مسلمان تحریک خلافت کا آغاز کر چکے تھے۔ مہاتما جی نے عدم تشدد کی تحریک جاری کی۔ بحرحال ہندوستانیوں نے ۱۹۴۷ء میں آزادی حاصل کر لی۔ ۲۱

ہندوستان رنگارنگ تہذیبوں اور زبانوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ یہاں ہر قوم کے دانشمند اپنی اپنی بساط کے مطابق قوم کی فلاح و بہبود میں لگے رہے۔ اس میں پہل قدمی ہندوؤں کے بیدار مغز راہ نماؤں نے کی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اب مذہبی و سماجی اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ لہٰذا راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۲۸ء میں اسی مقصد کے تحت برہمو سماج قائم کیا۔ اسی کے ساتھ رام کشن نے پرارتھنا سماج اور آریہ سماج جیسی تنظیمیں قائم کیں۔ ان تمام اداروں کے مقاصد و اغراض مذہبی، سماجی، تعلیمی، اصلاحی اور ہندوؤں فلسفوں کی تعلیمات کو پھیلانا تھا اور وہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے آ رہے تھے۔ ہنوز مسلمان بیدار نہیں ہوئے تھے۔ اور وہی 'پدرم سلطان بود' والی کیفیت موجود تھی۔ ۲۲ عیش و عشرت کی زندگی، حسن و عشق کی داستانوں کے طلسم سے انکا ذہن ٹوٹا نہیں تھا۔ 'ستم بالائے ستم' تصوف کی تعلیم نے غلط عقائد قائم کر رکھے

تھے۔ انھوں نے اپنی بے عملی کو رضائے الٰہی سمجھا اور کئی ایسے بہانے تلاش کر لیے جسے وہ مقدر سمجھ بیٹھے تھے۔ کم عقلی اور جہالت نے ان لوگوں میں کئی خرابیاں پیدا کر دی تھیں۔ لیکن ہاں ان ہی دنوں اس زبوں حال قوم کو بھی ایک مصلح قوم مل گیا۔ (سر سید احمد خاں) ان کے رفقاء کار) ان کے ساتھ میدان عمل میں رواں دواں ہوگئے۔ اس محسن قوم کے رفقائے کارنے زندگی کے ہر شعبے میں اصلاح کا کام شروع کیا۔ اس وقت مسلمانوں میں سب سے زیادہ خطرہ جہالت سے تھا۔ اسی لیے ۱۸۸۶ء میں مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا۔ جس کے اجلاس مختلف شہروں میں ہوتے رہے۔ ۲۳ نتیجہ یہ ہوا کہ ان رہنماؤں کی کوششوں سے کئی شہروں میں تعلیمی ادارے اور سماجی انجمنیں بھی قائم ہوئی۔ سر سید کے ہاتھوں کئی ثانوی مدارس قائم ہوئے اسی کے تحت ۱۸۷۳ء میں علی گڑھ کالج کا قیام بھی عمل میں آیا۔ سر سید نے محسوس کیا تھا کہ اگر ہم مغربی تعلیم کو شامل نہ رکھیں گے تو مسلمانوں کی ترقی میں رخنہ پڑ سکتا ہے۔ ادھر کئی لوگوں کا یہ خیال تھا کہ مغربی تعلیم سے مذہب خطرے میں پڑ جائے گا۔ ویسے رامپور میں مدرسہ عالیہ دہلی میں مدرسۂ غازی الدین، لکھنؤ میں فرنگی محل میں علماء حضرات اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ تاہم مسلمانوں کو یہ خوف تھا کہ کہیں یہ مغربی عفریت ان کے مذہب کو نہ نگل جائے۔ اس لیے ۲۰ ویں صدی کے ابتدائی دور میں سہارنپور میں مدرسۂ دیوبند، گجرات میں مدرسۂ ڈابھیل، سورت میں مطلع العلوم اور راندھیر میں مدرسۂ حسینیہ اور اشرفیہ قائم ہو گئے۔ اسی دوران بناوٹی صوفیاء میدان میں سرگرم عمل تھے۔ انھوں نے روحانیت اور گنڈے اور تعویزوں کی دکانیں کھول رکھی تھیں اور یہ انگریز حکومت کے پٹھو تھے۔ کئی خانقاہیں اس کاروبار میں ملوث ہو چکی تھیں۔ ۲۴

ہندو مسلم دونوں قوم کے راہنماؤں نے مغربی تعلیم کو عام کرنے کی پوری کوشش کی۔ نصف ۱۹ ویں صدی تک بمبئی، مدراس، کلکتہ میں تو یونیورسٹیاں بھی قائم ہو چکی تھیں۔ علی گڑھ بنارس، حیدرآباد میں بھی یونیورسٹیاں قائم ہو گئی تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب جدید و قدیم مذہبی خیالات و نظریات کا ٹکراؤ تھا۔ نوجوانوں کی ذہنی حالت عجیب

سی تھی۔ وہ مذہبی عقائد کے بارے میں عجیب سے مخمصے میں پڑے تھے۔ جس کا اظہار مذہب سے بیزاری تھا۔ مشرق و مغرب کے اس تصادم میں اعتدال توازن قائم کرنے کے لیے ۲۰ ویں صدی کی شروعات ہی میں چند دانشوروں نے نئی طرز کے تعلیمی ادارے قائم کیے جو گروکل (ہری دوار)، شانتی نکیتن (بنگال)، کرشنا موری (بھاؤ نگر) مدارس میں اینی بیسنٹ کا ادارہ دہلی میں جامعہ ملیہ، گجرات ودھیاپیٹھ احمد آباد میں، ندوۃ العلماء لکھنؤ، ویمینز یونیورسٹی پونا میں خصوصیت کے حامل تھے۔

اب ہم گجرات کی بات کریں تو یہاں سب سے پہلے ۱۸۲۰ء میں مغربی تعلیم کا سلسلہ مشنریوں کے ذریعہ ہوا۔ جو انہوں نے سورت میں ایک مطبع قائم کرکے شروع کیا۔ اور اس میں بائبل کے ترجمے شائع کیے ساتھ ہی انگریزی گجراتی لغت بھی شائع کیا۔ سورت میں ہی سب سے پہلا مشن کا ثانوی اسکول ۱۸۴۰ء میں قائم کیا گیا۔ ۱۸۵۲ء میں لڑکیوں کا پہلا اسکول قائم کیا گیا۔ سورت میں ۱۸۳۸ء میں انگلو اردو ہائی اسکول کا اجراء کیا گیا۔ ۱۸۶۰ء میں سورت کے ایک شاعر میاں منظور نے منظورالاخبار کے نام سے ایک اردو روزنامہ ہفتہ وار کا اجراء کیا تھا جس نے کافی دنوں تک اردو کی خدمت کی۔ اور ۱۸۴۷ء میں مشنریوں نے بھی لڑکیوں کا اسکول شروع کیا۔ چونی لال شاہ نے دی انگلش اسکول کے نام سے ۱۸۸۸ء میں اسکول کا اجراء کیا۔ ۱۹۱۲ء میں ساروجنک سوسائٹی نے تعلیمی ادارے کھولنا شروع کیے۔ اس زمانے میں کئی پرائمری، سیکنڈری اسکول اور کالج اس ساروجنک سوسائٹی کے ذریعے کھولے گئے۔ سورت میں عرصۂ دراز تک ٹیکنیکل کالج کا سلسلہ جاری رہا۔ احمد آباد میں بھی ۱۹ ویں صدی کے اواخر میں ہی کئی تعلیمی ادارے پائے جاتے ہیں۔ ۱۸۱۶ء میں یہاں پہلا انگریزی اسکول کھولا گیا۔ ۱۸۶۶ء میں مشنری نے اپنے اور بھی اسکول قائم کیے۔ ۱۸۵۷ء میں ٹریننگ کالج اور ۱۸۷۳ء میں آرٹس کالج قائم ہوگیا۔ اور تب سے لے کر اب تک گجرات میں سینکڑوں اسکول اور کالج قائم ہوتے جا رہے ہیں۔ [۲۵]

گجرات میں مسلمان تعلیم کے مقابلے میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ گئے تھے۔

وجہ یہ تھی کہ تاجر اور ہنرمند جماعتوں کے بچے مکتب یا مدرسہ میں دو ایک سال پڑھنے کے بعد ترک تعلیم کر کے اپنے اپنے پیشوں میں لگ جاتے۔ امراء کے بچوں کا عجیب حال تھا۔ وہ خانگی طور پر کچھ لکھا پڑھنا سیکھ لیتے اور ان کی زندگی جاگیروں پر بسر ہوجاتی تھی۔ احمدآباد میں خاص کر مشائخ خاندان میں تعلیم کی طرف ابتداء سے ہی توجہ دی گئی۔ سیٹھ اسمٰعیل تراوانے ۱۸۹۳ء میں سورت میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ احمدآباد میں انجمن اسلام نے ۱۹۰۱ء میں ایک ہائی اسکول قائم کیا تھا۔ جہاں اردو تعلیم دی جاتی تھی۔ اور یہ اردو میڈیم ہی کا اسکول تھا۔ آزادی کے بعد اس میں یہ گجراتی میڈیم کا اضافہ کیا گیا۔ (انجمن اسلام ہائی اسکول آج بھی احمدآباد کے آسٹوڈیہ علاقے میں موجود ہے جہاں اردو اور گجراتی دونوں میڈیم میں تعلیم دی جاتی ہے۔) ۲۶

☆

حواشی

۱۔ تاریخ ادب اردو صفحہ ۹۰، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۷ء
۲۔ مضامین مدنی، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی
۳۔ سخنوران گجرات صفحہ ۱۱۶، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو ۱۹۸۱ء
۴۔ ایضاً صفحہ ۱۱۷
۵۔ گجرات کے ایک شاعر نے جنگ رستم علی کے نام سے ایک رزمیہ مثنوی میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔
۶۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ضمیمہ ا سورت کا نواب خاندان اور ملا خاندان
۷۔ سخنوران گجرات صفحہ ۱۱۸، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو ۱۹۸۱ء
۸۔ ایضاً صفحہ ۱۱۹
۹۔ مرات احمدی، مترجم مولوی سید ابوظفر ندوی، گجرات اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر
۱۰۔ سخنوران گجرات صفحہ ۱۵۴، ۱۵۵ سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو ۱۹۸۱ء
۱۱۔ ایضاً صفحہ ۱۵۵
۱۲۔ اردو شاعری پر ایک نظر صفحہ ۶۰، کلیم الدین احمد بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ ۱۹۸۵ء
۱۳۔ تاریخ ادب اردو جلد اول صفحہ ۵۳۹، ۵۴۰، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۷ء
۱۴۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ صفحہ ۴۲، سید احتشام حسین ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو دہلی ۱۹۸۸ء
۱۵۔ اردو شاعری صفحہ ۴۴، قاضی مشتاق احمد مکتبہ جدید گولا مارکیٹ دریا گنج دہلی ۲۰۰۲ء
۱۶۔ ولی گجراتی قاضی احمد جونا گڑھی صفحہ ۹۱۱ مرتب پروفیسر محی الدین بمبئی والا، گجرات ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر ۲۰۰۴ء
۱۷۔ آب حیات صفحہ ۱۲۷، شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، مطبع کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی
۱۸۔ تاریخ ادب اردو صفحہ ۲۰، رام بابو سکسینہ، مترجم مرزا محمد عسکری، ادارہ کتاب الشفاء، ایس ایچ آفسیٹ ۲۰۰۰ء
۱۹۔ ایضاً صفحہ ۲۲
۲۰۔ ایضاً صفحہ ۲۴۹، ۲۵۰
۲۱۔ سخنوران گجرات صفحہ ۲۵۴، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی
۲۲۔ ایضاً صفحہ ۲۵۵
۲۳۔ اس کانفرنس کے اجلاس سورت میں پہلی بار ۱۹۰۱ء اور دوسری بار ۱۹۱۸ء میں ہوئے تھے۔ بڑودہ اور احمدآباد میں بھی اس کے اجلاس منعقد ہوئے تھے۔
۲۴۔ سخنوران گجرات صفحہ ۱۵۴، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان دہلی ۱۹۸۱ء
۲۵۔ ایضاً ۱۵۷
۲۶۔ ایضاً صفحہ ۱۵۸

باب دوم

انیسویں صدی میں گجرات کے مختلف
ریاستوں کے رؤسا اور امرأ کی ادبی خدمات

باب دوم

انیسویں صدی میں گجرات کے مختلف ریاستوں کے رؤسا اور امرأ کی ادبی خدمات

ہندوستان کے ریاستی نقشے پر جب ہم سرسری طور پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کے مغربی سمت میں ایک خوبصورت ریاست پر نظر پڑتی ہے۔ جسے قدرت نے ایک طویل ساحلی علاقہ عطا کیا ہے۔ اس ریاست کا نقشہ ہی بتاتا ہے کہ یہ سرزمین بہت ہی خوبصورت ہے۔ جغرافیائی ساخت کے لحاظ سے ایک ایسی ریاست ہے جس میں پہاڑی علاقے سرسبز و شاداب جنگلات، صحرا اور بحیرۂ عرب کا خوبصورت ساحل بھی موجود ہے۔

کوہ اروَلی کی پہاڑیوں کا سلسلہ شمالی گجرات کی طرف ختم ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اسی کے سلسلے کی ایک کڑی آبو ہِل اسٹیشن اور اس کے اطراف کا وادی کا علاقہ ہے۔ یہ زمین جغرافیائی ساخت کے لحاظ سے رنگا رنگ نظر آتی ہے۔ کیونکہ اس میں کچھ کا لق دق صحرا ہے۔ اس میں کہیں گھنے جنگلات ہیں تو زرخیز زمین پر لہلہاتے کھیت بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ساتھ ہی اس کی مغربی سمت میں خلیج کھمبات اور بحیرۂ عرب کی موجیں ساحل پر سر مارتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ شاید ہندوستان کی یہی ایک ریاست ایسی ہے جس نے سمندر کا بہت بڑا ساحلی علاقہ پایا ہے۔ گجرات کے دریا اور پہاڑوں نے اسے مختلف حصّوں میں تقسیم کیا۔ یہاں مختلف زبانیں بولنے والے عوام نظر آتے ہیں۔

ریاست گجرات کو ایک خاص اہمیت یہ بھی حاصل ہے کہ وہ شمالی ہند اور جنوبی ہند کا دروازہ کہلانے کا بھی مستحق ہے۔ اسی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں بھی اسے

ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ۱؎ ۱۹ ویں صدی میں سیاسی انتشار کی وجہ سے انگریز حکومت کی طاقت ہندوستان میں ٹوٹ رہی تھی۔ ان کی پالیسی کی وجہ سے کئی حکومتیں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہوگئیں۔ ان ریاستوں کے نواب اور رؤسا حاکم کا درجہ رکھتے تھے او اپنے اپنے علاقوں میں رعایا کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ اسی طرح گجرات میں بھی بہت سی ریاستیں اور زمینداریاں وجود میں آچکی تھیں۔ خاص کر ان ریاستوں میں جوناگڑھ بالاسینور، رادھن پور، پالن پور، مانگرول، کھمبایت، سورت، بھروچ، سچین وغیرہ مسلم ریاستیں قابل ذکر ہیں۔ ۲؎ یہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی اکائیاں بالواسطہ کسی نہ کسی طرح مرکز سے منسلک ہوا کرتی تھیں۔ اکثر رؤسا اور امرأ کسی ایک طاقتور حکومت کے زیرِ اثر رہتے یہ سلسلہ تقریباً ایک صدی سے جاری تھا اور ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ٹوٹتا نظر آتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا ذکر ہوا ہے کہ رؤسا اپنی عوام کا خیال رکھتے تھے۔ وہ فنون لطیفہ کی بھی سرپرستی کرتے ان کے درباروں میں فنکاروں کے جمگھٹے لگے ہوتے وہ اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور داد پاتے تھے۔ یہ نوابین ادب کی بھی سرپرستی کرتے ان کے دربار میں شاعروں اور ادیبوں کا بھی خاص مقام ہوتا تھا۔ اپنے اپنے ذوق کے مطابق ریاست داں ادب کی خدمت میں مصروف رہتے اور اپنی شان سمجھتے۔ ان کی اس خاصیت کی وجہ سے ادب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ یہ اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اسے گجرات میں ایسے رؤسا اور جاگیردار خاندان میسر ہوئے جنھوں نے اردو کی سرپرستی کی۔ ان کی اردو دوستی کی وجہ سے یہاں ادبی محفلیں جاری رہیں اور انھوں نے اردو ادب کی کافی خدمات انجام دیں۔ ان بزرگوں نے اس زمانے کے شاعر اور ادیبوں کی سرپرستی و حوصلہ افزائی نہ کی ہوتی تو اردو ادب کے تاریخی خزانے میں گجرات کا حصّہ نظر نہ آتا۔

مندرجۂ بالا ریاستوں کے رئیسوں اور امیروں کے خاندانوں میں اردو ادب تہذیبی روایت کا درجہ رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے اردو ادب کی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ دورِ حاضر میں کئی لوگوں کے دماغ میں ایک خرافات ہے کہ گجرات یا گجرات کے

لوگوں کا اردو ادب سے کوئی علاقہ نہیں۔ میرا یہاں اس موضوع پر مقالہ لکھنا ہی یہ مقصد تھا کہ ان بزرگوں کی ادبی خدمات کا ذکر کرکے یہ بتانے کی کوشش کروں کہ تقریباً یہاں کے کئی رؤسا اور امراء نے اردو ادب کی دل و جان سے خدمت کی ہے اور اب تک یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ اور گجرات کے مختلف اضلاع میں وہاں کے رؤسا اور امراء اردو کی سرپرستی کرتے رہے تھے۔ ان کا تعارف اس باب میں مختصر طور پر کیا جاتا ہے۔ تفصیل ریاستوں کے تحت آگے لکھی گئی ہے۔ جیسے ریاست سچین کے بہت سے نواب اور ان کے ورثا شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔ یہ ریاست سورت کے بہت قریب واقع ہے۔ ''یہاں کے بانی حبشی بحری سرداروں کے خاندان سے تھے۔ اس خاندان کے کئی بزرگ احمد نگر، بیجاپور، سورت میں بحری بیڑوں کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ بمبئی سے قریب زنجیرہ جزیرہ اسی خاندان کی ایک خود مختار حکومت تھی۔ سید عبدالریم خان اور ان کے بھائی میں ریاست زنجیرہ کو لے کر جانشینی کے سبب تنازعہ پیدا ہوا۔ سید عبدالکریم نے مراٹھوں سے مدد حاصل کی۔ اس وقت پونا میں پیشوا نانا فرد نویس تھا اس نے عبدالکریم کو اپنے قبضے کے چند گاؤں دے کر ایک نئی ریاست قائم کر دی۔ یہ واقعہ ۱۷۹۱ء کا ہے۔ اور وہ ریاست سچین کہلائی۔'' ۳؎ سیدی عبدالکریم اس ریاست کے پہلے نواب کہلائے۔ موصوف کو شعر و سخن کا بہت شوق تھا۔ وہ کریمؔ تخلص کرتے تھے۔ وہ نواب پالو کے نام سے بھی پکارے جاتے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے سیدی ابراہیم خان ان کی وفات کے بعد جانشین ریاست ہوئے۔ یہ بہت ہی فیاض غریب پرور نواب تھے۔ انھیں بھی شاعری میں بڑا دخل تھا یہ محبؔ تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے یوسف اور زلیخا کا اردو میں ترجمہ کیا اور میر حسن کی مثنوی سحرالبیان کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ ان کے یہاں ہر ہفتہ محفل مشاعرہ منعقد ہوتی جس میں سورت اور سچین کے کئی نامی گرامی شعراء شرکت کرتے تھے۔ سیدی ابراہیم خان نے تقریباً ۱۰۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے سیدی عبدالکریم خان دوّم سچین ریاست کے جانشین ہوئے۔ یہ بذات خود تو شاعر نہیں تھے لیکن سخن فہم ضرور

تھے۔ ان کے تین بھائی تھے۔ سیدی عبدالرحیم اخلاصؔ، سیدی عبدالغنی غنیؔ، تیسرے بھائی کا نام نواب ابراہیم خاں دوم۔ اخلاصؔ بھی علم دوست اور ادب پرور انسان تھے۔ ان کا دربار شعراء سے بھرا رہتا تھا۔ سورت کے مشہور شاعر میاں سمجھوؔ سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ مہجورؔ بھی ان کے دربار سے منسلک تھے۔ عبدالغنی غنیؔ بھی نہایت پرگو شاعر تھے۔ یہ میاں داد خان سیّاحؔ کے احباب میں سے تھے۔ غنی نے بمبئ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ انھوں نے ۱۸۸۴ء میں انتقال کیا۔ ان سے متعلق ایک بات بڑی مشہور ہے کہ انتقال کے ایک روز قبل انھوں نے احباب سے مفارقت سے متعلق ایک طویل نظم کہی تھی۔ نواب سیدی عبدالکریم دوم کے بعد ان کے بیٹے سید ابراہیم خان دوم ریاست کے حاکم مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں یکے بعد دیگرے تین نواب گزرے لیکن ان لوگوں کو اردو ادب سے دلچسپی نہیں تھی۔ سچین کے آخری نواب سیدی حیدر خان انگریزی ادب اور تاریخ میں بہت مشہور تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ ان کا کتب خانہ بھی قابل قدر تھا۔[۴]

ریاست سورت

سورت کی سیاست میں انگریزوں کا بہت عمل دخل تھا۔ دراصل کمپنی کا صدر مقام ہی سورت تھا۔ اسی شہر میں مغربی اقوام کی کوٹھیاں واقع تھیں۔ سورت کے لیے دہلی سے متصدی یا قلعدار کا تقرر ہوا تھا۔ ۱۷۲۷ء میں ایک امیر تیغ بیگ خان نے کمپنی کے بل بوتے پر متصدی سہراب خان کو کسی نہ کسی طرح سورت سے نکال کر خود سورت پر حاکم بن بیٹھا۔ اور ریاست والوں نے بھی اسے اپنا آقا قبول کر لیا۔ سورت کے دہلی سے تعلقات منقطع ہوگئے۔ تیغ بیگ خان نے ۱۷۴۶ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد تقریباً ۱۸۲۱ء تک سورت میں چار نواب تخت نشین ہوئے۔[۵] سورت کے آخری نواب میر افضل الدین خان کے کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ اس وجہ سے ان کی وفات کے بعد کمپنی نے شہر سورت اور اس کے مضافات کا انتظامیہ اور عدلیہ کمپنی سرکار نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نواب کے داماد میر جعفر علی خان میر سرفراز علی خان کو وظیفہ خوار

جانشین مقرر کر دیا۔ میر جعفر علی خان کے بھی اولادِ نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کے بعد ان کے داماد غلام بابا کو جانشین مقرر کر دیا۔

نواب میر غلام بابا خان غالب کے بہت بڑے محبّ مانے جاتے ہیں۔ ان کے اور مرزا غالب کے بہت اچھے مراسم تھے۔ غالب کے کئی خطوط میر غلام بابا کے نام موجود ہیں۔ میر غلام بابا قاضی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ قاضی خاندان کے ایک بزرگ سید شرف الدین ترمذی دربار میں عدلیہ منصب پر فائز تھے۔ غلام بابا نے تحصیل علم اپنے خاندان کے بزرگوں سے کیا تھا۔ وہ خود علم دوست نواب تھے۔ بڑے ہی شریف النفس اور منکسرالمزاج شخص تھے۔ سورت والوں میں بہت مقبول تھے۔ ۶؎ وہ منشی میاں داد خان سیّاح اور ان کے مصاحبین میں سے تھے۔ غالب نے ان کی بیٹی کی بسم اللہ کی تقریب میں قطعات لکھ کر بھیجے تھے۔ اسی تقریب میں منشی نول کشور نے بھی شرکت کی تھی۔ یہی وہ واقعات ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ گجرات میں بھی ادب پرستی اور علم دوستی کا بڑا مقام تھا۔ نواب موصوف خود تو شاعر نہیں تھے۔ بلکہ شعراء کے بڑے قدردان تھے۔ انھوں نے ’کیمیائے سعادت‘ کا اردو ترجمہ بھی کروایا تھا۔ ۷؎ نواب صاحب کے یہاں سے کئی شاعروں کو وظیفہ ملا کرتے تھے۔ ان حالات کے تحت ہم کہہ سکتے ہیں کہ گجرات کے رؤساء اور امراء بڑھے ہی علم دوست اور ادب پرور تھے۔

شیخ خاندان

سورت کا شیخ خاندان بھی شعر وسخن اور علوم و فنون کے تعلق سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ خاندان صدیوں تک علم و ادب اور اقتدار کی دولت سے مالامال رہا۔ اس خاندان کے ایک بزرگ شیخ عبداللطیف عُبیدی بغداد سے گجرات آئے تھے۔ اس خاندان نے سورت میں بہت سے سلاطین کا زمانہ دیکھا شہنشاہِ مغلیہ سلاطین گجرات اور کمپنی سرکار کے ادوار میں بھی اس خاندان کے بعض بزرگ اعلیٰ خاندان پر فائز رہے۔ ایک بزرگ شیخ صفّی (صیف خان) جہانگیر کے عہد میں گجرات کے صوبیدار تھے۔ ۸؎ ان کے فرزند شیخ محمد امین شاہ جہاں کے دورِ حکومت میں دو دفع سورت کے متصدی مقرر

ہوئے۔ ابتدا سے ان کا پیشہ تجارت کا تھا یہ کئی جہازوں کے مالک تھے۔ انھیں مغلیہ حکومت کی جانب سے عمدۃالتجار کا خطاب عنایت کیا گیا تھا۔ ۹

اسی خاندان میں شیخ محمد فاضل بن شیخ محمد حامد بڑے عالم و فاضل گزرے ہیں۔ انھوں نے عربی کی کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ انھوں نے ۳۰ لاکھ روپے صرف کرکے چالیس ہزار مخطوطے جمع کیے تھے۔ ان کے کاتب دنیا کے دور دراز کے ملکوں میں جاتے اور وہاں کی مشہور کتابوں کی نقلیں لاتے۔ فاضلؔ صاحب عربی، فارسی اور گجراتی میں بھی شعر کہتے۔ ۱۷۱۶ء میں انتقال ہوا۔ ان کے بیٹے شیخ محمود شاعر تھے اور محمودؔ تخلص کرتے۔ ۱۷۷۰ء میں ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ شیخ محمود کے پوتے شیخ حامد شیخ بہادر کو شعر وسخن کا بہت شوق تھا۔ کمپنی کے عہد حکومت میں سورت کے کمشنر تھے۔ حامدؔ نے ۱۸۲۹ء میں وفات پائی۔ شیخ حامد کے بیٹے شیخ رضی الدین عرف بخشو میاں بہت بڑے مؤرخ تھے۔ انھوں نے تقریباً چار سو تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے دو کتابیں حدیقۂ احمدی اور حدیقۃالہند مرتب کی۔ بخشو میاں کو اردو ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ یہ شاعر بھی تھے اور بخششؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کے نواب مصطفیٰ خان شیفتہ سے بڑے دوستانہ مراسم تھے۔ شیفتہ نے ان کی تاریخ وفات کہی تھی۔ ۱۰

بخشو میاں کے چھوٹے بھائی شیخ فاضل عرف ڈوسو میاں بھی شاعر تھے۔ اور فاضلؔ تخلص کرتے تھے۔ اور میاں سمجھو سورتی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ڈوسو میاں بھڑوچ میں منصف کے عہدے پر فائز رہے۔ تقریباً ۱۸۶۱ء میں وفات پائی۔ ان کے بھائی بخشو میاں کے فرزند شیخ بہادر نے بھی اپنے والد کی طرح انگریزوں کی ملازمت کی۔ وہ بھی اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ چند سال بعد وہ سندھ چلے گئے۔ جب واپس لوٹے تو گائیکواڑ کی سرکار میں صوبے کے نائب کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کا تخلص بہادرؔ تھا۔ علم و ادب انھیں ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے گھر پر بھی شعر سخن کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ شیخ بہادر نے بھی اردو ادب کی بڑی خدمت کی۔ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ ان کے خاندان نے یعنی کہ شیخ خاندان نے اردو اور اردو والوں کی بڑی خدمت کی ہے۔ ۱۱

ملّا خاندان

اس خاندان کے سب سے پہلے بزرگ عبدالغفور بن ابوبکر ۱۶۸۸ء میں پٹن سے سورت آئے۔ اور یہاں تجارت کا کاروبار شروع کیا۔ عبدالغفور صاحب نے کسٹم ہاؤس سے نیلامی کھجور کے بستے خریدے۔ قسمت نے یاوری کی اور ایک بستے میں سے ہیرے جواہرات نکلے۔ اس دولت سے ملّا صاحب نے اور بھی بڑے پیمانے پر تجارت شروع کی۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے ۱۹ جہاز خرید لیے۔ اُن کا کاروبار بہت پھیل گیا۔ ان کی ایک بات بڑی مشہور تھی کہ جب وہ کوئی ایک نیا جہاز بنواتے تو ایک جہاز ڈوب جاتا تھا۔ سرکار کی طرف سے انھیں بھی 'عمدۃ التجار' کا خطاب خلعت اور مراعات حاصل تھیں۔ ۱۲؎ ملا عبدالغفور کے پوتے ملا محمد بن عبدالحیٔ سورت کی سیاست میں نمایاں طور پر حصّہ لیتے تھے۔ انھوں نے تیغ بیگ خان کی بڑی مدد کی تھی۔ دونوں میں کافی یارانہ تھا۔ لیکن جب ان کے درمیان کھٹ پٹ شروع ہوئی تو تیغ بیگ خان نے انھیں قید کر لیا اور زہر دے دیا۔ ۱۷۳۰ء میں ان کی وفات ہوئی۔ اس سانحہ کے بعد محمد علی کے بیٹے حسین جدّا چلے گئے۔ تیغ بیگ کے انتقال کے بعد یہ واپس لوٹے اس وقت کمپنی سرکار کے ایک افسر نے ان کی مدد کی اور انھیں بمبئی بھجوا دیا۔ فخرالدین نے کئی برس بمبئی میں گزارے اور جب حالات سازگار ہوئے تو سورت لوٹ آئے۔ انھیں شاعری سے بڑا لگاؤ تھا اور مضطرؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کا دیوان احمدآباد کے کتب خانہ پیر محمد شاہ میں محفوظ ہے۔ دیوان کے سرِ ورق پر شیخ بہادرؔ کی مہر بھی لگی ہوئی ہے اور قطعِ تاریخِ وفاتِ مضطر بھی تحریر کیا ہوا ہے۔ فخرالدین مضطرؔ کے پوتے قطب الدین ابوالفتح بھی بہت بڑے شاعر تھے۔ اور قطبؔ تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے خوب عیش و عشرت میں زندگی گزاری اور ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔ ۱۳؎

بھروچ کا نواب خاندان

مرزا عبداللہ بیگ ۱۷۸۲ء میں بھروچ کا متصدی تھا۔ آصف جاہ کے گجرات چھوڑ کر جانے کے بعد اپنی جاگیر کا علاقہ بھروچ عبداللہ بیگ کو دے دیا اور اس طرح یہاں

ایک خود مختار ریاست قائم ہوئی۔ عبداللہ بیگ نے اپنا خطاب 'نیک عالم' رکھا اور اس طرح وہ بھروچ کا پہلا نواب قرار پایا۔ ان کی وفات کے بعد ان کا بیٹا محمود بیگ 'نیک عالم دوم' مسند پر آیا اور ۱۷۵۴ء میں عبداللہ بیگ کا پوتا مرزا حامد بیگ رفیع الدولہ جانشین ہوا۔ یہ حامد بیگ عالموں اور ادیبوں کا بڑا قدردان تھا۔ یہ خود بھی اشعار کہتا تھا اور صاحبؔ تخلص رکھتا تھا۔ اس نے ۱۷۶۷ء میں انتقال کیا۔ حامد بیگ کی وفات کے بعد ان کا بیٹا مرزا معز بیگ جانشین ہوا۔ روپے پیسوں کے حساب کتاب کے لین دین میں معز بیگ کی کمپنی سرکار سے جنگ ہو گئی۔ نواب ہار گئے اور بھروچ کا علاقہ کمپنی سرکار کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ معز بیگ کو شعر و شاعری سے بڑا لگاؤ تھا اور سرداروں کی طرح ان کے یہاں بھی ادبی جلسے منعقد ہوا کرتے تھے۔ معز کے دربار کے ایک شاعر عباس نے سرکار انگیریزی کے ساتھ کی گئی جنگ پر ایک مثنوی بھی قلم بند کی ہے۔ مثنوی کا تاریخی نام 'جنگ غمگین' ہے۔ جس کی تاریخ سنہ ۱۸۹۳ء نکلتی ہے۔ معز بیگ کے بیٹے مرزا امیرالدین بھی ادب کے بڑے دلدادہ تھے۔ وہ بھی شعر و سخن کے شائق تھے۔ اور ضاحکؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کی وفات ۱۸۳۳ء میں ہوئی۔ ۱۴

بڑودہ کا میر صاحب کا خاندان

بڑودہ کے خاندانوں میں دو خاندان بڑے مشہور گزرے ہیں۔ وہ اردو سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک میر صاحب کا خاندان مشہور ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ میر سرفراز علی سہوان ضلع بدایوں سے بڑودہ آئے تھے۔ اپنی فوجی لیاقت کی وجہ سے سرکار گائیکواڑ میں اعلیٰ مقام حاصل کیا تھا۔ وہ گائیکواڑ سرکار میں منصب اصلاح اور سردار رہ چکے تھے۔ انھوں نے کمپنی سرکار اور گائیکواڑ کے درمیان سفارتی کام کاج بھی بخوبی انجام دیا۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ ان میں سے میر اکبر علی اور میر جعفر علی دونوں سورت کے نواب افضل الدین کے داماد تھے۔ ۱۵ میر جعفر علی سورت میں اپنے خسر کی جگہ جانشین مقرر ہوئے۔ ادھر میر اکبر علی نے اپنے والد صاحب کا منصب سنبھالا۔ ۱۸۶۰ء میں ان کا انتقال ہوا اور بڑے بیٹے میر ابراہیم

علی ان کی جگہ جانشین ہوئے۔ میر بھائیوں کی تعلیم سورت میں منشی لطف اللہ فریدی کے پاس ہوئی۔ یہ ایک بہت بڑے عالم تھے۔ شاہ کمال مالوی کے اولاد میں سے تھے۔ انھوں نے خود اپنی سوانح عمری لکھی تھی جو ان کے ایک شاگرد نے لندن سے ۱۸۵۰ء میں شائع کی تھی۔ ابراہیم وفاؔ تخلص کرتے تھے۔ وفاؔ اور ان کے بھائی عالم علی غالبؔ سے اصلاحِ سخن لیتے تھے۔ ان کے یہاں ہر ماہ محفل مشاعرہ اور میلاد شریف منعقد ہوتی تھی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے میر احتشام علی صاحب بھی شاعر ہوئے اور جادوؔ تخلص کرتے تھے۔ اسی خاندان کے ایک دوست سید احمد مودودی تھے۔ جو فداؔ تخلص کرتے تھے۔ بہت بڑے شاعر اور علم دوست تھے۔ یہ بھی غالب کے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے فرزند محمود حسین افسرؔ، جوہرؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔

بڑودہ کے نواب خاندان میں ایک اور نواب خاندان تھا جن کے بزرگ سید عبیداللہ ۱۵۰۰ء میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ ان کی پانچویں پشت میں سید نورالدین حسین خان دہلی میں اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ بڑودہ کے اس نواب خاندان میں یہ پہلے شخص تھے جو نواب کہلائے۔ سید نورالدین اپنے بزرگوں کی طرح علم دوست تھے۔ ان کی تصانیف برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں۔ مغلیہ سلطنت میں انھیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ انھیں نواب بہادر اور خان کے خطابات عنایت کیے گئے تھے۔ اسی طرح ایسٹ انڈیا کمپنی اور گائیکواڑ سرکار میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ مہاراج گائیکواڑ نے بھی ان کے ایک بیٹے میر کمال الدین اوّل کو بڑودہ کے نواب کا درجہ دیا تھا۔ نورالدین کے سات بیٹے تھے۔ اور وہ گائیکواڑ بھونسلے نظام حیدرآباد اور کمپنی سرکار میں الگ الگ عہدوں پر منصب دار تھے۔ [16]

نواب صاحب کے ایک بیٹے نواب نظام الدولہ میر صدرالدین حسین خان نظام نواز جنگ اورنگ آباد کے صوبیدار تھے۔ موصوف شاعر بھی تھے۔ ان کے پوتے صدرالدین وجیہ الدین بھی شاعر گزرے ہیں۔ یہ صدرؔ تخلص کرتے تھے۔ صدرؔ کا زمانۂ حیات ۱۸۷۶ء تا ۱۹۲۲ء ہے۔ یہ بڑودہ کے جانشین نواب قرار پائے تھے۔ یہ حالیؔ

اسکول کے نمائندے تھے۔ اپنی قوم کی اصلاح و فلاح و بہبود میں تقریباً ۷۰ چھوٹے بڑے رسالے انھوں نے لکھے تھے۔ اردو نثر و نظم دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے اردو ادب کی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ صدرؔ بہت بڑے ذاتی کتب خانے کے مالک بھی تھے۔ مولانا شبلی اور حکیم اجمل خان نے ان کے کتب خانے کی بڑی تعریف کی ہے۔ بڑودہ میں اردو فارسی کا پہلا مدرسہ جاری کرنے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ اس طرح بڑودہ کے نواب خاندان نے اردو ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ اور خزانۂ ادب میں اپنی جانب سے بڑے ذخیرہ کا اضافہ کیا ہے۔ [۱۷]

مانگرول کا نواب خاندان

ریاست گجرات میں مانگرول ضلع کاٹھیاواڑ میں آیا ہوا ہے۔ کاٹھیاواڑ قدیم بندرگاہ ہے۔ پرانے زمانے میں یہ تجارتی مرکز تھا۔ عزیز الدین آدم شاہ نے یہاں ایک جامع مسجد تعمیر کروائی تھی۔ مانگرول تقریباً ۱۲ سال تک پیشوا کے قبضے میں رہا۔ لیکن شہاب الدین اور فخرالدین دو بھائیوں نے مراٹھوں کو شکست دے کر حکومت کو واپس حاصل کر لیا۔ انھوں نے مانگرول میں خود مختار حکومت قائم کر لی۔ اُس وقت سے چار نواب فخرالدین، شیخ میاں بدرالدین اور باپو میاں تقریباً ۱۸۸۰ء تک مانگرول پر حکمران رہے۔ یکے بعد دیگرے نواب حسین میاں جہانگیر میاں عبدالخالق اور ناصر میاں نوابین ۱۹۴۷ء تک رہے۔ بعد میں ناصر میاں پاکستان چلے گئے۔ مانگرول کی تاریخ سے ابتدائی عہد کے نوابوں کے ذوق و شوق کا تو پتہ نہیں چلتا۔ لیکن نواب حسین میاں صاحب ذوق نواب تھے۔ موسیقی کے بڑے شائق تھے۔ اور اس میں کمال بھی حاصل تھا۔ خود تو شاعر نہیں تھے لیکن شعراء حضرات کے بڑے قدردان تھے۔ مرزا داغؔ دہلوی، جلیلؔ اور دوسرے نامی گرامی شعراء انہیں کی وجہ سے مانگرول کی زینت بنے تھے۔ ان کی شاعر پروری کا ایک قصہ مشہور ہے۔ ایک مرتبہ استاد رامپوری قسمت آزمائی کے لیے مانگرول آ نکلے۔ لیکن ان کی رسائی نواب صاحب تک ناممکن تھی۔ ایک شام مشتاق در دولت پر پہنچ گئے۔ لیکن دربان نے داخل نہ ہونے دیا۔ مشتاق نے

عاجزی سے کہا کہ میری پرچی نواب صاحب تک پہنچا دی جائے۔ لیکن وہ اس پر رضا مند نہیں تھا۔ اچانک نواب صاحب کے بھانجے اس طرف کھیلتے ہوئے آ گئے اور دربان سے پرچی لے کر نواب صاحب کو دے دی۔ پرچی پڑھتے ہی نواب صاحب نے شاعر مشتاق کو بلا لیا۔ ان نوابین میں جہانگیر میاں کو شعر و سخن سے بڑی دلچسپی تھی اور ساتھ ہی قوم کے بچوں کی تعلیم کا بڑا خیال تھا وہ اپنے جیب خرچ سے بچوں کو وظیفہ دیتے۔ ایک صنعتی اسکول بھی قائم کیا تھا انھوں نے اصلاح قوم اور رفاہِ عام کے لیے بہت کوشش کی اس طرح مانگرول کے کئی نوابوں اور رئیسوں نے اردو کی ادبی و لسانی روایت کو قائم رکھا۔ کئی معزز گھرانے ایسے تھے جنھوں نے ادب پروری کا کام کیا۔ ۱۸

جوناگڑھ

گجرات کے خاندانوں میں بابی خاندان بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جوناگڑھ کے نواب بابی کہلاتے ہیں۔ اور بابیوں کا اصلی وطن افغانستان ہے۔ خاندانِ بابی کی ایک وجۂ تسمیہ یہ بھی ہے۔ پٹھان لوگ ہمایوں کے زمانے میں افغانستان سے آئے تھے۔ دراصل بات یہ تھی کہ درّہ خیبر اور درّہ بولان کے ذریعہ ہندوستان کے باہر کی قومیں داخل ہوتی تھیں۔ باہر سے آنے والے حملہ آور زیادہ تر خیبر کے ذریعہ ہی ہندوستان میں فوج کشی کرتے تھے۔ اور یہ بات صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔ ہر آنے والا فاتح اس درّہ کا استعمال کرتا تھا۔ لہٰذا ہمایوں نے اپنے دورِ حکومت میں یہاں ایک فوج تعینات کر دی تھی۔ درّہ گویا ہندوستان کا ایک دروازہ تھا اور جیسا کہ دروازے کو باب کہا جاتا ہے تو یہاں کے رہنے والے پٹھان بھی بابی کہلائے کیونکہ وہ اس دروازے کی حفاظت کرتے تھے۔ بابی خاندان کی تین ریاستیں جوناگڑھ، رادھن پور، اور بالا سینور میں قائم تھیں۔ اس کے علاوہ کاٹھیاواڑ میں بھی ان بابی پٹھانوں کی کافی زمینداریاں موجود تھیں۔ جنھیں وہ ریاست کے نام سے بھی پکارتے تھے۔ ۱۹

گجرات میں سربلند خان نامی ایک پٹھان بابی صوبیدار کے عہدے پر آئے اور یہیں سے تقریباً ۱۷۲۵ء سے گجرات کی سیاست میں بابیوں کے نام پائے جاتے ہیں۔

۱۷۲۵ء اور ۱۷۳۰ء کے درمیان صفدر خان (محمد ظفر خان) بابی بن شیر خان بن بہادر خان بن عثمان خان بن عادل خان کا ایک بیٹا جوانمرد خان جو پیٹلاد کا فوجدار تھا وفات پا گیا۔ سربلند خان نے صفدر خان کے دوسرے بیٹے صلابت خان کو پرسہ دیا۔ ساتھ ہی مرحوم کے بیٹے کمال الدین خان کو جوانمرد خان کا خطاب اور منصب عطا کیا۔ احمدآباد کی سیاسی توڑ جوڑ میں یہ جوانمرد خان ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔ ۱۷۴۴ء تا ۱۷۵۳ء تک گجرات کے صوبیدار کے عہدے پر فائز تھا۔ جوانمرد خان نے کئی بار مراٹھوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن تھک ہار کر اس نے ایک لاکھ روپیہ اور خود مختار ریاست پر اکتفا کرتے ہوئے ریاست کو چھوڑ دیا۔ ۲۰ اور رادھن پور کی خودمختار ریاست کا نواب بن بیٹھا۔ اس طرح یہاں نواب ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ صفدر خان کا دوسرا بیٹا محمد صلابت خان ویرم گام کا متصدی بنا اس نے کسی موقع پر جام نگر کے مہاراجہ کو مدد پہنچائی تھی۔ اس کے صلے میں اس کو سوراشٹر کے تین گاؤں دے دیے گئے تھے۔ صلابت خان کے انتقال کے بعد شیر خان ۱۷۲۹ء میں جوناگڑھ کا فوجدار بنا تھا۔ شیر خان نے ۲۰ سال کی مدت میں اپنے قدم جمائے اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس طرح جوناگڑھ کی ریاست کا نواب شیر خان بن صلابت خان قرار پایا۔ شیر خان کی وفات ۲۹ ستمبر ۱۷۵۸ء میں ہوئی اس کا مزار جوناگڑھ چیتا خان کی مسجد میں ہے۔ شیر خان کے دو بیٹے تھے بڑا بیٹا مہابت خان شیر خان کے بعد جانشین بنا۔ مہابت خان نے ۱۶ سال حکومت کی اور ۱۷۷۵ء میں انتقال کیا۔ نواب مہابت خان کے بعد اس کا بھائی بالاسینور کی جاگیر پر بیٹھا اور سردار محمد خان نے ۱۷۶۰ء میں بالا سینور کو خود مختار ریاست کی شکل دے دی اور اس طرح سردار محمد خان بالا سینور کا پہلا نواب بنا۔

مہابت خان کا بیٹا نواب اکبر محمد حامد نے ۳۷ سال حکومت کی۔ اور انھوں نے ۱۸۱۱ء میں ۴۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ نواب موصوف صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اور نیاز نذر بھی بہت اہتمام سے کرتے تھے۔ وہ ایک بے ریا اور بے تعصب نواب تھے۔ محمد حامد خان کے بعد ان کے بیٹے محمد بہادر ثانی تخت نشین ہوئے۔ حامد خان کو

موسیقی، شطرنج، پتنگ بازی اور نشانہ بازی سے بہت شغف تھا۔ یہ علمی و ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ ان کے یہاں ادبی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ ان کے فرزند محمد مہابت خان ثانی ۱۴ سال کی عمر میں جانشین ہوئے تھے۔ انھوں نے ۱۸۴۰ء میں انتقال کیا۔ نواب صاحب نے ریاست میں تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ دی۔ ۱۸۶۷ء میں ایک کتب خانہ بہادر خانجی کے نام سے قائم کیا۔ ایک انگریزی ثانوی اسکول بھی قائم کیا گیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ۱۸۸۲ء میں محمد بہادر ثالث ساتویں نواب ہوئے۔ محمد بہادر نے ۳۶ سال کی عمر ۱۸۹۲ء میں وفات پائی۔ ان کے دو بیٹے عادل خان اور رسول خان تھے۔ کسی وجوہات کی بناء پر چھوٹے بیٹے رسول خان جی کو نواب بنایا گیا۔ اس کے عہد میں نواب کے ماموں بہاؤالدین وزیر تھے جو بہت بڑے سیاستداں تے۔ جوناگڑھ کا بہاؤالدین کالج ان کی یادگار ہے۔ نواب نے ۵۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے بعد ولی عہد مہابت خان تخت نشین ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں انھیں حکومت کے اختیارات دیے گئے لیکن تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ [۲۱]

☆

حواشی

۱۔ ولی گجراتی قاضی احمد جوناگڑھی صفحہ ۲۰ مرتب پروفیسر محی الدین بمبئی والا، گجرات ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر ۲۰۰۴ء

۲۔ سخنوران گجرات صفحہ ۱۱۸، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو ۱۹۸۱ء

۳۔ مضامین مدنی صفحہ ۱۱۸، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی اردو اکادمی، گاندھی نگر ۱۹۹۰ء

۴۔ حقیقت السورت مترجم پروفیسر محبوب حسین عباسی، گجرات اردو اکادمی گاندھی نگر ۲۰۰۵ء

۵۔ مضامین مدنی صفحہ ۱۱۹، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی اردو ساہتیہ اکادمی، گجرات ۱۹۹۰ء

۶۔ سخنوران گجرات، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو ۱۹۸۱ء

۷۔ مضامین مدنی صفحہ ۱۲۰، سید ظہیرالدین مدنی گجرات اردو اکادمی، گاندھی نگر ۱۹۹۰ء

۸۔ حقیقت السورت صفحہ ۶۸، شیخ رضی الدین احمد بخش عرف بخشو میاں، گجرات ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر ۲۰۰۵ء

۹۔ مضامین مدنی صفحہ ۱۲۱، سید ظہیرالدین مدنی گجرات ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر ۱۹۹۰ء

۱۰۔ سخنوران گجرات صفحہ ۲۸۱، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان ۱۹۸۱ء

۱۱۔ حقیقت السورت صفحہ ۱۵۸، ۱۵۹، مترجم پروفیسر محبوب حسین عباسی، اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر ۲۰۰۷ء

۱۲۔ مضامین مدنی صفحہ ۱۲۲، سید ظہیرالدین مدنی گجرات ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر ۱۹۹۰ء

۱۳۔ سخنوران گجرات صفحہ ۲۸۰، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان ۱۹۸۱ء

۱۴۔ مضامین مدنی، سید ظہیرالدین مدنی، ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر ۱۹۹۰ء

۱۵۔ سخنوران گجرات صفحہ ۳۲۲، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان ۱۹۸۱ء

۱۶۔ ગુજરાતની અસ્મીતા, રજની વ્યાસ, અક્ષરા પ્રકાશન, ગુર્જર પ્રકાશન રતનપોલ, અમદાવાદ

گجرات نی اَسمِتا، رجنی ویاس، اکشرا پرکاشن، گرجر پرکاشن رتن پول، احمد آباد

۱۷۔ مضامین مدنی صفحہ ۱۲۶، سید ظہیرالدین مدنی، گجرات ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر ۱۹۹۰ء

۱۸۔ મંગલપુરી માંગરોલ પેજ ૫૫-૫૬, શંભુ પ્રસાદ હરપ્રસાદ દેસાઇ, પ્રભાસ પ્રકાશન ઓજસ સરદાર ચોક જુનાગઢ, ૧૯૯૩

منگل پوری مانگرول صفحہ ۵۵، ۵۶، شنبھو پرساد ہرپرساد دیسائی، پربھاس پرکاشن اوجس سردار چوک جوناگڑھ ۱۹۹۳ء

۱۹۔ سخنوران گجرات صفحہ ۳۳۲، ۳۳۴، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان ۱۹۸۱ء

۲۰۔ જુનાગઢ અને ગિરનાર પેજ ૧૯૬, શંભુ પ્રસાદ દેસાઇ ૧૯૭૫-૧૯૯૦

جوناگڑھ اَنے گرنار صفحہ ۱۹۶، شنبھو پرساد ہرپرساد دیسائی ۱۹۷۵-۱۹۹۰ء

۲۱۔ જુનાગઢ અને ગિરનાર પેજ ૨૭૫, શંભુ પ્રસાદ દેસાઇ ૧૯૭૫-૧૯૯૦

جوناگڑھ اَنے گرنار صفحہ ۲۷۵، شنبھو پرساد ہرپرساد دیسائی ۱۹۷۵-۱۹۹۰ء

باب سوم

انیسویں صدی میں سورت اور ریاست سچین
میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں
رؤساء امراء کی خدمات

باب سوم

انیسویں صدی میں سورت اور ریاست سچین میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں رؤساء امراء کی خدمات

ہندوستان کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس نے باہر سے آنے والی قوموں کے لیے ہمیشہ اپنا دل اور اپنا گھر کھلا رکھا۔ یعنی آنے والی اقوام کے لیے یہ ملک فراخ دل رہا۔ تجار کے لیے بازار، مہاجروں کے لیے مستقل گھر بار اور فاتحوں کے لیے میدانِ کارزار تو بنا لیکن ہمیشہ انھیں اپنے گھر میں ایسا سمو لیا کہ وہ یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ صدیوں یہ عمل رہا ہے کہ یہ آنے والی قومیں اپنے ساتھ بہت کچھ لاتی رہیں اور انھوں نے وہ سب کچھ ہمارے ملک کو دیا بھی اور جو کچھ انھیں اچھا لگا اسے اپنا بنا لیا۔ اور یہی وجہ رہی کہ ہر صدی میں یہاں ایک نئی تہذیب وجود میں آتی رہی۔ اور اس کو الگ الگ نام سے پکارا جاتا رہا۔ آریاؤں کی آمد سے لے کر مغربی اقوام کی آمد تک ہندوستان میں یہی سلسلہ جاری رہا۔ اس کی تہذیب و تمدن پر ان اقوام کے اثرات نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ فنون لطیفہ کی تمام شاخوں پر ہم ان اثرات کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح چاہے کوئی فن ہو پھر وہ موسیقی سے متعلق ہو یا ادب سے ہو ہر جگہ بیرونی اثرات صاف طور سے نظر آتے ہیں۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ۸ ویں صدی سے ہوئی ہے اور انھوں نے تقریباً ۱۱۹۶ء سے فاتح قوم کی حیثیت سے اپنے قدم جما لیے تھے۔ [۱] اور اس ملک میں مسلمانوں کے قدم جمتے ہی صوفیائے کرام کی آمد بھی شروع

ہوچکی تھی۔ اس سے ہمارے ملک اور مسلمانوں کو بہت بڑا فائدہ پہنچا کیونکہ صوفیائے کرام کے قدموں کی برکت اور روحانی فاتحین کے عمل دخل سے ہندوستان میں ایک نئے ذہن کی تعمیر شروع ہو چکی تھی اور ایک ملی جلی (مشترک) تہذیب رونما ہو رہی تھی۔ یہ مبلغین جہاں کہیں بھی گئے اپنے خیالات کو پھیلانے کے لیے سب سے پہلا یہ کام کیا کہ اس مقام کی زبان اور بولی کو اپنا لیا (اپنا مقصد سمجھانے کے لیے انھوں نے مقامی زبان کا استعمال کیا) یہاں تک کہ ان حضرات نے ہندوستانی لباس اور یہاں کے صوفیوں کی وضع قطع کو بھی اپنا لیا تاکہ غیر ملکی ہونے کی دوری عوام اور ان کے درمیان نہ رہے۔ ان تمام باتوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ ایک نئی زبان پنپنے لگی اور آگے چل کر اس نے اپنا وجود بنا لیا جو مختلف ناموں سے پہچانی جاتی رہی۔ آخر میں اس نے اردو زبان کا نام اختیار کر لیا۔

بقول جمیلؔ جالبی

'یہ زبان سر جھاڑ منہ پھاڑ گلیوں کوچوں میں بھٹکتی رہی۔' ۲

اردو زبان نے جب حکومت و سرکار میں اپنا مقام بنا لیا تو اس کی سرپرستی میں ملک کے ہر طبقے کے لوگوں نے حصّہ لیا۔ ان میں حکمرانوں سے لے کر امراء اور رؤسا نے بھی اس کی سرپرستی میں اپنا حق ادا کیا۔ گجرات مختلف زمانوں میں مختلف سلطنتوں کے ماتحت رہا۔ اسی وجہ سے اس کی حدود بھی بدلتی رہیں۔ انگریز حکومت کے قبل اس کا پایۂ تخت احمدآباد تھا۔ لیکن انگریزوں کے تسلط کے بعد اسے صوبۂ بمبئی میں شامل کر لیا گیا تھا اور بمبئی اس کا صدر مقام قرار پایا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد گجرات کو پھر الگ صوبے کی حیثیت حاصل ہوئی اور آج بھی احمدآباد اس صوبے کا صدر مقام ہے۔

گجرات میں اردو زبان کو صاف کرنے اور اس کو فصیح تر بنانے میں دو عظیم شخصیتوں کا خاص حصہ رہا ایک 'ولیؔ گجراتی' اور دوسرے اردو کے شاعر و نثار 'مرزا غالب' جن کے تلامذہ گجرات میں موجود تھے۔ ۳ پھر ان شاگردوں کے شاگردوں کا سلسلہ قائم ہوا جس کی وجہ سے زبان کو فصیح اور صاف ہونے میں بڑی مدد ملی۔ چنانچہ آج بھی

گجرات کی اردو ہندوستان کے دوسرے اردو مراکز کی زبان سے مختلف نہیں ہے۔ اردو معیاری اور تحریری زبان علاقائی حدبندی سے آزاد ہوچکی۔ زبان کی صفائی اور فصاحت کے اعتبار سے گجرات کے شعراء کو آج سے سو سال قبل بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

'حق یہ ہے کہ ان شعراء نے زبان اردو کو بڑی خوبی سے لکھا ہے اور ان کی زبان کسی طرح دلّی اور لکھنؤ کے عام شعراء سے کم نہیں بلکہ بعض ان میں استادان کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی صفائی اور فصاحت میں کلام نہیں ہوسکتا ہے۔' [۴]

حکومت گجرات مختلف ریاستوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اور ان ریاستوں کے امراء اور رؤسا نے اردو زبان کے لیے اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں خاص طور پر گجرات کی ان ریاستوں کا ذکر ضروری ہے جنھوں نے اردو زبان کی ترویج و ارتقاء میں حصہ لیا۔ یہ ریاستیں مندرجۂ ذیل ہیں۔

(۱) سورت	(۲) بڑودہ
(۳) سچین	(۴) مانگرول
(۵) جوناگڑھ	(۶) بھروچ
(۷) پالن پور	(۸) احمد آباد

ریاست گجرات میں سورت کا مقام

ریاست گجرات ہندوستان کی مغربی سمت پر ہے بحیرۂ عرب کا ایک بہت بڑا کنارہ گجرات کے حصّے میں ہے۔ جہاں تاپتی ندی بحیرۂ عرب سے ملتی ہے اسی کے دہانے پر گجرات کا دوسرے نمبر کا شہر سورت واقع ہے۔ سورت کے قریب راندیر نامی ایک اور شہر آباد تھا جو اب تقریباً سورت ہی میں شامل ہے۔ اس طرح قدیم زمانے میں سورت اور راندیر تاپتی ندی کے کنارے پر آباد تھے۔ سورت اور راندیر کے بیچ سے تاپتی ندی کا گزر ہوتا تھا۔ جس نے نئے اور پرانے دونوں شہروں کو تقسیم کر رکھا تھا۔ [۵]

راندیر سورت سے بھی زیادہ قدیم شہر مانا گیا ہے۔ ایک روایت کے مطابق کسی زمانے میں یہاں تبع تعبیعین میں سے ایک بزرگ آئے تھے۔ جن کا مزار آج بھی راندیر میں واقع ہے۔ ان کے کتبہ تاریخ سے اس مزار کی قدامت کا پتہ چلتا ہے۔ تقریباً ۱۲۲۵ھ اور ۱۳۲۵ھ میں گجرات کے اس کنارے پر کوفہ اور دوسرے مقامات سے عرب آکر بس گئے تھے اور راندیر میں بھی ان لوگوں نے اپنی بستیاں بسا لی تھیں۔ یہ لوگ فوائط کہلاتے تھے۔ آج بھی راندیر میں فوائط نام کا محلّہ موجود ہے۔ یہ تاجر قوم جہاز سازی اور جہاز رانی میں بری مشاخ تھی۔ یہ لوگ تجارت کی غرض سے دور دراز مقامات کا سفر کرتے تھے۔ بہت ہی قلیل مدت میں ان لوگوں نے کافی دولت پیدا کر لی تھی۔ مختلف سیاحوں کے بیانات اور سفرناموں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ عالی مزاج ہوا کرتے تھے۔ ان کے رہن سہن اور گھروں کی آرائش سے ان کی اعلیٰ ظرفی نظر آتی تھی۔ سورت اور راندیر میں ان لوگوں نے اپنی معاشرت کے کافی اثرات چھوڑے ہیں۔ ؁۶

۷ ویں صدی عیسوی میں جزیرہ نما عرب میں جیسے ہی مسلمانوں کی حکومت مستحکم ہوئی وہ اس جزیرہ نما سے نکل کر دوسرے ممالک میں پھیلتے چلے گئے۔ اور انھوں نے ہندوستان اور مغربی ممالک کے بحری راستے پر بھی قبضہ جما لیا۔ جس کی وجہ سے ہندوستان اور ان ملکوں کے درمیان تجارتی تعلقات پر گہرا اثر ہوا۔ بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان اور مغربی ممالک کے تجارتی تعلقات ختم ہو گئے۔ ہندوستان سے جو ضروری اشیاء کی خرید و فروخت کرتے تھے وہ بالکل ختم ہوگئی۔ کیونکہ عربوں نے ان کے تمام راستے مسدود کر دیے تھے۔ اب انھیں ہندوستان کے بحری راستے کی تلاش تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ قطب نما کی ایجاد نے جہاز رانوں کے حوصلے بڑھا دیے پہلے کی بہ نسبت اب لوگوں نے طویل سمندری سفر کرنا شروع کر دیا۔ کولمبس نے ایک نئی دنیا سے روشناس کروایا۔ واسکوڈی گاما نے بھی افریقہ کے راس الامید تک سفر کیا۔ ؁۷ آخر یہ اقوام ہندوستان کے مغربی کنارے تک پہنچ ہی گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ بحری

لٹیرے اور قزاقوں کا بھی زور بڑھتا گیا۔ ۱۵۱۲ء میں پرتگیز لٹیروں نے سورت اور راندیر کو بھی لوٹا اور جلا دیا۔ اسی طرح ان لوگوں نے ۱۵۳۰ء میں دوبارہ سورت اور راندیر کو اپنا ہدف بنایا۔ اور پھر بہت جلد تیسری بار بھی ان دونوں شہروں کو لوٹا اور تاراج کیا۔ یہ دونوں شہر بار بار برباد ہوتے گئے اور آباد ہوتے گئے لیکن راندیر ان حالات کی تاب نہ لاسکا اور دوبارہ آباد نہ ہوسکا۔ لیکن سورت نے آہستہ آہستہ کروٹیں بدلی اور ایک بندرگاہ کی حیثیت اختیار کرلی اور بہت جلد شہرت پائی۔ ۸

جب دہلی پر تغلق خاندان کی حکومت تھی اس وقت فیروز شاہ تغلق نے سورت میں ایک قلعہ بنوا دیا۔ کیونکہ بادشاہ کو بحری سمت سے آنے والے لٹیروں اور قزاقوں کا احساس تھا۔ جو بار بار سورت کو لوٹتے اور برباد کرتے تھے۔ گجرات کے ایک سلطان نے تو ان لٹیروں کے مقابلے کے لیے ایک بحری بیڑا بھی تیار کیا تھا۔ ۱۵۴۰ء میں گجرات کے سلطان محمد سوم نے بھی ایک قلعہ بنوایا تھا اور اس قلعہ کی تعمیر خداوند خان رومی کے سپرد کی۔ اس قلعہ کی وجۂ بنیاد سے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ خداوند خان نے قلعہ کے کئی نقشے تیار کروائے تھے۔ اور جب اس نے یہ نقشے سلطان کے حضور پیش کیے تو سلطان نے جو نقشہ اسے پسند آیا اس پر لفظ مبارک تحریر کر دیا۔ اسی نقشے کے مطابق خداوند خان رومی نے قلعہ تعمیر کروایا۔ اس قلع کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ سورت کو اس وجہ سے بندر مبارک سورت کہا جاتا ہے۔ ۹

۱۴۰۷ء عیسوی تا ۱۵۷۵ء عیسوی تک سورت گجرات کے سلاطین کی حکمرانی میں رہا۔ ۱۵۷۳ء میں اکبر اعظم نے گجرات کو مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا۔ احمدآباد کو فتح کرنے کے بعد اکبر اعظم سورت پہنچا اور وہاں بھی اپنا پرچم لہرایا۔ اب گجرات پر مکمل طور پر مغلیہ حکومت تھی۔ ۱۶۱۶ء میں جہانگیر سورت آیا۔ جہانگیر نے شہر سورت اپنے شہزادے شاہ جہاں کو بطورِ جاگیر عطا کیا۔ اور شاہ جہاں نے ۱۶۴۳ء میں اپنی چہیتی شہزادی جہاں آرا کو پاندان خرچ یعنی صرفِ خاصہ کے لیے دے دیا۔ ۱۰ ان دنوں حقیقت خان سورت کا منصرم تھا۔ اس نے ۱۶۴۴ء میں ایک بڑا ہی نیک کام کیا کہ حج

بیت اللہ کے عازمین کے لیے یہاں سرائے تعمیر کروالی۔ کیونکہ یہیں سے زیادہ تر لوگ بحری راستے سے بیت اللہ کو جایا کرتے تھے۔ اس سرائے کا نام مغل سرائے تھا۔ لہٰذا اس کے اطراف کا علاقہ بھی مغل سرائے کے نام سے مشہور و معروف ہوگیا۔ اسی جگہ یوروپین اقوام نے بھی اپنی کوٹھی قائم کی تھی۔ (آج کل اس مغل سرائے کی عمارت میں میونسپل کارپوریشن کا آفس ہے) ۱۱

عالمگیر کے دورِ حکومت میں سورت نے کافی ترقی کی وہ ایک مشہور بندرگاہ تھا۔ جب عالمگیر نے دکن کا رخ کیا اور مراٹھوں کو زیرِ دست لانے کی کوشش کی تب شیواجی کی ریشہ دوانیاں بہت بڑھ چکی تھیں۔ شیواجی نے اس شہر کو کئی بار لوٹا سب سے پہلے ۱۲ے۱ء میں میں اس نے اس شہر پر حملہ کیا اور اسے لوٹا پھر یکے بعد دیگر پہ در پہ حملے کرتا رہا اور ۱۹ے۱ء میں اس شہر کو لوٹ کر تباہ و برباد کر دیا۔ شیواجی کے علاوہ بھی دیگر مراٹھا سرداروں نے بھی گجرات پر کئی حملے کیے اور اس طرح سورت کا سکون درہم برہم ہوتا رہا۔ ۱۲ حتیٰ کہ ۱۹ے۱ء میں مراٹھوں نے سورت کے قریب سون گڈھ میں مستقل ڈیرے ڈال دیے اور گجرات پر لگاتار حملے کرتے رہے۔ اس دوران سورت کئی بار ان کی لپیٹ میں آجاتا تھا۔ سورت ایک ایسا شہر تھا جہاں حملہ آوروں کے علاوہ اور بھی کئی آفتیں آتی رہیں۔ ۱۸ ویں صدی اور ۱۹ ویں صدی سورت کے لیے بہت ہی نامبارک ثابت ہوئی۔ اس شہر کو آسمانی آفتوں نے بھی نہ چھوڑا۔ کبھی سیلاب کبھی قحط سالی، کبھی وبا تو کبھی آفت زدگی نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو ۱۷۹۷ء میں زبردست سیلاب آیا۔ ۱۷۹۰ء میں قحط سالی کا بول بالا تھا۔ ۱۸۱۰ء میں پھر سیلاب آیا۔ ۱۸۱۲ء میں زبردست زلزلہ آیا۔ ۱۸۱۳ء میں پھر قحط۔ ۱۸۱۹ء میں زبردست آگ لگی۔ پھر ۱۸۲۲ء میں سیلاب ۱۸۳۵ء اور ۱۸۳۷ء میں زبردست آتش زدگی اور سیلاب ۱۸۶۹ء میں سیلاب اور ۱۸۸۱ء میں ہیضہ ستم بالائے ستم ۱۸۸۳ء میں زبردست آندھی اور طوفان (Cyclon) اس طرح ۱۸۸۳ء میں پھر سیلاب ۱۸۸۹ء میں پھر ہیضہ ۱۸۹۳ء میں آتش زدگی یہاں تک کے ۱۸۹۶ء میں پلیگ کی وبا

نے بھی سورت کو نہ چھوڑا۔ ۲۰ ویں صدی تک پانچ چھ بار سیلاب آچکے حال ہی میں ۲۰۰۶ء میں بھی زبردست سیلاب آیا۔ مندرجہ بالا تاریخی سانحات نے سورت کی صورت ہی بگاڑ کر رکھ دی۔ ۱۳

سورت کے چند منصرم اور رؤسا حضرات

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اورنگ زیب کے بعد دہلی کی مرکزی حکومت انتہائی کمزور ہوگئی تھی۔ صوبے دار، قلعہ دار، کوتوال، فوجدار متصدی جیسے عہدے داروں میں اقتدار کے لیے آپس میں خانہ جنگیاں ہونے لگیں۔ اور ان خانہ جنگیوں کا فائدہ مرہٹوں اور انگریزوں نے خوب اٹھایا۔ ۱۷۲۵ء میں سہراب خان سورت کا منصرم تھا اور بیگ خان ثانی (مرزا گدا بیگ) قلعہ دار تھا۔ اس عہد میں شہر کے عمائدین میں سے ایک تاجر ملاّ محمد علی شہر کے باہر قلع تعمیر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ سہراب خان کو یہ بات پسند نہ آئی۔ لہٰذا ملاّ صاحب نے بیلگر خان کو اپنا طرفدار بنا لیا اور شرط یہ رکھی کہ ملاّ صاحب بیلگر خان کے بھائی تیغ بیگ خان (مرزا گل) کے نام سے دہلی میں متصدی کے عہدے کی سند منگوا دیں گے۔ ۱۴ ساز باز کے بعد قلعہ دار نے کسی حلیہ بہانے سے سہراب خان کی حویلی پر دھاوا بول دیا اور گولہ باری شروع کر دی۔ زبردست جنگ ہوئی اور آخر سہراب خان کو ہتھیار ڈال دینے پڑے اور تیغ بیگ خان یعنی مرزا گل یہاں کا متصدی مقرر ہوا۔ کچھ دنوں بعد اس مرزا گل اور ملاّ صاحب میں ناچاقی ہوگئی اور ملاّا صاحب دوبارہ سہراب خان کے طرفدار ہوگئے۔ غرض تقریباً دس سال تک یہ معاملہ چلتا رہا آخرکار تیغ بیگ خان انگریزوں کی مدد سے دوبارہ برسرِ اقتدار آیا۔ اور اس نے ملاّ صاحب کو زہر دے دیا۔ تیغ بیگ خان نے مرکزی حکومت سے تعلقات منقطع کردیے اور متصدی کی بجائے نواب کا لقب اختیار کر لیا۔ اس دن سے سورت میں نوابی دور کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۵ ۱۷۴۶ء میں تیغ بیگ خان کا انتقال ہوگیا اور سورت کی نظامت کا جھگڑا پھر شروع ہوا۔ یکے بعد دیگرے نواب برسرِ اقتدار آنے لگے۔ آخر ۱۷۵۸ء میں تیغ کے داماد میر معین الدین عرف سید اچھن نے کمپنی سرکار کی

مدد سے نظامت حاصل کر لی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا حفیظ الدین نواب بنا اور ۱۷۹۰ء میں ان کی وفات پر ان کے بیٹے میر نظام الدین جانشین ہوئے۔ ان کی اولادِ نرینہ نہیں ہونے کی وجہ سے ۱۸۰۰ء میں ان کے بھائی نصیرالدین کو کمپنی نے اس شرط پر جانشین مقرر کیا کہ وہ محکمۂ عدالت کے سوا تمام نظم و نسق شہر کمپنی کے سپرد کر دیا جائے۔ اور اس کے عوض ایک لاکھ روپیہ وظیفہ اور شہر کے محصول کا پانچواں حصہ لے لیں۔ ۱۸۲۱ء میں نصیرالدین کے انتقال پر ان کے بیٹے میر افصل الدین خان کو جانشین مقرر کیا گیا اور محکمۂ عدالت بھی چھین لیا گیا۔ ان کے بعد میر جعفر علی خان کے سپرد کی گئی۔ جعفر کی اولاد میں ایک بیٹا میر ذوالفقار علی اور دو بیٹیاں تھیں۔ میر جعفر علی خان کی وفات کے بعد نوابی کا سلسلہ ختم ہو گیا اور وظیفے ملتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ وظائف ان کے خاندان کو پشت در پشت ملتے رہے اور ۱۹۱۴ء تک میر غلام غوث اور میر وزیر تک نے یہ وظیفے حاصل کیے۔ ۱۶

۱۶ ویں صدی میں گجرات میں بندرگاہ سورت نے اہم مرکز کی سورت اختیار کر لی تھی۔ اور وہ تجارت کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا۔ عرب تاجر یہاں سے بے شمار اشیاء سمندری راستے سے دوسرے ملکوں میں لے جاتے اور وہاں کی اشیاء یہاں لاکر فروخت کرتے اس طرح سورت کی بندرگاہ پر خرید و فروخت کا بازار گرم رہتا اس لیے یوروپی اقوام کی نظروں میں سورت پہلے ہی سے بسا ہوا تھا۔ اور ان کے درمیان سورت میں جگہ بنانے کی مقابلہ بازی جاری تھی۔ خاص کر پرتگیز اور انگریزوں کے درمیان یہاں ایک بحری جنگ بھی ہوئی اس وقت گجرات میں مغلوں کی حکومت تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیادیں یہاں بہت مضبوط ہو سکتی تھیں۔ انگریزوں نے جہانگیر کے دربار سے تجارتی پروانے حاصل کر لیے تھے۔ سورت، کھمبات، گھوگھا اور احمد آباد میں انھوں نے اپنی تجارتی کوٹھیاں بھی قائم کر لی تھیں۔ ڈچ اور فرانسیسی کمپنیوں نے بھی یہاں تجارتی مراکز قائم کرنے میں کافی دوڑ دھوپ کی۔ ۱۷ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ مغلیہ دور میں تجارت کی وجہ سے سورت انتہائی عروج پر

تھا۔ اس دور میں انگریزوں کے دوش بہ دوش ہندو عرب اور ترک تاجر بھی منڈیوں میں نظر آتے تھے۔ ہندو میں کافی مہاجن ایسے تھے جو بیک وقت کروڑوں روپے بطورِ قرض دیتے تھے۔ مسلمانوں میں ملاّ عبدالغفور، فیروز حامد سرخیزی، صالح چلپی، مرزا زاہد بیگ اس دور کے کروڑپتی میں سے تھے۔ ۱۸ ملاّ صاحب ۱۹ جہازوں کے مالک تھے۔ اور عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان سے متعلق 'ضرب المثل' مشہور تھی۔ 'عبدالغفور دولت بھر پور' شیخ حامد کے پاس سات جہاز تھے۔ اس خاندان کے بعض افراد ادب میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ صالح چلپی ترک تاجر تھے۔ جب یہ شہر میں نکلتے تو ہزاروں سپاہی باڈی گارڈ وغیرہ ان کے جلو میں ہوتے تھے۔ تینوں تاجروں کو مغلیہ حکومت کی طرف سے عمدۃالتجار کا خطاب، خلعت اور ایک لاکھ محیط کی معافی کا اعجاز حاصل تھا۔ ۱۸۰۰ء کے آخر تک ان تینوں کا طوطی بولتا تھا۔ سورت میں ہندو مہاجنوں کا محلّہ تاناوٹ مسلمانوں کے محلے سوداگرواڑہ، ترکی واڑہ، مغل سرائے ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ عالمگیر کا زمانہ خلفشار کا زمانہ تھا۔ مگر تجارتی نقطۂ نظر سے یہ عروج کا زمانہ تھا۔ مراٹھوں کی لوٹ مار کے باوجود بازار بارونق تھے۔ اکثر شاہی خاندان کے افراد کے بڑے بڑے ٹھیکے تھے۔ تجارت میں ان کو خاص مراعات حاصل تھیں۔ تجارت ہی کی وجہ سے سورت میں جہاز رانی اور جہاز سازی کا کاروبار بہت اچھا تھا اور اس کاروبار میں پارسی لوگ بھی بہت شہرت رکھتے تھے۔ ۱۹

۱۹ ویں صدی میں بمبئی تجارتی مرکز بن گیا اور سورت کی رونق کچھ ماند پڑ گئی۔ تاہم تجارتی اعجاز تو گجرات اور خصوصاً اہل سورت کو ہی حاصل تھا۔ بمبئی کے فروغ کو دیکھ کر گجرات کی کچھ تاجر قوموں نے جیسے جین، بنیاء، داؤدی بوہرہ، میمن، پٹنی وہرا وغیرہ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوکنیوں کے دوش بدوش تجارتی سلسلے بمبئی میں قائم کر لیے۔ ۱۸۶۴ء میں بمبئی سے احمدآباد تک ریلوے لائن لگ گئی۔ جس کی وجہ سے سورت اور بمبئی میں آمد و رفت بڑھ گئی اور روزگار کا سلسلہ قائم رہا۔ ۱۸۶۰ء سے ۱۸۷۰ء تک کپاس کا سٹّہ شروع ہوا۔ ۲۰ شیئر بازار اور سٹّے سے ایک بار پھر سورت کا

بازار زوروں پر آ گیا۔ لیکن ایک بات یہ ہوئی کہ اس سٹّے کی وجہ سے مفلس دولتمند اور دولتمند مفلس ہوگیا۔ اس روزگار میں دولت تو آسانی سے آتی ہے لیکن جاتی بھی اسی انداز سے ہے۔ دولت کے اس الٹ پھیر سے غیر تاجر بھی متاثر ہوئے اور تجارت کے میدان میں وہ بھی آ گئے۔ اس طرح سورت میں کاتنے بننے کے کارخانے (ملیں) کپاس کی جینیگ، فیکٹریاں، لوہے ڈھالنے کے کارخانے کاغذ سازی کے کارخانے وغیرہ قائم ہوگئے۔ تجارت کی وجہ سے امراء کے طبقے کو بھی ذہنی سکون حاصل ہوا۔ ان میں کئی لوگ عملی طور پر تجارتی میدان میں اپنے قدم جما چکے تھے۔ بیلا مل، غلام بابا مل، جعفر علی مل وغیرہ اسی ذہنی انقلاب کی یادگاریں ہیں۔ ان مِلوں میں نواب بیلا، غلام بابا علی، نواب جعفر علی وغیرہ نے اپنا سرمایہ لگایا تھا۔ ۲۱ اور یہ بڑے حصے دار تھے یہ امراء تجارتی ذہن، مزاج اور سوجھ بوجھ نہیں رکھتے تھے۔ نہ جانے کتنی دولت ٹھکانے لگ گئی اس کا اندازہ بھی نہیں رہتا تھا۔ پٹنی جماعت کے ایک شخص میاں جمال الدین نے کاغذ کا کارخانہ قائم کیا تھا۔ ہندوستان اور اس کے باہر پٹنی جماعت کے بڑے بڑے تجارتی سلسلہ قائم تھے۔ جمال الدین کے خاندان کے لوگ آج بھی موجود ہیں اور کاغذ کے مشہور تاجر ہیں۔ پٹنی جماعت کے لوگ عموماً تجارت پیشہ ہیں۔ ان میں سے بعض جاوا، سماترا، برما، موریشیس جدّہ وغیرہ میں تجارت کرتے ہیں۔ اور کئی خاندان ہندوستان میں آج بھی اس تجارت میں رواں دواں ہیں۔ اسی جماعت کے کرانی میاں، عثمان کاغذی، نرما والا منیار مہوا، ولی اللہ وغیرہ خاندانوں میں سے بعض گزشتہ دور میں گذرے ہیں اور بعض موجودہ دور میں تجارت میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ ۱۹۰۰ء تک سورت میں دولت کی فراوانی تھی۔ ۲۲ بیوپار روزگار میں کئی لوگوں نے زِک اٹھائی اور کئی کامیاب ہوگئے۔ وقت کے ساتھ مہنگائی بڑھتی گئی ور لوگوں کو زیادہ سے زیادہ کمانے کی فکر لاحق رہی۔ ملازمت پیشہ اور تجارت پیشہ لوگ تو پھر بھی اچھے رہے۔ لیکن گرانی کی وجہ سے امیر طبقہ جس کی آمدنی کے ذرائع محدود تھے ان کی وضع قطع داری کو بہت صدمہ پہنچا۔ اور وہ اپنی وضع داری قائم رکھنے کی وجہ سے پشت در پشت مقروض بن گئے۔ ۲۳ سورت میں

مختلف مذاہب اور فرقے کے لوگ بستے ہیں۔ ہندو، عیسائی، پارسی، مسلمان سبھی عہد قدیم سے یہاں موجود ہیں۔ ۱۷ ویں صدی اور ۱۸ ویں صدی میں نامی گرامی صوفیوں، کاغذیوں، مفتیوں، عالموں کے نام ملتے ہیں۔ ان کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ ان دو صدیوں میں سورت میں مذہبی ماحول نہایت خوشگوار تھا۔ حضرت سید جمال الدین عرف دانا صاحب اور حضرت شیخ سید عیدروس رفاعی کی خانقاہیں ہیں۔ اور مدارس دینی اور دنیوی علوم اور رشد و ہدایت کے بڑے مرکز یہاں موجود تھے۔ اس عہد میں خانقاہوں کو کئی حیثیتوں سے اہمیت حاصل تھی۔ ان کے صدر نشین مذہبی رہبر ہی نہیں تھے بلکہ تبلیغ اسلام اور تصوفی نظام کے علاوہ سیاست، سماج، عدل و انصاف وغیرہ سبھی شعبوں میں ان کے احکام و فرامین سر آنکھوں پر لیے جاتے تھے۔ امراء اور رؤسا ان لوگوں سے عقیدت رکھتے تھے ان کی فقیری میں بھی ان کی شاہی تھی۔ ۲۴

سورت کے مختصر تہذیبی و تمدنی حالات اور زوال کے اسباب

مسلمان ۱۹ ویں صدی سے کچھ پہلے ہی دورِ زوال میں پھنس چکے تھے۔ مذہب، سماج، علم و ادب اور ہر ایک شعبۂ حیات میں ان کی صحیح روح (اسپرٹ) مجروح ہو چکی تھی۔ غلط تصورات قائم ہو گئے تھے۔ تہذیبی رسوم و روایات کو افضل سمجھا جاتا تھا۔ مذہب نذر و نیاز میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔ اسی کو راہِ نجات اور ذریعۂ بخشش سمجھ لیا گیا تھا۔ خانقاہیں سونی ہو چکی تھیں۔ کئی خانقاہیں تعویذ، گنڈوں اور جھاڑ پھونک کی دوکانیں بن کر رہ گئی تھیں۔ صوفیاء اور امراء کے خاندانوں میں آپس میں رشتہ داریاں اور شادی بیاہ ہونے لگے تھے۔ جس کی وجہ سے صوفی خاندانوں میں فقر و فنا کے بجائے دنیوی مثالی بقا کا تصور کارفرما تھا۔ عجز و انکساری کی جگہ غرور و تمکنت نے لی تھی۔ خانقاہوں اور ان کے بزرگوں کو انگریزوں نے انعام و اکرام اور خطابات دے کر اپنے ایجنٹ بنا لیے تھے۔ اسلام کے خانقاہی طریقوں کو مذہبی تراکیب میں رسماً ضرور برتا جاتا تھا۔ لیکن تراکیب کے آداب و روایات میں فکر کی جگہ امارت کی شان اور جاہ و ثروت کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ ۲۵ اگر کوئی شیعہ عہدے دار آجاتا تو سُنّیوں کو نہ

بخشتا۔ حیدر علی خان متصدی نے ۱۷۷۱ء میں ملاّ محمد علی کی تمام جائیداد ضبط کر لی تھی۔ اس نے بعض مذہبی مسائل کے اختلاف پر شیخ خاندان کے بزرگوں کو بہت پریشان کیا۔ اہل سنت و جماعت نے بعض امور میں شیعوں کے طریقے اختیار کر لیے تھے۔ سورت میں ویسے تو امام باڑہ ایک ہی تھا لیکن دیکھا جائے تو ہر گھر میں ایک امام باڑہ تھا۔ تعزیہ داری، سوانگ، ماتم و سوز و فدائی شربت و شیرینی اور حسینؓ کے نام پر فقیری میں جوش و عقیدت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ غریبوں نے دکھوں سے نجات اور مرادوں کے حصول کے لیے اللہ کو بھول کر حسینؓ سے مانگنے کے طریقے بنائے تھے۔ امراء نے غم و اندوہ میں بھی دادِ عیش کے عجیب مقدس طریقے نکال لیے تھے۔ نہ کسی کو غم حسین تھا۔ نہ دل میں احترام بلندیٔ کردارِ حسین تھا۔ دراصل ایک قسم کی انفرادیت تھی۔ ۲۶

امراء کے یہاں شب و روز محفلیں سرگرم رہتی تھیں۔ لیکن محرم کے دس دن ان کے یہاں سوزخوانی کی مجالس ہوتی تھی۔ کیونکہ میراثی احتراماً ان دنوں گانا بجانا بند رکھتے تھے۔ اس دور میں سورت میں طوائفوں کا بول بالا تھا۔ گویا سورت گجرات کا لکھنؤ تھا۔ امراء کی جیبیں خالی ہوتیں اور اربابِ نشاط کے دامن بھر جاتے طوائفیں اپنا ایک چھوٹا سا تعزیہ بھی بنواتیں۔ آشورہ کے روز سہ پہر کو یہ تعزیہ صرف چکلے کے گرد گشت کے لیے نکالا جاتا اس وقت بڑی بھیڑ بھاڑ ہوتی۔ شہر کے رنگین مزاج، بانکے اور امراء سبھی جمع ہوتے تھے۔ تعزیہ کے پیچھے طوائفوں کا غول ہوتا جو حسینی فقیروں کا روپ اس طرح اختیار کرتیں کہ سبز پریاں دکھائی دیتی تھیں۔ طوائفیں سوز پڑھتیں اور تعزیہ کے ساتھ چلتی جاتیں اور اسیر خانہ ان کے رنگین مزاج طوائفوں کو حلقے میں لیے ہوئے چلتے۔ یہ مختصر سا فاصلہ طے کرنے میں دو تین گھنٹے گزر جاتے۔ امراء طوائفوں کے کوٹھے پر جاتے اس بات کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ وہاں کسی ایسے ویسے کی مجال نہیں تھی جو طوائفوں کے کوٹھے پر قدم رکھے لیکن ۲۰ ویں صدی کے آغاز ہی میں امیروں کے دن بدل گئے تھے۔ ان کی جیبیں خالی ہو چکی تھیں۔ لہٰذا نو دولتیوں نے ان کی جگہ لے لی تھی۔ ۲۷

جیسا کہ ہم نے کہا سورت گجرات کا لکھنؤ تھا اس شہر پر مغلیہ تہذیب کا گہرا اثر رہا ہے۔ مشائخ اور عرب تاجروں کی وجہ سے سورت میں اسلامی تہذیب کا بھی ایک الگ دھارا تھا۔ جو نمایاں تھا۔ سورت میں عربوں کی وجہ سے ان کی کئی عادتیں موجود تھیں۔ مشائخین اور عرب خاندان میں قہوے سے ہی مہمانوں کی تواضع کی جاتی تھی۔ دیگر خاندانوں میں مہمانوں کی شربت اور پان سے تواضع کرتے تھے۔ اور ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی میں عرب تاجروں اور مشائخین کے ایک محلے سیدہ واڑہ کے محلے کو ہندو عوام گھنٹی والوں کے نام سے یاد کرتے تھے کیونکہ روزانہ صبح ان کے گھروں اور حویلیوں کی دیواروں میں ان کے حبشی غلام ہاون دستہ میں قہوے کے بیج کوٹا کرتے تھے۔ اور قہوے کے لیے یخنی تیار کی جاتی تھی۔ اور دستوں سے کوٹنے کی وجہ سے گھنٹیوں کی سی آواز آتی تھی۔ اسی لیے ہندو عموماً ان کے محلّے سیدہ واڑہ کو گھنٹی واڑہ کہتے تھے۔ ان چند باتوں سے سورت کی جاہ و جلالی کا اور اس وقت کی تہذیب سے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ [۲۸] لیکن اس زمانے میں یہاں مسلمانوں نے اپنے اقتدار کا پرچم لہرایا۔ اور چمن بندی کے پھوارے اڑائے وہاں انھوں نے علم و ادب کے گلزاروں کو بھی آراستہ کیا۔ سلاطین گجرات بھی علم و ادب میں خصوصی اعزاز کے مالک تھے۔ مغلوں کے دورِ حکومت میں بھی سورت علماء و فضلاء سے خالی نہیں تھا۔ ۱۷ ویں اور ۱۸ ویں صدی کے علماء میں سید عبدالوہاب بخاری صاحب ۱۶۰۵ء میں اور ان کا خاندان مرجان شامی کا مدرسہ اور خواجہ دانا صاحب کا مدرسہ خواجہ بہادر صاحب ۱۶۰۷ء اور ان کا خاندان حضرت شیخ عبد روس صاحب ۱۶۲۱ء اور ان کا خاندان سید عبد الحق صاحب ۱۸۸۶ء شیخ حسن جی صاحب ۱۶۵۲ء۔ سید فتح اللہ جیلانی صاحب ۱۶۵۵ء۔ سید علی واعظ ۱۷۳۵ء حضرت شاہ سعداللہ ۱۷۲۵ء ان کے پدر میر ولی عزلت۔ مولانا غیرلادین محدث صاحب ۱۷۹۱ء۔ حضرت ولی اللہ صاحب ۱۷۹۳ء میر عبداللہ تجرد صاحب ۱۷۹۲ء ۔ وغیرہ ایسے عالم گزرے ہیں جو اپنے علم و فضل کی وجہ سے دور دور تک شہرت رکھتے تھے۔ [۲۹] ان کے علاوہ مفتی اور قاضی صاحبان کے نام بھی ملتے ہیں جو

علوم دینی میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ سورت میں ایک محلّہ ایسا تھا جہاں سے علماء کی ۵۲ پالکیاں نکلتی تھیں۔ اس دور کی علمی و ادنی مجالس میں معمولی عالموں کو باریابی حاصل نہ ہوتی تھی۔ عیدروس خاندان کا مدرسہ علم و ادب کا مرکز تھا۔ ۱۹ ویں صدی میں بھی علماء کی کثیر تعداد موجود تھی۔ مثلاً مولوی کریم اللہ شاہ جہاں آبادی ۱۸۲۹ء شیخ شریف عیدروس ۱۸۵۱ء باعظہ خاندان کے معلم ابراہیم ۱۸۶۵ء ان کے بیٹے شیخ علی شیخ عبدالمجید واعظ ۱۸۹۱ء قاضی غلام علی ۱۸۹۲ء اور قاضی سید اخی برادرِ غلام بابا سید غیاث الدین ۱۸۵۹ء سید صالح واعظ قادری ان کے بیٹے سید نظام الدین قادری واعظ ۱۸۷۶ء خوب میاں خوصاحب، منشی عبدالحلیم، مولوی محمود، مولوی کاظم، مولوی برکت اللہ وغیرہ علوم و عقلی و فضلی میں بلند مقام رکھتے تھے۔ ۳۰ علم و ادب میں آج تک ان کا نام زندہ و جاوید ہے۔ سورت میں علم و ادب کا یہ گہوارہ زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ خلفشار کے دور میں اقتصادی حالت خراب ہو رہی تھی۔ لوگ فکر و معاش میں سرگرداں تھے۔ امراء تہی دست ہو چکے تھے۔ علوم فنون کی سرپرستی میں کمی ہو گئی تھی۔ جدید تعلیم کا سلسلہ ۱۸۲۶ء سے شروع ہو چکا تھا۔ ۱۸۷۵ء تک ۷۰ سے ۷۵ اسکول قائم ہو چکے تھے۔ ہندو دور اندیشوں نے خانگی اسکول بھی قائم کر دیے تھے۔ آئرس پریس مشن والوں نے ۱۸۴۲ء میں پہلا ثانوی اسکول قائم کیا تھا۔ لڑکیوں کے لیے بھی اسکول کھول دیے تھے۔ لیکن ان اسکولوں میں زیادہ تر پارسی اور ہندو طلباء تعلیم پاتے تھے۔ بدنصیب مسلمانوں کا نہ کوئی اسکول تھا نہ تعلیم کی طرف رغبت رکھتے تھے۔ امراء کے یہاں اب بھی دورِ تعیش کا خمار باقی تھا۔ اور پھر وہ معاشی بدحالی میں گرفتار ہو چکے تھے۔ چند گنے چنے خاندانوں کے بچے انگریزی اسکولوں میں تعلیم پاتے تھے۔ ۱۸۷۵ء کے بعد پرائمری اسکولوں میں فیس کی معافی کا کچھ انتظام کیا گیا تو مسلمان بچے پرائمری اسکولوں میں نظر آنے لگے سورت میں مسلمانوں پر جمود طاری تھا۔ اور رہبری کا فقدان تھا۔ ۳۱ اس صدی کے اواخر میں مسلم ایجوکیشن کانفرنس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ لیکن ایک بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ مسلمان اپنی نئی پود کے مستقبل پر غور کرنے لگے

اور یہ خیال ان کے دل میں جاگزیں ہو گیا کہ اپنے بقا و بہبود کا دارومدار حصولِ تعلیم پر مشتمل ہے۔ اس طرح کانفرنس کا مقصد ضرور پورا ہوا۔

امراء و رؤسا کا ادبی ذوق و ادب پرستی

۱۹ ویں صدی میں سورت شعر و سخن کے لیے خصوصیت کا حامل تھا۔ ۱۷ ویں صدی کے نصف آخر میں گجرات میں اردو کا مجتہدالعصر شاعر ولؔی پیدا ہوا۔ جو پورے ہندوستان کے لیے ریختہ کے استاد کا درجہ رکھتا تھا۔ پھر ۱۸ ویں صدی میں دوسرا استاد سید عبدالولی عزلت گزرا۔ یہ بھی صفِ اوّل کے ممتازشعراء میں شمار ہوتا تھا۔ اور وہ سورت کے لیے باعث فخر ہے۔ ان کے والد کا نام مولانا اسداللہ تھا۔ جنھوں نے سورت میں مستقل اقامت اختیار کر لی تھی۔ وہ جیّد عالم تھے۔ عالمگیر ان کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ ان سے خط و کتابت بھی تھی۔ عزلت ۱۶۹۲ء میں پیدا ہوئے اور ان کا ۱۷۷۵ء میں انتقال ہوا۔ ۳۲

۱۹ ویں صدی میں سورت میں شعر و سخن کے چرچے کا سبب امراء کی دلچسپی اور سرپرستی تھا۔ نواب میر غلام بابا ۱۸۹۳ء میں علم و ادب کے سرپرست تھے خود عالم تھے اور علماء و فضلاء کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ منشی میاں داد خاں سیاح شاگرد غلام بابا خان کے دربار سے منسلک تھے۔ انھیں کے تعلق سے میر غلام بابا غالب کے حلقۂ احباب میں شامل ہوئے تھے۔ غلام بابا خان کے منشی نول کشور سے بھی دوستانہ تعلقات تھے۔ اور منشی نول کشور ۱۸۷۱ء میں سورت آئے تھے۔ اور انھیں کے مہمان تھے۔ غلام بابا کے دربار سے کئی دوسرے شعراء بھی منسلک تھے۔ انھوں نے غزالی کی کیمیائے سعادت کا ترجمہ بھی کرایا تھا۔ ۳۳

اردو کا دوسرا سرپرست خاندان سچین کا نواب خاندان تھا۔ اس خاندان میں کرؔم، محبؔ، اخلاصؔ، غنؔی وغیرہ اچھے شاعر گزرے ہیں۔ محبؔ نے بدرِ منیر کا فارسی میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ ۳۴ ہر ہفتے ان کے یہاں محفل مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ جس میں سورت کے شعراء شرکت کرتے تھے۔ اخلاصؔ کا دربار شعراء سے بھرا رہتا تھا۔ جرأت

کے شاگرد میاں محبوب اس دربار سے ایک مدت تک منسلک رہے۔ میاں سمجھو سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے اور غنیؔ کے میاں داد خان سیاح سے مراسم تھے۔

سورت میں عمدۃ التجار شیخ فاضل کا خاندان علم و ادب کی سرپرستی کے لیے مشہور تھا۔ ان کا کتب خانہ ایک نادر کتب خانہ تھا۔ جس میں ہزاروں کتابیں تھیں اور جس پر ۱۴ لاکھ خرچ کیا گیا تھا۔ اس خاندان کے بعض افراد صاحب تصنیف گزرے ہیں۔ بہادرؔ، حامدؔ، بخششؔ، فاضلؔ جیسے پانچ شاعر ہوئے ہیں۔ پھر عمدۃ التجار ملاّ عبدالغفور کے خاندان میں بھی ملاّ فخرالدین مضطرؔ اور ملاّ قطبؔ ملا خطیبؔ اردو فارسی کے بڑے شاعر گزرے ہیں۔ ان کے دربار سے بھی کئی شعراء منسلک تھے۔ اس خاندان کے ایک فرد ملاّ محمد علی مفتیؔ شہر کے ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ ۳۵

اس طرح ۱۹ ویں صدی میں سینکڑوں شاعروں کے نام ملتے ہیں ان میں سے سمجھوؔ، منظورؔ کا استادوں میں شمار تھا میاں سمجھوؔ مومنؔ سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ منظورؔ میاں سمجھوؔ کے شاگرد تھے اور استاد کی زندگی ہی میں صف اوّل کے شعراء میں جگہ پا چکے تھے۔ میاں سمجھوؔ نے افیون کی تعریف میں ایک مختصر مثنوی لکھی تو منظورؔ نے افیون کی مذمت میں جوابی مثنوی قلمبند کر دی۔ منظورؔ اور سمجھوؔ دونوں غزل گوئی کے لیے شہرت رکھتے تھے۔ منظور کی یادگار مثنویاں (۱) دریا کی موج ۱۸۸۳ء (۲) جگر سوز ۱۸۸۱ء (۳) منظور جہانی ۱۸۴۸ء ہیں۔ ان کے آتشؔ سے تعلقات تھے۔ آتشؔ نے ان کی مثنوی جگر سوز کی تصنیف کی تاریخ کہی ہے۔ ۳۶

مثنوی دریائے موج میں تاپتی ندی کے سیلاب اور اس کی وجہ سے شہر کی بدحالی بیان کی گئی ہے جگرسوز اور ''منظور جہانی'' بزمیہ مثنویاں ہیں جو ''سحرالبیان'' اور ''گلزارِنسیم'' کی بحر میں کہی گئی ہیں۔ غزل گوئی میں شعرائے سورت نے دبستانِ لکھنؤ کے شعراء کی پیروی کی کوشش کی ہے۔ ۳۷

ان شعراء حضرات میں اخلاصؔ، اخگرؔ، آزادؔ، افضلؔ، بہادرؔ، خاموشؔ، سیاحؔ، سمجھوؔ، سرورؔ، شیفتہؔ، شائقؔ، شعلہؔ، شیداؔ، علویؔ، غنیؔ ۱، غنیؔ ۲، فاضلؔ، فرحتؔ، قطبؔ، کاملؔ، منظورؔ،

یکتہؔ، ذکاؔ، رفعتؔ، شوکتؔ، تجردؔ، قطبؔ منشی، منیرؔ، منعمؔ، منادیؔ اور حشمتؔ کا نام زیر فہرست لیا جا سکتا ہے۔

سورت کے شعراء حضرات

علویؔ

سید علوی بن سید محمد بن سید احمد بن سیدنا حسین عید روس علویؔ تخلص کرتے تھے۔ علوی صاحب کے والد نے اپنی حیات ہی میں انھیں پیر طریقت سجادہ نشین بنا دیا تھا۔ موصوف عربی، فارسی میں ابراہیم باعلظہ اور سید عبداللہ قادری کے تلامذہ تھے۔ اور شعر و سخن میں ان کے استاد میاں سمجھو تھے۔ آخری عمر میں علوی صاحب زیادہ تر مشاغل باطنی میں مصروف رہے۔ اور ۱۸۹۷ء میں جمادی الاول کے روز انتقال کیا۔ ان کی پیدائش ۱۸۲۵ء ہے۔ ان کا مزار میرزا سیدنا علی بن عبداللہ عیدروس کے گنبد کے متصل واقع ہے۔ علوی نے کافی کلام یادگار چھوڑا ہے۔ ان کے ایک شاگرد محمد امین الدین عرف سید میاں جن کا تخلص آزاد ہے۔ ۱۸۸۱ء میں اپنے استاد کے نعتیہ کلام کا مجموعہ جو 'غنچۂ ارم' اور غزلیات کا مجموعہ 'حدیقۂ بے نظیر' بمبئی سے شائع کیا تھا۔

صاحب مخزن الشعراء نے علوی کا تخلص ذیرکؔ لکھا ہے جو کسی اور جگہ نظر سے نہیں گذرا۔ 'غنچۂ ارم' کی طباعت پر خطیب عبدالنعم باعلظہ۔ محمد منظورؔ، خاموشؔ، آزادؔ، شیشؔ وغیرہ نے قطعات لکھے ہیں۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ پنجابی زبان میں قلم عبدالوہاب نے گجراتی میں عبدالحی نے اور سید فخرالدین عیدروس صاحب (ریٹائرڈ آسسٹنٹ کلیکٹر) نے انگریزی میں قطعہ کہے ہیں۔ جن کو اردو رسم الخط میں چھاپہ گیا ہے۔ ۳۸؎

نمونۂ کلام

(۱)

عبث دکھاتے ہو ہر بار خال و زلف مجھے
بغیر دانا و دام آپ کا شکار ہوں میں

(۲)

کاٹے شب فراق کو وحشی کہاں تلک
رو رو کر دن گزارے یہ عاصی کہاں تلک

صدقہ کرو بلا کے اس علوی کے روزے پر
بیچارہ دیوے ہجر میں اب جی کہاں تلک

اکتا گیا ہے بند کی راہ و رسوم سے
باتیں سنیں یہ ماہ شما کی کہاں تلک

پہنچا دے اب تو روضۂ احمدؐ پر یا خدا
کرتا پھروں فراق میں زاری کہاں تلک

دل سے خدایا یثرب و بطحہ کی سال سال
کرتا رہوں میں وعدہ خلافی کہاں تلک

جاؤں میں اب تو ہند سے ملک عرب کی سمت
اس عین رب کی دیکھوں جدائی کہاں تلک

خدمت میں مصطفیٰ کی تو پہنچا دے خالق
تڑپے غم فراق سے علوی کہاں تلک

(۳)

مہکے خطا میں عنبریں کاکل تو بے خطر
تاتار سے ہوں آہوئے نافہ ابھی ہرن

منڈوے چڑھی ہے سرورِ لولاک کی جو بیل
پھولی پھلی وہ مہکی ہے خوشبو چمن چمن

ہوں آب آب پانی بھریں بحرِ حسن سے
نیل و فرات نربدا تپتی و گنگ و جمن

تاتار میں جو مہکے ذرا خالِ عنبریں
مشک خطا پہ نقطہ رکھے آہوئے ختن

جو بارِ گلشن وحدت ہو یا علویا
اس شاہِ گل کا وصف کسے کیا تیرا دہن

(۴)

جز وصال جاں نہیں امیدِ وصل جانِ جاں
آپہنچ پیکرِ اجل مرنا ہمیں درکار ہے

جس کی دوری ایک دم بھر قاتل جان تھی ولا
اس کی فرقت سے جدائی حشر تک دشوار ہے

گور مسکن خاک بستر جس کی روحِ جان کا ہو
اس کی جاں لینے میں تجھکو کیا قضا تکرار ہے

روح ساکن ہو زمین میں جسم ہو تشدید خاک
پیش یو زیر و زبر کیوں مدغم دوّار ہے

(۵)

ظاہر کروں کیا مقصد دل اپنا کسی سے
کب کوئی میری بات کو سنتا ہے خوشی سے

کیا خاک چھپے آتشیں حسرت میری جی سے
برباد گئی آبرو چشموں کی تری سے

یا شاہِ رسل اب تو مدینے میں بلا لو
ملتا ہی نہیں دل میرا سورت میں کسی سے

سرمست تیرے جلوۂ دیدار کا ہوں میں
صہبا سے نہ مطلب نہ غرض جامِ جمی سے ۳۹ء

حامؔد

شیخ حامد بن شیخ بہادر ان کا تخلص بہاؔدر تھا۔ ۱۷۷۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کو کمپنی سرکار کی جانب سے ضلع سورت میں امینی (امانت دار) کے عہدے پر ملازمت عطا ہوئی تھی۔ اور اس منصب سے وہ مستعفی ہو گئے اور اپنی جگہ اپنے فرزند رضی الدین احمد عرف بخشو میاں کی حمایت کرکے یہ عہدہ دلوایا۔ علومِ فارسی میں حاؔمد کے استاد سید امان اللہ تھے۔ حدیقۂ احمدی میں مرقوم ہے کہ کبھی کبھی اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ۱۸۳۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ مسجد مرجان شاہی میں ان کے خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ ان کا مدفن بھی ہے۔ ۴۰

نمونۂ کلام

مانگ اس کی تو مان مانگے ہے
دل کو لیکر یہ جان مانگے ہے
ابرو کرتی ہے ہمسری اس کی
روبرو اب کمان مانگے ہے
کج ادائیں یہ دیکھ کر اس کی
خلق سب الامان مانگے ہے

......

کان میں جب سے وہ دلدار نے بالا ڈالا
چرخ پر اشک سے ہر ماہ نے ہالا ڈالا

......

خوباں کے رہگذر سے یہاں لالہ زار ہے
ہر ہر نگاہ شوق سے یہ پھول ہار ہے

......

ذائقہ اس لب شیریں کا جو فرہاد چکھے
یہ تلافی ہے کہ جوں تیشۂ فولاد چکھے ۴۱

ذکاؔ

ذکا کا نام بنو میاں عرف ہڑبنگ اور بنو تخلص کرتے تھے۔ آخری عمر میں ذکا تخلص کرتے تھے۔ غدر کے بعد کا اگر کوئی ان پڑھ شاعر ہو تو وہ ذکاؔ ہے یہ یکتا کے ہم عصر تھے ان کا وطن سورت ہے۔ ذکاؔ کے خاندان کے لوگ اب بھی سورت میں محلّہ بندیل واڑہ میں رہتے ہیں۔ اس کے سوا ذکاؔ سے متعلق اور کوئی معلومات حاصل نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بچپن ہی سے بڑے ذہین اور حاضر جواب تھے۔ ان کی حاضر جوابی نے کافی شہرت پائی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کا بیٹھنا اکثر عالم، فاضل لوگوں میں تھا۔ اہل ذوق کی ہم جلیسی نے ذکاؔ کی ذہانت کو اور اجاگر کر دیا۔ ان کے عرف کی وجۂ تسمیہ یہ ہے کہ ہر کسی کی محبت میں کوئی نہ کوئی فقرہ یا طبع زاد شعر پڑھ دیا کرتے تھے۔ ان کی طبیعت کی اپج کی وجہ سے لوگ انھیں ہڑبنگ کہتے تھے۔

ذکاؔ کے زمانے میں سورت میں کلام بازی کا ایک عام رواج تھا۔ ان مجالس میں ریختہ خوانوں کے گروہ ایک دوسرے کے مقابل بیٹھتے اور ردیف وار نعت، منقبت، ریختہ، مسدس اور آخر میں ہجو پڑھتے۔ اس کے بعد دوسرا گروہ اس سے پست کلام پڑھنے کی کوشش کرتا اور اسی طرح یہ ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کے خیال سے بعض اوقات اساتذہ کو فی البدیح مجلس لکھ کر سنانا ہوتا تھا مجلس کے ختم ہونے تک ہجو تک نوبت پہنچ جاتی۔ آخری مجلس میں درخواست کی جاتی تھی۔ ذکاؔ کی چونکہ طبیعت رواں تھی یہ بھی سورت کے ایک سوز مجلس خواں ملّا ہاشم کے گروہ میں شامل تھے۔ ذکاؔ کا حافظہ اس بلا کا تھا کہ ہزاروں شعر انھیں ازبر تھے اور ایسی مجلسوں میں ذکاؔ بڑے کامیاب مانے جاتے تھے۔ بعض دنگلوں میں ذکا فی البدیح کہہ کر بازی لے جاتے اور اس طرح خوب مشق سخن ہوتی۔

ذکاؔ نے اصناف سخن میں ریختہ، مسدس وغیرہ میں طبع آزمائی کی تھی۔ لیکن ہجو کہنے میں امتیازی طور پر مشہور تھے۔ پہلے تو وہ زردوزی سے اپنا پیٹ پالتے تھے مگر ہجو میں زیادہ مشق ہوگئی تو اسی کو ذریعۂ معاش بنالیا۔ اس زمانے کے امراء اور رؤسا ان کی زورِ طبع سے بہت خائف رہتے تھے۔ اور کچھ نہ کچھ ان کو دے دیا کرتے تھے۔

رؤسا میں خاص رئیسوں کے بڑے ملّا صاحب غلام بابا ذکاؔ کی ہجو کے شکار تھے۔ ان رؤسا کے یہاں سے ذکاؔ کو ہر ماہ تنخواہ ملتی تھی۔ ۴۲؎

ذکاؔ نے ایک تہنیت نامہ لکھا ہے جس میں ۲۵ بند ہیں اس تہنیت نامہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

خود مدح گو ہیں خالق اکبر رسولؐ کا
رتبہ نہ پایا کوئی پیمبرؐ رسولؐ کا
ثانی نہ ہے جواب نہ ہمسر رسولؐ کا
کس درجہ اوج پر ہے مقدر رسولؐ کا

......

لکھیں ہم ان کو قوم نصاریٰ و یہود
مسجد کے مال کو جو سمجھتے ہیں ماں کا دودھ
کھوٹی دلیل لائے یہ جائز بتائیں سود
باتیں یہ سب ہیں شرع محمدی سے لاوجود

......

جو جو کہ فعل بد ہیں وہ کل پیش آئیں گے
یہ لوگ روزِ حشر میں کیا منہ دکھائیں گے

......

رشوت جو لوگ کھاتے ہیں سنیے گا ان کا حال
جاہل تو کیا جو عالم و فاضل ہیں باکمال
فتویٰ فروش ہوگئے فاسد ہے کیا خیال
اتنا نہیں ہے علم یہودوں کی ہے یہ چال

......

نیکی کو چھوڑ دے کے یہاں تک کریں بدی
کیا رہ گئے ہیں مفتیٔ دینِ محمدی ۴۳؎

شائق

میر غیاث الدین خلف سید شرف الدین ۱۸۳۰ء میں سورت کے ایک جید عالم و صوفی مولانا عبدالوہاب بخاری کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا تخلص شائق تھا۔ وہ بڑودہ کے نواب حسام الدین کے نسبتی بھائی تھے۔ شائق بڑے عالم و صوفی تھے اور اردو کے اچھے شعراء میں شمار ہوتا تھا۔ شائق کی علمی ادبی لیاقت اور اردو شعرگوئی کی بہت تعریف تھی صاحب مخزن الشعراء اور صاحب حقیقت السورت نے شائق کی علمی لیاقت کو قبول کیا ہے۔ صوفی اور عالم ہونے کے ناطے وہ ہر سال عید میلاد کے موقع پر 12 واعظ بیان کرتے تھے۔ ان کی یہ مجلس مسجد چوڑ گر جو محلّہ سوداگر واڑہ میں ہوا کرتی تھی۔ موصوف اس مسجد کے متولی بھی تھے۔ اسی میں ان کے بزرگ مدفن ہیں۔ شائق کا انتقال ۱۸۵۹ء میں ہوا۔ شائق نے مبین تخلص بھی اختیار کیا تھا۔ غزل ملاحظہ ہو۔[۴۴]

نمونۂ کلام

ہوئے دفن جو کہ ہیں بے کفن انھیں روتا ابر بہار ہے
کے فرشتے پڑھتے ہیں فاتحہ نہ نشان ہے نہ مزار ہے

نہ تھا شہر خلد سے یہ بھی کم سبھی جا خوشی تھی نہ تھا الم
چلی ایسی بادِ سمومِ غم نہ وہ رنگ ہے نہ دیار ہے

سبھی جائے ماتم سخت ہے کسی جائے گردش بخت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ وہ شان ہے نہ دیار ہے

نہ وہ لوگ ہیں نہ وہ انجمن سبھی اہل بزم میں ہیں نعرہ زن
نہ ہے سیر باغ نہ وہ چمن جہاں گل تھے کثرتِ خار ہے

کہیں وہ غزل ہے کہ اے مبین جسے سن کے روتے ہیں ماہ جبیں
وہ ہیں کون جن کو کہ غم نہیں یہاں سب کا سینہ فگار ہے

چند اشعار

اوڑھنی تارکشی سر پہ پری رو کے دیکھ
تنکے چنتی ہے نگو سر ہو بیچاری چلون

عشق کا دیکھ نتیجہ کہ بنائی اس نے
جسم کی میرے رگیں کھینچ کے ساری چلون

......

نام شائقؔ وہ اگر بھول گیا غم کیا ہے
خلط اصلی میں ہے نسیاں کو بشر سے پیوند

......

غمگساروں میں تیرے ہوں یا کہ اغیاروں میں ہوں
جو میں ہوں سو ہوں غرض تیرے گرفتاروں میں ہوں

......

جلانا مارنا ہے عاشقوں کو اس کے قبضہ میں
صفاتوں میں وہ شکل بت ہے پر کرتا خدائی ہے

......

جل گئی عشق میں لے سر سے قدم تک تو بھی
آفرین شمع کی نکلی نہ زباں سے فریاد ؎۴۵

......

قطبؔ

ملّا قطب الدین حسن بن ابوالفتح بن عمدۃ التجار۔ ملّا فخرالدین مضطر قطبؔ تخلص کرتے تھے۔ ملّا خاندان کے عبد الغفور نے خوب دولت جمع کی تھی۔ جسے قطب نے

ٹھکانے لگا دی۔ روز و شب عیش و عشرت کی محفلیں ہوا کرتیں۔ یہ اس قدر زود خرچ تھے کہ ان کا ایک قصہ مشہور ہے۔ ایک مرتبہ دالان میں اپنے مصاحبوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے روپیوں کی چند تھیلیاں رکھی ہوئی تھی یہ رقم ان کے آخری جہاز کی فروخت سے حاصل ہوئی تھی اسی دوران میں ان کی ایک داشتہ آ گئی۔ ملاّ صاحب نے فرطِ خوشی میں کہا کہ خورشید یہ تھیلیاں بہ یک وقت کوئی اٹھائے تو انھیں بخش دوں۔ خورشید نے تھیلیاں اٹھائیں اور اپنے گھر کا رخ کیا۔ اس طرح وہ اپنی دولت کو بے تحاشہ لٹاتے رہے۔

ملاّ صاحب ذوق تھے۔ اس لیے علماء اور شعراء وغیرہ ہمیشہ ان کی سرکار سے وابستہ رہے۔ ان کا ایک مختصر سا دیوان موجود ہے۔ ان کے ہاتھ کا ایک تعبیر نامہ بھی سید ظہیرالدین کے پاس موجود ہے۔ ملاّ صاحب کا سال ولادت تو معلوم نہیں ہوا ۱۸۶۹ء میں انتقال ہوا۔ ۴۶

نمونۂ کلام

دشت وحشت میں میں ایسا راہ گم کردہ ہوں خضر
اب خدا کے واسطے تو بھی نہ بہکانا مجھے

......

نقش زلفوں کے وہ پُرنور سے رخسار پہ دیکھ
لوگ کہتے ہیں کہ خورشید کو پہلو نکلے

......

یہ ہوا تیری جدائی میں دل زار کا حال
جیسے برسوں میں بنا ہو کسی بیمار کا حال

......

کل مجھ کو عجب ایک بت ہندو نظر آیا
جادو جسے کہتے ہیں وہ جادو نظر آیا
قمری کی نمط ہم نے لیا طوق بگردن
ماتھے پہ تیرے سرخ جو کوکو نظر آیا

......

فرشِ گل کے سوا نہ اس نے قدم رکھا ہے
کئیں رہوے نہ صبا راہ گذر میں تنکا

......

ہے یاد قطبؔ سے جو تمھارا یہ قول تھا
دونوں میں جو پھرے تو بس اس سے خدا پھرے

......

محشر میں ہوگا نامۂ اعمال سب کے ہاتھ
پھر میں رکھونگا تیری ہی تصویر ہاتھ میں
کیا کروں دل ہی ہوا میری بغل کا دشمن
مجھ کو بھی لے کے پھنسا اپنی گرفتاری میں [۴۷]

......

سعیدؔ

حکیم احمد سعیدؔ عرف حکیم بھورے بن مولوی محمود سورت کے ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اچھے طبیبوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ محلّہ ہری پورہ کے رہنے والے تھے ان کا مطب بھی وہیں تھا۔ اپنے حلقۂ احباب میں بہت عزیز تھے۔ ان کے احباب میں زیادہ تر علم دوست حضرات تھے۔ سعیدؔ نے جب بھی کسی کو اپنا دوست بنایا اسے آخری دم تک نبھایا یہ ان کی بڑی خوبی تھی۔ انھوں نے جنگِ آزادی میں بھی نمایاں حصہ لیا تھا اور تحریک ترکِ موالات کے زمانے میں خلافت کی تحریک میں بھی بڑا

کام کیا۔ اس طرح قوم کی خدمت میں انھوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ آخری عمر میں ہر چیز سے دست کش ہوگئے تھے۔ انھوں نے تقریباً ۶۰ سال کی عمر پائی۔ ۱۹۳۹ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا۔

سعیدؔ اوائل عمر سے شعر و شاعری کے بڑے شائق تھے وہ شروع شروع میں آغا شاعر سے مشورۂ سخن کرتے لیکن بعد میں وہ تجمل جلال پوری کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ انھیں تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ ان کا بہت تھوڑا کلام دستیاب ہوا جس میں چند غزلیں چند تاریخیں اور چند قومی نظمیں ہیں۔ ۴۸؎

نمونۂ کلام

صورت ہے رنج کی بھی خوشی کی خبر کے ساتھ
بھیجا ہے اس نے غیر کو بھی نامہ بر کے ساتھ

رہنے دے پند بس نہ پریشان دماغ کر
سودائے زلف یار تو ناصح ہے سر کے ساتھ

خط لکھ کے اس پری کو یہ دیوانگی بڑھی
خود مثل سایہ جاتے ہیں ہم نامہ بر کے ساتھ

احساں سبک سروں کا نہیں لیتے ذی وقار
گلشن میں کون جائے نسیمِ سحر کے ساتھ

......

کریں دریافت وہ تجھ سے ہمارا حال اے قاصد
تو کہہ دینا کہ اچھے ہیں تمھاری یاد کرتے ہیں

مبارک ہو انھیں بزم عدو کی رونق افزائی
سعیدؔ اب گور کی منزل کو ہم آباد کرتے ہیں

اس مہ جمال کے لیے مضطر ہوں رات دن
قسمت میں میری چین یہ آساں نہیں

دل چاہے تو رقیب سے ملیے ہزار بار
میں آپ کی طرف سے ذرا بدگماں نہیں

اس دن سے برق پاش نہیں ہوتا آسماں
جس روز سے چمن میں مرا آشیاں نہیں

زنداں سے عزم بھاگنے کا جب کیا سعیدؔ
پڑ پڑ کے پاؤں کہنے لگی بیڑیاں نہیں ۴۹؎

......

منظورؔ

شیخ محمد منظورؔ کے والد کا نام شیخ عبداللہ یلدرم السریمی الیمنی القریشی تھا۔ وہ اپنا تخلص بھی منظورؔ کرتے تھے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے وہ سورت کے عرب تاجروں کے خاندان میں سے ایک تھے۔ ان تاجروں میں منظور کا خاندان بڑا مشہور تھا۔ ان کا آبائی مکان محلّہ سید واڑہ میں تھا۔ منظور نے خانقاہ عید روسیا میں تعلیم حاصل کی تھی۔ منظور کے اساتذہ میں سورت کے مشہور عالم معلم ابراہیم خطیب جامع مسجد بمبئی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ منظور کا سن ولادت ۱۲۳۷ھ ہجری ہے ۱۳۰۶ھ ہجری میں انتقال ہوا۔ مولوی محمد منعم خطیب جامع مسجد بمبئی نے منظور کی تاریخ وفات کا قطعہ کہا ہے۔ ۵۰؎

منظورؔ کو علم و ادب کے سوا شعر وسخن سے بھی شغف تھا۔ اس عہد کی علمی ادبی محفلوں نے منظور کی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع دیا اور سونے پہ سہاگہ کا کام یہ ہوا کہ منظور کو اساتذہ بھی بڑے اچھے مل گئے یہ اپنے استاد کی زندگی ہی میں استادان فن کی صف میں شمار ہونے لگے۔ منظورؔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ سید عبدالرحمن جوا میاں عیدروس صاحب۔ ’آئین مانوس‘ (تاریخ گجرات) کا بیان ہے کہ منظور نے نظم و نثر میں کل سات تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ انھوں نے ۱۸۶۰ء میں سورت سے منظور الاخبار کے نام سے ایک اخبار جاری کیا تھا۔ یہ کوئی سال چھ مہینے بعد بند ہوگیا ان کے فارسی دیوان کا پتہ نہ چلا۔ اردو غزلوں کا ایک مجموعہ بمبئی سے

شائع ہوا تھا۔ دو بزمیہ مثنویاں ''منظور جہانی'' اور ''جگر سوز'' کے نام سے بمبئی سے شائع ہوئیں۔ ''منظور جہانی'' کا سن تصنیف ۱۲۶۵ھ ہجری اور ''جگر سوز'' کا ۱۲۶۹ھ ہجری ہے۔ ۱۷۲ اشعار کی ایک مختصر مثنوی اپنے استاد سمجھو کی افیونی نامہ کے جواب میں اور مذمتِ افیون ۱۲۶۵ھ ہجری میں لکھی تھی۔ ۵۱؎ منظور کی ایک مثنوی 'دریائے موج' کے نام سے ہے۔ یہ سورت کے بارہ ذلقعد ۱۲۰۰ھ ہجری کے قیامت خیز سیلاب کے بیان میں لکھی گئی ہے۔ منظور نے دیوان ولی بھی مرتب کیا تھا جو بمبئی سے شائع ہوا۔ ۱۲۹۰ھ ہجری میں نثر میں ایک تصنیف گلدستۂ 'نشاط و سرور' بھی لکھی تھی۔ منظور اور ان کے استاد دونوں مکتب لکھنؤ کے کمال سے زیادہ متاثر تھے۔ ان دونوں کی وجہ سے سورت میں شعر وسخن کا چرچا مدتوں قائم رہا۔ ۵۲؎

نمونۂ کلام

رشتہ ہے اس پری کا جو زلف رسا کے ساتھ
جوں دور شمع کشتہ ہیں نالے ہوا کے ساتھ

کھولو قبا کے بند تو جی کھول کر ملیں
دل بستگی ہے آپ کے بندِ قبا کے ساتھ

کرتی ہے قتل سادگی تیری بسان تیغ
پرواز مرغ جاں کو ہے رنگِ حنا کے ساتھ

بیمار ہجر کا تیرے درماں وصال ہے
او سبز رنگ زہر پلا دے دوا کے ساتھ

پاؤ گے اپنی سنگ دلی کی سزائے سخت
آخر تو کام تمکو بتوں ہے خدا کے ساتھ

کس رنگ سے وہ ہاتھ سے اب جانے پائیں گے
باندھوں گا ان کے پاؤں کو درد حنا کے ساتھ

نہ طاقت ہے زور مجھے دم نہ دیجیے

اڑتا پھروں ہوں جنبش لب کی ہوا کے ساتھ

دیکھو ہوائے شوق اجابت میں مثل خاک

پہنچے ہم آسماں تلک اپنی دعا کے ساتھ

......

صدقے مہ و خور تجھ پہ ہیں اے کان ملاحت

ہے شور جہاں میں تیرے حسن نمکین کا

چاندی کے ورق بن گئے منظورؔ یہ دو لب

بوسہ جو لیا رات کو اس ماہ جبیں کا

افراطِ شوقِ وصل نے کارِ عدو کیا

آیا جو خواب میں وہ تو مجھ کو جگا دیا

ہنستا عدو سے دیکھ اسے جوں شمع روئے ہم

اے رشک تجھ کو آگ لگے جی جلا دیا

ہے ضعف گو یہ روز کے وہم نسیم نے

اس گل کا مرے ہاتھ سے دامن چھڑا دیا ۵۳؎

رفعتؔ

یہ محمد قاسم شوکتؔ کے شاگرد رشید تھے رفعتؔ تخلص کرتے تھے۔ سورت کے ہی باشندے تھے۔ یہیں تعلیم پائی۔ مطالعہ کے بڑے شوقین تھے۔ اس لیے بہت وسیع معلومات کے مالک بھی تھے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم تو حاصل نہیں کی تھی۔ مگر ان کے مطالعہ کے شوق نے انھیں بڑا عالم بنا دیا تھا۔ سورت کے ایک ڈاکٹر سید جلال الدین قادری کے دواخانے میں بڑی مدت تک کمپاؤنڈر کی ملازمت کی۔ بعد میں انھوں نے

اپنا ذاتی مطب کھول لیا۔ کچھ سال بعد یہ مطب بند کر دیا۔

رفعتؔ نہایت ہی سنجیدہ مزاج اور خوش اخلاق تھے۔ وہ اپنے بزرگوں کا بڑا احترام کرتے اور ہر ایک سے بہت انکسار اور خلوص سے ملتے تھے ان کا انداز گفتگو نہایت ہی عمدہ تھا۔ انکساری کی حد تو یہ تھی کہ انھوں نے کبھی اپنے پر یا اپنی شاعری پر فخر نہیں کیا۔ حالانکہ وہ ایک کہنہ مشق اور خوش گو شاعر تھے۔

آغا شاہیں جب سورت میں مقیم تھے۔ رفعتؔ نے ان سے اپنی چند غزلوں کی اصلاح لی تھی۔ رفعت کی زبان میں غضب کی سلاست تھی۔ مشاعرے میں چھا جاتے تھے ایک بار برہان پور کے ایک شاعر آغا برہان پوری سورت آئے تھے انھوں نے طرح دی تھی۔ ۵۴؎

؎ سامنے میری نظر کے آپ کی تصویر ہے

اس زمین میں رفعت نے نہایت اچھے شعر کہے ہیں۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ وسیع تھا۔ سید نور نورؔ تخلص کرتے تھے۔ قابل ذکر شاعر تھے۔ رفعتؔ کے شاگرد ہیں ابراہیمؔ رحمتؔ مرحومؔ اور خدامؔ محمد عزیز کا بھی اچھے شعراء میں شمار کیا جاتا ہے۔ ۵۵؎

نمونۂ کلام

ہاں اے نگاہِ یار ستم میں کمی نہو
وہ درد کیا جو دل میں کبھی ہو کبھی نہو

......

پھر زخمِ خون رونے لگے بزم یار میں
پھر فکر پڑ گئی ہے ہماری ہنسی نہو

......

میں گھر سے گیا اور وہ آئے میرے گھر میں
کیا پھیر پڑا ہائے دعا اور اثر میں

......

ہے سوزِ محبت کی چمک حسن شرر میں
اے تیرے جلوے ہیں پتھر کے جگر میں

......

اظہارِ مُدعا سے بھی تحقیر ہوگئی
اچھا معاف کیجیے تقصیر ہوگئی

......

ثابت کیا ہے گل سے سوا ہے تمھارا حسن
بلبل سے آج باغ میں تقریر ہوگئی

......

وہ اور بزم مئے تھی پہلو میں تھے عدو کے
ہم اور دل ہمارا یا گھونٹ تھے لہو کے

......

وہ تیر مجھ پر آیا پھینکا تھا جو عدو پر
دیکھو نظر سنبھالو تم پھر نشانہ چوکے

......

تمھارے غم نصیبوں کو ستم بن کر ہنسی آئی
رلایا مدتوں اس نے اگر دم بھر ہنسی آئی
قبا ٹکڑے ہوئی زر بھی گیا غنچے کی مٹھی سے
تعجب ہے ایسے وقت میں کیوں کر ہنسی آئی

......

بیاں دوزخ کا واعظ کرتے ہیں کچھ اس وضاحت سے
یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آئے ہیں وہاں ہو کر

......

تیرا نقش کفِ پا جب زمیں پر دیکھتا ہوں میں
تو ہر ہر گام پر اک ماہِ انور دیکھتا ہوں میں ۵۶ؔ

سیاحؔ

ان کا مکمل نام منشی میاں داد خاں سیف الحق تھا۔ سیاحؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کا لقب بھی سیف الحق ہی تھا۔ یہ لقب میاں داد خان کو مرزا غالب کی طرف سے ملا تھا۔ کیونکہ تقریباً ہر اردوداں اس بات سے واقف ہے کہ سیاحؔ غالبؔ کے شاگرد تھے۔ وہ ان کے بڑے غمگسار اور قریبی دوست تھے۔ اردوئے معلیٰ میں غالب نے ایک خط میں اس بات کا اظہار بھی کیا ہے۔ 'یہ جو میں نے سیف الحق خطاب دیا ہے اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے تم میرے بھائی ہو تم میرے بازو ہو میرے نطق کی تلوار تمھارے ہاتھ سے چلتی رہے گی۔' ۵۷ؔ سیاح کے والد منشی عبداللہ خان اورنگ آباد کے رؤسا میں سے تھے مرزا محمد عسکری نے ادبی خطوطِ غالب میں لکھا ہے کہ سیاح کی پیدائش کے وقت ان کے یہاں دولت کی فراوانی تھی لیکن جب تک سیاح اپنے شعور کو پہنچے تقریباً سب کچھ ختم ہو چکا تھا سیاح تقریباً ۱۸۴۰ء یا ۱۸۴۵ء میں سورت تشریف لائے اور میر غلام بابا کے مصاحبین میں شامل ہوگئے اور یہیں عمر گذاری۔ ۵۸ؔ

سیاح نہایت ہی حسین و جمیل اور سرخ و سفید تھے ان کا قد دراز جسم سڈول اور چہرہ کتابی تھا۔ ضعیفی میں بھی ان کا چہرہ بہت پرنور تھا۔ ان کے چہرے ہی سے وقار و تمکنت آشکارہ تھی۔ وہ بہت آہستہ اور خوبی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ جب وہ گفتگو کرتے تب ایسا معلوم ہوتا گویا منہ سے پھول جھڑتے ہوں۔ تدبر ان کی عادت ثانی تھا۔ کیونکہ بحث و مباحثہ کے وقت بھی وہ کبھی غصہ نہیں ہوتے وضعداری میں وہ اپنے استاد مرزا غالب کے بالکل مترادف تھے۔ ۵۹ؔ یہ اخلاق ان کی شخصیت کو چار

چاند لگا دیتے تھے ان کا لباس ململ کا پیرہن چھوٹی موری کا پائے جامہ انگرکھا اور اس پر چوغا پہنتے تھے۔ سر پر مختصر سا صافہ بندھا ہوا ہوتا تھا۔ وہ وضع داری کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ کبھی کسی کو خلافِ وضع کپڑوں میں دیکھتے تو فوراً ٹوک دیتے تھے۔ سیاؔح اپنے لباس ہمیشہ دہلی میں سلواتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے مشورہ دیا کہ سورت میں بھی اچھے درزی ہیں یہاں بھی سلوایئے انھوں نے اپنا ایک پیرہن یہاں سلوایا۔ جب سلا ہوا کپڑا دیکھا تو کہنے لگے میاں ہمارا کپڑا بھی خراب ہوا اور کلی کے ٹانکے بھی چھوٹے بڑے کر دیے یکسانیت ہی نہیں ہے۔ وہ کبھی آدھا گھنٹہ کے لیے بھی باہر جاتے تو واپس آکر آدھا گھنٹہ اپنے چوغے کی شکن استری سے نکالنے بیٹھ جاتے۔ ۶۰؎ بہترین سفید کپڑے سلوانے ایک چوغا اور ایک انگرکھا ایک بار پہنتے تو مہینوں اس کو دوبارہ پہننے کا موقع نہ آتا۔ خوشبو کے بڑے شوقین تھے جب محلے سے نکلتے تو عطر کی لپٹیں اڑتی لوگ جان جاتے کے سیاؔح جا رہے ہیں۔ آخری عمر تک وضع قطع میں فرق نہ ہونے دیا۔ اور کبھی خلافِ وضع نہیں رہے۔ ان کی وفات کے بعد مکان سے کم از کم ۲۰ جوڑے چوغے اور بے شمار کپڑے نکلے تھے۔

سیاؔح نے سورت ہی کے ایک معزز خاندان میں شادی کی تھی ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ محلّہ سید واڑہ کی معزز غریب خاندان کی لڑکی کو گود لے لیا تھا۔ اس کی شادی سورت کے ایک باشندے عبدالرشید ایرانی سے کی۔ ۶۱؎

سیاؔح غالبؔ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ اور اس بات کا پتہ اردوئے معلیٰ کے کئی خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ ایک جگہ سیاح خود کہتے ہیں کہ

ہے تلمذ اسداللہ سے ہم کو سیاؔح
شاعروں میں ہو نہ کیوں فخر مداراں اپنا

ایک جگہ اسی بات کو بڑے اچھوتے انداز سے پیش کرتے ہیں

ظلِ کرم ہے حضرت غالبؔ کا بس مجھے
سر پر نہیں ہے سایۂ بال ہما نہ ہو

مرزا غالب جب کبھی سیاؔح کو خط لکھتے تو ان کی محبت و یگانگت صاف طور سے دکھائی دیتی کیونکہ وہ سیاؔح کو بیٹا، برخوردار، نورچشم وغیرہ الفاظ سے مخاطب کرتے۔ سیاؔح کو بھی ان سے کافی انس و محبت تھی۔ وہ غالب کو مالی اور قلمی امداد دیتے رہتے اور شاگردی اور دوستی کا پورا حق ادا کرتے تھے۔ سیاؔح پہلے اپنا تخلص عشاؔق کرتے تھے لیکن ان کو سیر و سیاحت کا بے حد شوق تھا اسی لیے مرزا صاحب نے ان کے تخلص کو بدل کر سیاؔح کروا دیا۔ سیاؔح کی ایک مثنوی 'شہر آشوب' سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے گوشے گوشے کی سیاحت کی ہے انھوں نے آج کل کے سیاحوں کی طرح دو روز میں دلی اور ایک روز میں آگرہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ جہاں جاتے وہاں کافی عرصہ رہتے شہر اور شہر کی خوبیوں اور خرابیوں سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرتے۔ برما اور افریقہ کی بھی سیاحت کی تھی۔ اپنے بنارس کے سفر کے حالات سیاؔح نے غالبؔ کو لکھے تھے۔ جس کا ذکر اردوئے معلیٰ میں ہے۔[۶۳]

جب سیاؔح کے گردش کے دن آئے تو ایک بار کسی وجہ سے انھیں قید کر لیا گیا تھا۔ قید سے چھٹکارہ پانے کے بعد سیاؔح کو مصیبتوں اور آلام کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کا کوئی ذریعہ معاش نہ رہا تھا۔ غلام بابا کی ملازمت بھی جا چکی تھی۔ آخری عمر میں محلّہ رانی تلاؤ میں ایک مکان کرائے پر لے کر رہتے تھے۔ خطوط کے مسوّدوں سے پتہ چلتا ہے کہ انتہائی عسرت سے عاجز آکر اہل سورت اور راندیر کے محمد اعظم بھام سیٹھ سے مالی امداد کے لیے درخواست کی تھی۔ انھوں نے ۱۹۰۷ء میں قریب ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی ان کے پسماندوں میں صرف ان کی اہلیہ تھیں۔[۶۴] سیاح کا مزار خواجہ سید جمال الدین (خواجہ دانہ صاحب) کی خانقاہ میں محلّہ بڑے خاں کے چکلے میں ہے۔

سیاؔح کو نظم و نثر دونوں میں مہارت تھی۔ ان کی نظم کا ایک مجموعہ سورت کے مشہور طبیب حکیم محمد قاسم صاحب کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس مجموعہ کو 'منشی میاں داد خاں سیاؔح اور ان کا کلام' کے نام سے سید ظہیرالدین مدنی نے مرتب کیا ہے۔ جس کو ڈاکٹر زوؔر نے ۱۹۵۷ء میں ادارۂ ادبیات کی[۶۲] طرف سے شائع

کیا۔ ٦٥؎ کہا جاتا ہے کہ سیاح کا ایک اور مجموعۂ کلام تھا جو کسی میر صاحب کی بکری نے چبا لیا۔

سیاؔح نے ایک رسالہ 'لطائف غیبی' کے نام سے بھی لکھا ہے۔ جسے برہان قاطع کے فتنے کے وقت میں غالب کی طرفداری میں لکھا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ رسالہ لطائف غیبی خود غالب کا لکھا ہوا ہے جو سیاح کے نام سے شائع کیا گیا۔ اس کی مفصل بحث منشی میاں داد خاں سیاؔح اور ان کے کلام میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ٦٦؎ ان کا ایک کتابچہ 'کتابچہ سیر سیاح' کے نام سے بھی ملتا ہے۔ اس میں سیاح کی سیر و سیاحت کے مفصل حالات بیان کیے گئے ہیں۔ ان کو سیاحت کا بے حد شوق تھا اور دکن میں حیدرآباد، بنگلور، میسور، مدراس وغیرہ کی جی بھر کر سیر کی۔ ان کے اعزاز میں مشاعرے منعقد کیے گئے۔ اسی طرح سیاح کے لیے دلی، لکھنؤ، کان پور، میرٹھ وغیرہ بھی گھر آنگن کی طرح تھے۔ لکھنؤ میں ان کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ منشی نول کشور، رجب علی بیگ سرور جیسی جیّد شخصیتیں ان کے احباب میں تھیں۔ ان کے لیے ہر جگہ محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ ٦٧؎

نمونۂ کلام

جور و ستم بتوں کے اگر ہیں اسی طرح
کرتا ہے آج کل ہی میں یہ جاں نثار کوچ

......

جو دیکھا قبلہ رو بت خانہ سمجھے ہم یہ کعبہ ہے
نہ بھولے بت پرستی میں بھی ہم یادِ خدا دل سے

......

سردی کے دنوں میں ہے تنِ زار میں گرمی
گرمی سے بھری ہے دلِ بیمار میں گرمی

دیا ہے جس نے غم سیاؔح راحت بھی وہی دیگا
ترقی ہوتی ہے دنیا میں کہتے ہیں تنزل سے

......

سبزۂ نوخیز نے ایسا اٹھایا اپنا سر
آنکھ سے چھپ چھپ گئے ہیں کوہسار اب کی برس

......

اس بیکسی میں میری رفاقت جو تم نے کی
جاں اپنی تم پہ کرتا ہوں رنج و محن نثار

......

مسندِ فقر پہ زاہد نہ کرے کیوں تکیہ
ہم فقیروں کو ہوا فضل خدا پر تکیہ
لطفِ املاک و امارت ہو امیروں کو نصیب
فضلِ خالق سے فقیروں کا ہوا گھر تکیہ

غزل

نہ رکھی راکھ کوئے یار بالائے کفن بھولے
وصیت کرکے مرنا تھا ہمیں اے گورکن بھولے

اگر چشم صنم دیکھے تو خوش چشمی ہرن بھولے
وہ سونگھے زلف بوئے مشک آہوئے ختن بھولے

دیا دل ہم نے بھولے پن میں جانِ من بھولے
ہوئی تقصیر ہم سے کیا کریں وعدہ شکن بھولے

عدم کا کیوں کیا ثابت وجود اہل سخن بھولے
نہ دینی تھی کمر کے ساتھ تیشہ دہن بھولے ۶۸ے

کریں جب قتل مجھ سے سخت جان کو تب کھلیں جوہر
نہ اپنے نیمچے کی کاٹ پر وہ تیغ زن بھولے

بہت غیروں کو اے سیاحؔ ٹیڑھا روز پاتے ہیں
لیا جو آڑے ہاتھوں ہم نے سارا بانکپن بھولے

......

کیا عجب گر ہوگئی رونے سے چشم تر سفید
ابر کالے بعد بارش ہوتے ہیں اکثر سفید

عمرِ خضر اس کو ملی طالع رہے صبح امید
اے خدا اس سیم تن کے ہوئیں موئ سر سفید

خشک تھا یہ ناتوانی سے لہو اس جسم کا
ذبح قاتل کر چکا لیکن رہا خنجر سفید

......

قتل عاشق کا خوں بہا کیا ہے
کُشتۂ عشق کی دوا کیا ہے

ایک زمانہ کشیدہ پھرتا ہے
آج کل وہ مجھ سے کھنچا کیا ہے

ہجر ہوتے ہی موت آ پہنچی
ایک بہانہ ہے یہ قضا کیا ہے

جان جاتی ہے عشق میں سیاحؔ
سہل اس کو سمجھ لیا کیا ہے ۶۹؎

شیداؔ

سید عبدالقادر بن سید عبداللہ قادری سورت کے ایک معزز اور علم دوست خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی سنہ پیدائش ۱۸۴۵ء/ ۱۲۶۴ ہجری ہے۔ یہ سرکارِ

برطانیہ میں ملازمت کرتے تھے اور محکمۂ آبکاری میں انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ شیؔدا کو اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں خوب دسترس حاصل تھی۔ ان کے عربی فارسی کے استاد شیخ محمود باعلظہ تھے۔ شاعری میں علوی کے شاگرد تھے۔ علم یسیرزم کا بہت شوق تھا۔ ڈاکٹر ڈاوز کے یسیرزم سے متعلق رسالوں کا شیؔدا نے اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ انھوں نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ جس کا نام ترانۂ خیال ہے شائع کیا تھا۔ حقیقت الصورت میں ان کے لکھے ہوئے۔ تاریخی قطعات ملتے ہیں۔ اس کے سوا ان کی کوئی تصنیف نظر نہیں آتی۔ ۷۰

نمونۂ کلام

ہاتھ اس کا چوم لیتا ہے ہر اک اہل سخن
یہ بھی ہے اعجاز والا آشکارِ عیدروس

......

خانقاہ چشم تمنا ہے یہ عینِ عجز سے
جو میرا استاد ہے زینت......؟

......

بھول کر شاخ تمنا سے پہلے اس کا شجر
غنچۂ مقصد ہو گل گل گلفشارِ عیدروس

......

مسلک گوہر ہوں شیدا تیرے اشعار آج کل
ہے مسلسل نعتِ در شہوار عیدروس ۷۱

شیفتہؔ

شیخ احمد نام تھا اور شیفتہؔ تخلص کرتے تھے۔ شیفتہ کے والد شیخ عبدالہادی ملک عرب کے علاقہ تریم سے سورت آئے تھے۔ تجارت ان کا پیشہ تھا۔ سات جہازوں کے مالک تھے۔ شیفتہؔ کی تعلیم قدیم طریقے سے ہوئی تھی۔ یہ تھے تو امیر گھرانے سے لیکن

جب تک وہ سن شعور کو پہنچے ان کے خاندان کا زمانۂ عروج ختم ہوچکا تھا۔ اسی لیے شیفتہؔ نے مقلمی کا سہارا لیا اور اسی کو اپنا ذریعۂ معاش بنا لیا تھا۔ شیفتہ خطِ نستعلیق لکھنے میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ انتہائی خوش نویش تھے۔ خوش نویسی ان کے خاندان کا طرۂ امتیاز ہے یہ علوی کے شاگرد تھے۔ شیفتہ کا سال ولادت ۱۸۳۶ء / ۱۲۵۲ ہجری ہے۔ انھوں نے ۱۸۶۷ء میں وفات پائی۔ موسوم کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ ان کے وارث ابھی بھی سیدواڑہ میں اپنے آبائی مکان میں رہتے ہیں۔ ۲۷

نمونۂ کلام

دن بھر فراقِ یار میں گنتا ہوں ساعتیں
اختر شماری ہے مہ کامل تمام رات
افشاں جما کے بیٹھا جو مہتابی پر وہ شوخ
آیا نہ ماہتاب ان کے مقابل تمام رات

......

رخ سے نقاب اپنے ہاں مہ جبیں الٹ
ڈر ہے کہیں نہ جائیں مکان و مکیں الٹ
دل ٹکڑے سینہ چاک گریباں ہو تار تار
قاتل نہ ایسے حال پہ تو آستیں الٹ

......

رہتا ہے شب و روز تصور میں وہ گل رو
میں اس سے جدا ایک گھڑی بھر نہیں ہوتا

......

محفل اغیار میں اڑتے ہیں گل چھرّے وہاں
خون برساتی ہیں یاں آنکھیں جگر سے دیکھنا

......

مو بہ مو ہوئے تن افعی ڈسے ہیں مار مار
زلف کے سودے کا کالا لال دم کرنے لگا

......

لب، چشم، ابرو، ناز و ادا، خوب یہ مژگاں
قاتل بجان کشتہ ہوں ان تین چار کا
روٹھو نہ شیفتہ سے دمِ نزع جانِ جاں
دم میں یہ دم ہے آپ کے بس انتظار کا

......

جوانی میں کرو گے کیا قیامت ناز و جوبن پر
ابھی اک حشر برپا ہے جو اندازِ لڑکپن پر
تمنا آرزو و ارماں فقط رونے نہیں ہمدم
ہزاروں حسرتیں سر پیٹتی ہیں میرے مدفن پر
اٹھا دو ماہتابی پر رخ انور سے مت برقعہ
گماں خورشید کا ہوتا ہے شب کو روئے روشن پر ۴۷

شوکتؔ

میر معین الدین شوکتؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد کا نام میر افضل الدین تھا۔ یہ سورت کے بخشی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ خدا نے انھیں جاہ و ثروت کے ساتھ علم و ادب کی دولت سے بھی نوازا تھا۔ انھوں نے اپنی ساری عمر امراء اور رؤسا کی صحبت میں گزاری کیونکہ یہ فکر معاش سے بری تھے۔ انھیں شعر و سخن سے بڑا لگاؤ تھا۔ ان کے مجموعہ کلام کا نام 'چمنستان شوکت' ہے۔ انھیں اوائل عمر سے ہی شعر و سخن کا شوق تھا۔ اور ان کی خوش قسمتی یہ تھی کہ آئے دن بزرگانِ باکمال کی صحبت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا۔ ابتداء میں انھوں نے محض غزل گوئی پر اکتفا کی تھی۔ ۴۵ لیکن ۴۳ جب ان کے استاد آغا شاعر صاحب کوکیاش دہلوی سے شرف تلمذ حاصل ہوا تو انھوں نے ان کی

ایما پر دوسرے اصنافِ سخن کی طرف بھی طبع آزمائی شروع کی۔ شوکتؔ کو شعر وسخن کا شوق ضرور تھا۔ لیکن امراء کی محبت نے انھیں ناکارہ بنا دیا تھا۔ اسی لیے کبھی کسی کی شان میں قصیدہ کہہ دیتے تو کبھی کسی کی تاریخ وفات حاصل یہ تھا کہ کبھی کسی امیر کے ساتھ شکار کو چلے گئے تو تمام واقعہ منظوم لکھ دیا۔ چمنستانِ شوکت میں ایک جگہ خود فرماتے ہیں کہ آغا شاعر نے اکثر مقام بتاتے جن کی طرف انھوں نے کبھی توجہ نہیں کی تھی۔ لہٰذا ابتدا کا خام کلام ضائع کر دیا اور ازسرِنو مشق شروع کی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ آغا شاعر نے فرمایا غزل گوئی سے واقعہ نویسی بہتر ہے اور بجائے دور از خیالات کے پیش پا افتادہ مضامین سلیس محاوروں میں فصاحت سے ادا کیے جائیں اسی وجہ سے غزل گوئی شاید ترک کر دی تھی۔ ان کا ایک مجموعہ سید حامدالدین سورتی جمعدار کے زیر اہتمام شائع ہوا جس میں ۲۴ غزلیں، قصیدے، نظمیں ولادت وفات کی تاریخیں موجود ہیں۔ ۶۷

نمونۂ کلام

گھونگھٹ تو الٹ بیٹھے پردہ تو اٹھا بیٹھے
اب شرم سے کیا مطلب جب چار میں آ بیٹھے

محفل میں رقیبوں کی جانے کو تو جا بیٹھے
ہم سب سے الگ بیٹھے وہ سب سے جدا بیٹھے

آئے نہ عیادت کو مہندی کے بہانے سے
آنا ہی نہ تھا ان کو ایک بات بنا بیٹھے

خالق کی عبادت سے محروم رکھا تم نے
جب ہم نے کیا سجدہ تم سامنے آ بیٹھے

آتے ہی چلے اٹھ کر کہتے ہو خدا حافظ
کیا خوب یہ آنا تھا کیوں آئے تھے کیا بیٹھے

عاشق وہ نہیں ہرگز شوکتؔ جو یہ کہتے ہیں
ظالم ترے ملنے سے ہم ہاتھ اٹھا بیٹھے

غزل

کبھی میری بھی ہستی تھی کہیں میں بھی مقرر تھا
مگر اب کہہ نہیں سکتا کہاں تھا اور کیونکر تھا

چلے آنا تھا بے کھٹکے بھلا کس بات کا ڈر تھا
یہاں آنے میں حارج کون تھا یہ آپ کا گھر تھا

ہمارا قتل بھی منظور تھا تم کو تو کیا ڈر تھا
مناسب تھا مبارک تھا بہت موزوں تھا بہتر تھا

نہ ہوتا فاش پردیدۂ تر کا تو بہتر تھا
مگر کیا کیجیے پہلو میں دشمن قلب مضطر تھا

وہ کیا اچھی گھڑی کیا نیک ساعت تھی کہ مقتل میں
تمھارے ہاتھ میں خنجر تمھارے پاؤں پر سر تھا

نشانہ کیا اڑا سکتا وہ اُن ترچھی نگاہوں سے
مگر تقدیر سیدھی تھی ہمارا دل ہی زد پر تھا

رسا تھا ذہن اپنا اس قدر پہلے کہ اے شوکت
جو دیکھا جو پڑھا جو سن لیا فوراً وہ ازبر تھا [77]

اس طرح ہم نے دیکھا کہ سورت اور سچین کے رؤسا اور شعراء حضرات نے اردو ادب کی کافی خدمت کی اور اس کے ارتقا میں ایک اہم رول ادا کیا۔ ان میں سے کئی شعرا حضرات ایسے گذرے ہیں کہ جنھیں ہم دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کے شعراء کی صف میں لا سکتے ہیں۔ ان میں سے کئی کے تعلقات ان دبستانوں کے شعراء سے تھے۔ ان میں سے کئی سورت کے شعراء حضرات کے دوست بھی تھے اور استاد بھی ہم یہ جان چکے ہیں کہ ان میں کئی حضرات کی دہلی اور لکھنؤ میں آمد و رفت لگی رہتی تھی۔ یہ لوگ نہ صرف ان کے ادب سے متاثر تھے بلکہ ان کی تہذیب سے بھی وابستگی رکھتے تھے۔ کئی شعرا کے کلام پر ان دبستانوں کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ

سورت دہلی اور لکھنؤ سے کافی دور دراز علاقہ میں واقع ہے۔ اور اس زمانے میں آمد و رفت کے اتنے آسان ذرائع بھی فراہم نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود سورت کے شعراء حضرات ان سے اپنی دوستی کا رشتہ نبھائے رکھتے تھے۔ جس کا اثر ان کے کلام پر صاف طور سے دکھائی دیتا ہے۔

☆

حواشی

۱۔ تاریخ ادب صفحہ ۸۷، جمیل جالبی، اجیوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۷ء

۲۔ ایضاً صفحہ ۲۰

۳۔ ولی گجراتی صفحہ ۱۱، قاضی احمد جوناگڑھی، مرتب پروفیسر محی الدین بمبئی والا، گجرات ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر ۲۰۰۴ء

۴۔ مخزن الشعراء (صفحہ ۶) عبدالحق

૫. ગુજરાતની અસ્મીતા, પેજ-૬, રજની વ્યાસ, અક્ષરા પ્રકાશન

گجرات نی اَسمِتَا صفحہ ۶، رجنی ویاس، اکشرا پرکاشن

۶۔ مضامین مدنی صفحہ ۹، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، گجرات اردو اکادمی گاندھی نگر ۱۹۹۰ء

۷۔ تاریخ ادب اردو صفحہ ۲۲۵، جمیل جالبی، اجیوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۷ء

૮. ગુજરાતની અસ્મીતા, પેજ-૭, રજની વ્યાસ, અક્ષરા પ્રકાશન

گجرات نی اَسمِتَا صفحہ ۷، رجنی ویاس، اکشرا پرکاشن

۹۔ مضامین مدنی صفحہ ۱۰، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، گجرات اردو اکادمی گاندھی نگر ۱۹۹۰ء

۱۰۔ حقیقت السورت صفحہ ۵۹، پروفیسر محبوب حسین عباسی، اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر ۲۰۰۵ء

૧૧. ગુજરાતની અસ્મીતા, પેજ-૭-૮, રજની વ્યાસ, અક્ષરા પ્રકાશન

گجرات نی اَسمِتَا صفحہ ۷،۸، رجنی ویاس، اکشرا پرکاشن

۱۲۔ مضامین مدنی صفحہ ۱۰، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، گجرات اردو اکادمی گاندھی نگر ۱۹۹۰ء

۱۳۔ ایضاً صفحہ ۱۱، ۱۲

۱۴۔ حقیقت السورت صفحہ ۴۶، پروفیسر محبوب حسین عباسی، اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر ۲۰۰۵ء

૧૫. ગુજરાતની અસ્મીતા, પેજ-૯, રજની વ્યાસ, અક્ષરા પ્રકાશન

گجرات نی اَسمِتَا صفحہ ۹، رجنی ویاس، اکشرا پرکاشن

۱۶۔ حقیقت السورت صفحہ ۶۰، پروفیسر محبوب حسین عباسی، اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر ۲۰۰۵ء

۱۷۔ مضامین مدنی صفحہ ۱۲، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، گجرات اردو اکادمی گاندھی نگر ۱۹۹۰ء

۱۸۔ سخنوران گجرات صفحہ ۲۸۹، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو ۱۹۸۱ء

۱۹۔ ایضاً صفحہ ۲۸۱

۲۰۔ ગુજરાતની અસ્મીતા, પેજ-૮, રજની વ્યાસ, અક્ષરા પ્રકાશન

۲۱۔ مضامین مدنی صفحہ ۱۳، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، گجرات اردو اکادمی گاندھی نگر ۱۹۹۰ء

۲۲۔ سخنوران گجرات صفحہ ۲۸۰، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو ۱۹۸۱ء

۲۳۔ مضامین مدنی صفحہ ۱۴، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، گجرات اردو اکادمی گاندھی نگر ۱۹۹۰ء

۲۴۔ حقیقت السورت صفحہ ۹۱، پروفیسر محبوب حسین عباسی، اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر ۲۰۰۵ء

۲۵۔ مضامین مدنی صفحہ ۱۵، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، گجرات اردو اکادمی گاندھی نگر ۱۹۹۰ء

۲۶۔ ایضاً صفحہ ۱۶

۲۷۔ ایضاً صفحہ ۱۷

۲۸۔ سخنوران گجرات صفحہ ۱۶۱، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو ۱۹۸۱ء

۲۹۔ حقیقت السورت صفحہ ۴۰، پروفیسر محبوب حسین عباسی، اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر ۲۰۰۵ء

۳۰۔ ایضاً صفحہ ۴۹

۳۱۔ سخنوران گجرات صفحہ ۲۸۳، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو ۱۹۸۱ء

۳۲۔ گجرات میں علمی و ادبی سرگرمیاں صفحہ ۸۸ جرنل پیر محمد شاہ درگاہ ٹرسٹ ۲۰۰۱ء

۳۳۔ سخنوران گجرات صفحہ ۲۸۱، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو ۱۹۸۱ء

۳۴۔ مضامین مدنی صفحہ ۱۹، ۲۰، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، گجرات اردو اکادمی گاندھی نگر ۱۹۹۰ء

۳۵۔ سخنوران گجرات صفحہ ۲۸۵، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو ۱۹۸۱ء

۳۶۔ گجرات میں علمی و ادبی سرگرمیاں جرنل صفحہ ۸۹، پیر محمد شاہ درگاہ ٹرسٹ ۲۰۰۱ء

۳۷۔ گجری مثنویاں صفحہ ۲۹

۳۸۔ سخنوران گجرات صفحہ ۱۶۷، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو ۱۹۸۱ء

۳۹۔ ایضاً ۱۹۴، ۱۹۵

۴۰۔ ایضاً صفحہ ۱۲۸

۴۱؎ ایضاً صفحہ ۱۴۲

۴۲؎ سخنوران گجرات صفحہ ۱۷۱

۴۳؎ سخنوران گجرات صفحہ ۲۰۲، ۲۰۳

۴۴؎ آئینۂ تاریخ، سخنوران گجرات صفحہ ۱۶۵، ۱۶۶

۴۵؎ مخزن اور آئینہ تاریخ

۴۶؎ ملّا عبدالغفور کا خاندان، سخنوران گجرات صفحہ ۱۹۱

۴۷؎ سخنوران گجرات صفحہ ۱۹۸

۴۸؎ ایضاً صفحہ ۱۷۳

۴۹؎ ایضاً صفحہ ۲۰۵

۵۰؎ گجری مثنویاں صفحہ ۷۳، ۷۴

۵۱؎ سخنوران گجرات صفحہ ۱۶۹

۵۲؎ شعرائے گجرات اے۔ ایم۔ شعلہ صفحہ ۹۲، امت پرکاشن ۱۹۸۳ء

۵۳؎ سخنوران گجرات صفحہ ۲۰۰

۵۴؎ ر۔ ک۔ ضمیمہ بخشی خاندان

۵۵؎ سخنوران گجرات صفحہ ۱۷۲، ۱۷۳

۵۶؎ ایضاً صفحہ ۲۰۴

۵۷؎ مضامین مدنی صفحہ ۲۹، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، گجرات اردو اکادمی گاندھی نگر ۱۹۹۰ء

۵۸؎ سخنوران گجرات صفحہ ۲۰۴ سید ظہیرالدین مدنی

۵۹؎ ادبی خطوط غالب صفحہ ۲۸۱

۶۰؎ سخنوران گجرات صفحہ ۲۰۴ سید ظہیرالدین مدنی

۶۱؎ اردوئے معلی صفحہ ۶۸، رام نرائن لعل

۶۲؎ ایضاً صفحہ ۳، ۴،

۶۳؎ سخنوران گجرات صفحہ ۱۶۳، سید ظہیرالدین مدنی

۶۴۔ ر۔ک۔ ضمیمہ شیخ فاضل عمدۃ التجار کا خاندان

۶۵۔ خادرانِ غالب صفحہ ۴۰، عسکری

۶۶۔ مفتی میاں داد سیاح اور کلام صفحہ ۳۵، سید ظہیرالدین مدنی

۶۷۔ مجموعہ سیر سیاح صفحہ ۴۳، منشی نول کشور

۶۸۔ منشی میاں داد خان سیاح اور ان کا کلام، سید ظہیرالدین مدنی ادارۂ ادبیات ۱۹۵۷ء

۶۹۔ سخنورانِ گجرات صفحہ ۱۸۶، سید ظہیرالدین مدنی

۷۰۔ ایضاً صفحہ ۱۶۶

۷۱۔ ایضاً صفحہ ۱۹۴

۷۲۔ شعرائے گجرات صفحہ ۹۵، ای۔ ایم۔ شعلہ، امت پرکاشن ۱۹۸۳ء

۷۳۔ سخنورانِ گجرات صفحہ ۱۶۵، سید ظہیرالدین مدنی

۷۴۔ ایضاً صفحہ ۱۹۰

۷۵۔ ضمیمہ بخشی خاندان، سخنورانِ گجرات صفحہ ۱۹۰

۷۶۔ کلام شوکت

۷۷۔ سخنورانِ گجرات صفحہ ۲۰۸

Gazetteers of Gujarat

Surat District.

1st Addition - 1877

- Printed in India by the manager. Govt. Printing and Stationery, Rajkot.

- Published by the Director, Govt.

- Printing, Stationery and Publications. Gujarat state Ahmedabad.

باب چہارم

انیسویں صدی میں اردو ادب کے فروغ میں احمد آباد، بڑودہ، بھروچ، کے شعراء و ادباء کی خدمات اور رؤسا اور امراء کی ادبی سرپرستی

باب چھارم

انیسویں صدی میں اردو ادب کے فروغ میں احمدآباد، بڑودہ، بھروچ، کے شعراء و ادباء کی خدمات اور رؤسا اور امراء کی ادبی سرپرستی

احمدآباد

احمدآباد کے رؤسا اور شعراء سے متعلق لکھنے سے پہلے احمدآباد کی مختصر تاریخ کا ذکر کرنا مناسب ہوگا کیونکہ احمدآباد شہر ہندوستان میں اپنی منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا تاریخی شہر ہے جس نے زمانۂ قدیم سے لے کر آزادی ہند تک تاریخ میں اپنا مقام بنائے رکھا۔ دورِ قدیم میں جب یہ آشاول کے نام سے مشہور تھا تب سے لے کر سابرمتی کے سنت (گاندھی جی) کے زمانے تک اس کا اپنا اہم رول رہا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہی احمدآباد ہے جس نے ہندوستان کے پیروں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کو کانٹے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ جی ہاں میرا اشارہ بابائے قوم گاندھی جی کی طرف ہے جنھوں نے یہاں آشرم کی بنیاد ڈالی تھی۔ اور آزادی کی تحریک کو تیز سے تیزتر کر دیا۔ اور آخرکار ایک دن انگریزوں کی غلامی کی زنجیروں کو کاٹ کر پھینک دینے میں اپنا کمال دکھایا تو ایسے مبارک شہر کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے ہم آگے بڑھتے ہیں۔[1]

جب مظفر شاہ کے پوتے سلطان احمد نے اپنے چچازاد بھائی مودود بن فیروزخان سے جنگ کرکے گجرات کو فتح کر لیا اور ۸۱۳ھ قصبۂ اشاول میں وارد ہوا تو

احمدآباد

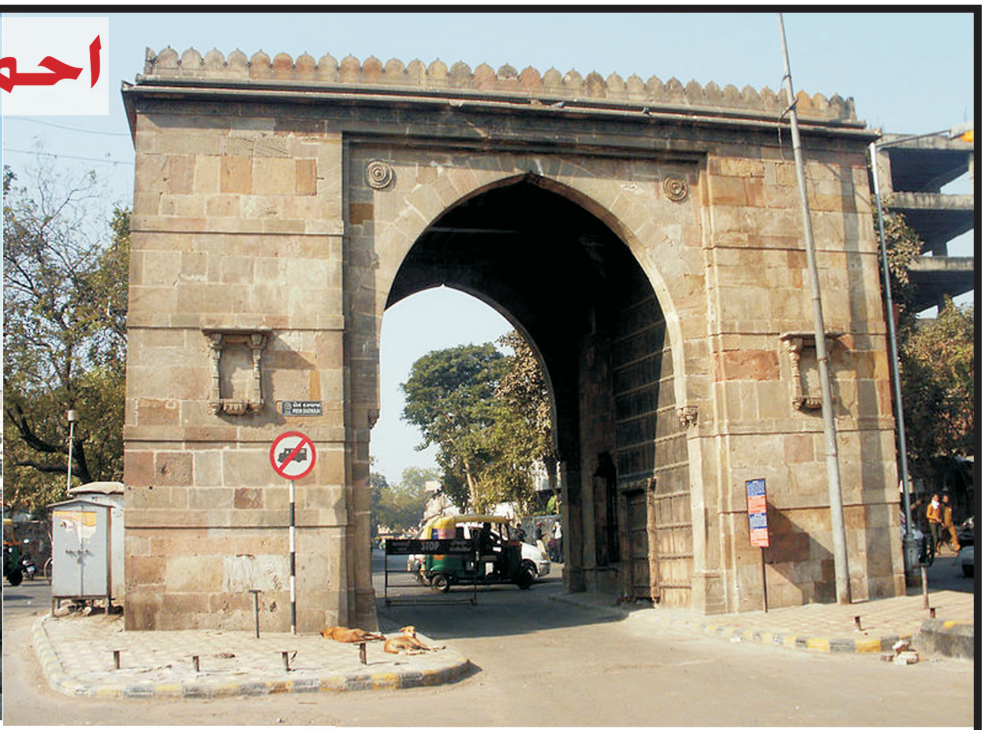

پریم دروازہ

دریا پور دروازہ

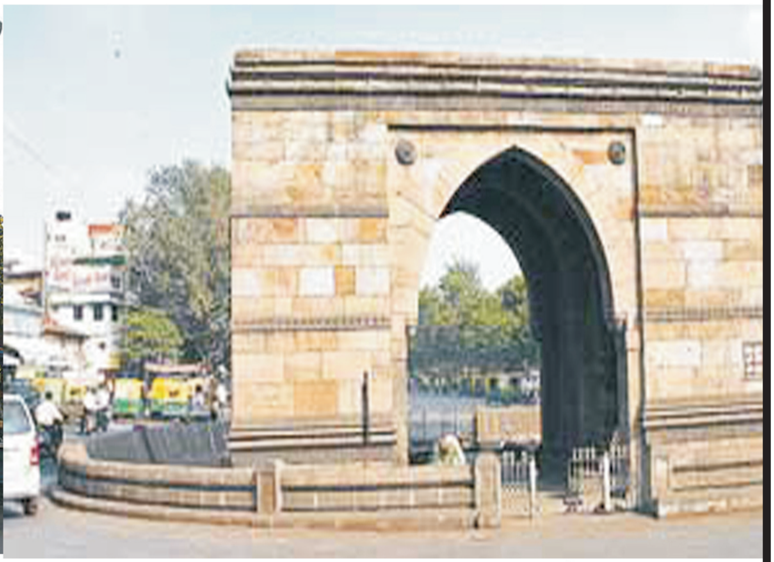

آسٹوڈیا دروازہ

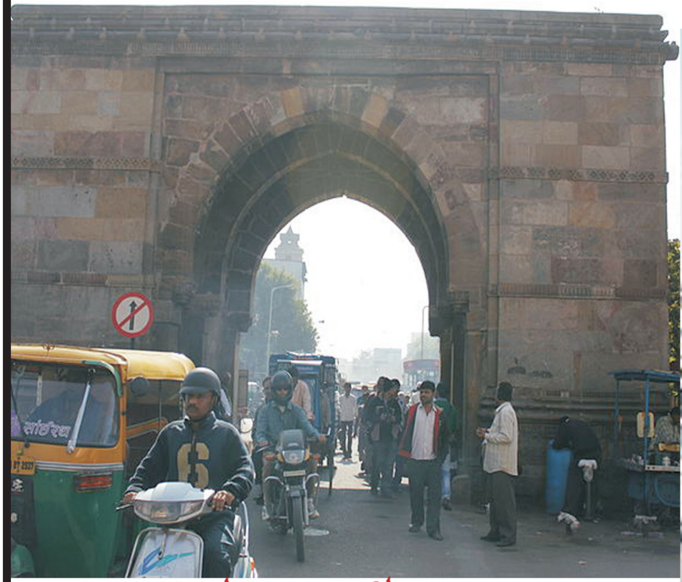

رائے پور دروازہ

جمال پور دروازہ

دھلی دروازہ

احمدآباد

خان پور دروازہ

خان جہان دروازہ

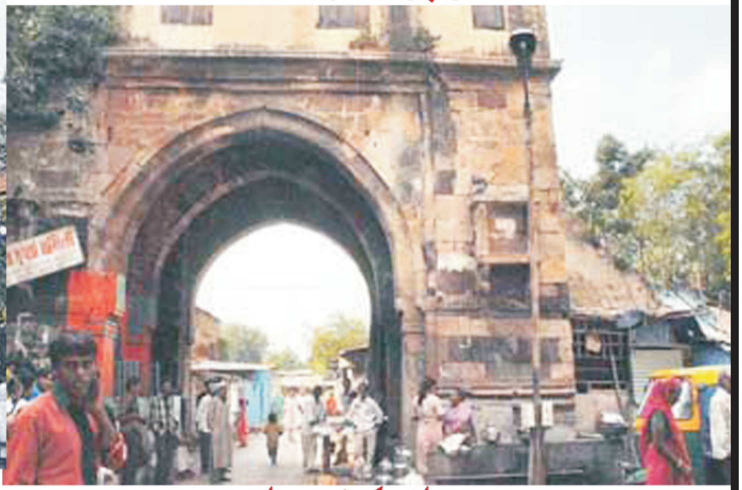

رائے کھڑ دروازہ

پانچ کنواں دروازہ

تین دروازہ

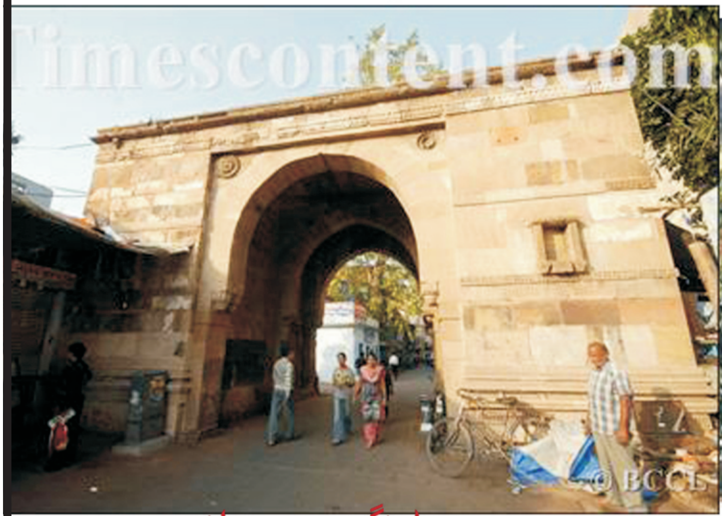

سارنگ پور دروازہ

دریا خان گنبد

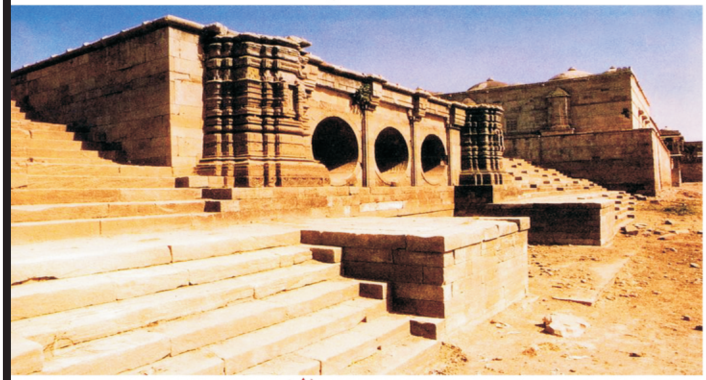

سرخیز تالاب

احمدآباد

بادشاہ کا ھجیرا

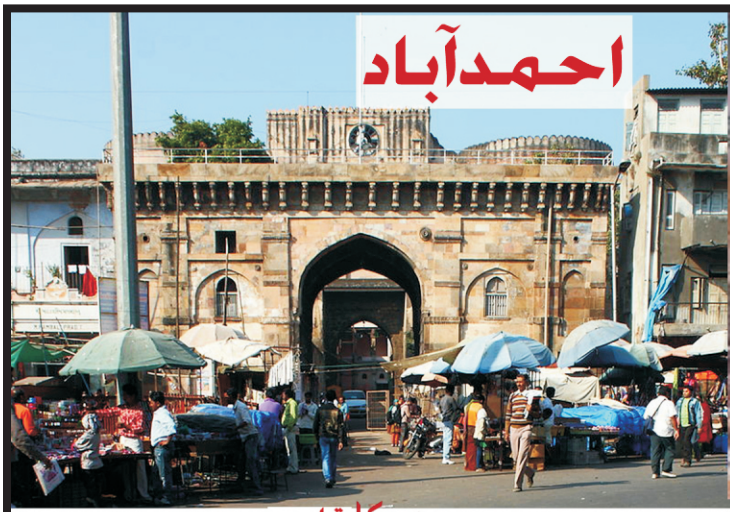

بھدر کا قلعہ

رانی روپمتی کی مسجد

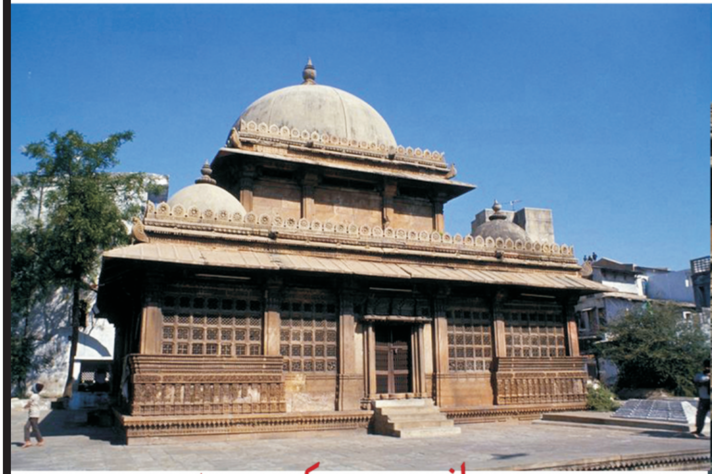

رانی سِپری کی مسجد

سیدی بشیر مسجد جھولتا مینار

رانی کا ھجیرہ

سیدی سید کی جالی

اس نے سب سے پہلے یہیں اپنی رسم تخت نشینی ادا کی۔ آسا بھیل اس قصبہ کا مالک تھا وہ بڑا بہادر اور سرکش شمار کیا جاتا تھا۔ سلطان احمد نے اسے بھی شست دے کر آشاول کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ یہی آشاول آگے چل کر آشاولی کے نام سے مشہور ہوا اور آج بھی یہاں کی عوام اسے آشاول کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ؎۲ سلطان چند روز یہاں ٹھہرا۔ جنگ و جدل کے بعد اسے یہاں کچھ سکون ہوا وہ بے فکر ہوکر دریائے سابرمتی کے کنارے سیر و شکار میں مصروف رہا۔ یہاں کا پرسکون علاقہ اور دریائے سابر نے اسے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ انجام کار سلطان نے ایک روز سیر دریا کے وقت یہیں پر ایک شہر آباد کرنے کا خیال اپنے رفقاء اور مصاحبوں کے سامنے ظاہر کیا۔ بادشاہ کی طبیعت کا میلان ہمیشہ سے بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کی طرف مائل تھا۔ وہ ان لوگوں کا حددرجہ معتقد تھا۔ اس زمانے میں حضرت سراج المحققین شیخ احمد کھٹو جو گنج بخش کے نام سے معروف تھے جو سرخیز میں تشریف رکھتے تھے۔ بادشاہ نے خیال کیا کے اگر حضرت موصوف میرے ارادے میں معاون ہوں تو میری مشکلیں آسان ہو جائیں۔ ؎۳ سلطان احمد صدق دل سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اس مقام پر ایک خوبصورت شہر بسانے کے خواب کی تعبیر کے لیے حضرت سے دعا کرنے کی استدعا کی۔ اور ساتھ ہی اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی اجازت چاہی۔ حضرت گنج بخش کی زبان مبارک سے فوراً یہ کلمہ ارشاد ہوا 'بارک اللہ فی ارادتی کا' ؎۴ یہ سن کر بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اور دریائے سابرمتی کے قصبہ اشاول میں ایک میدان نہایت مسطح نہایت پرفضا پسند کر کے نجومیوں کو زائچہ تیار کرنے کا حکم فرمایا۔ رمّالوں اور نجومیوں نے زائچہ تیار کرکے تاریخ متعین کی۔ قمری مہینہ ذی القعدہ کی تیسری تاریخ بروز پنج شنبہ مطابق وکرما جیتی بیساکھ سدھی پنچمی ۱۲۴۹ اور انگریزی ۱۴۱۴ کے ۱۵ تاریخ سورج طلوع ہونے پر اس کی بنیاد رکھی گئی۔ ؎۵

مشائخ گجرات

احمدآباد کی تاسیس سے متعلق ایک بات یہ بھی مشہور ہے کہ اس کی بنیاد چار احمد

نامی بزرگوں کے دست مبارک سے ڈالی گئی تھی۔ جن کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) حضرت شیخ احمد کھٹو المعروف بہ گنج بخش قدس سرہ

(۲) بادشاہ سلطان احمد خود والیٔ ملک

(۳) ملک احمد جن کا مزار کالوپور میں موجود ہے۔

(۴) قاضی احمد صاحب جنید یہ حضرت گنج کے خلیفہ تھے اور پیران پٹن میں آپ کا مزار مبارک موجود ہے۔ آپ کے مزار پر یہ عبارت کندہ ہے کہ جن چار احمد نامی بزرگوں نے بنیاد احمدآباد قائم کی تھی ان میں آپ بھی ایک تھے۔ [۶]

فصیل احمدآباد (قلعہ)

فصیل احمدآباد ۸۱۳ھ میں شروع ہوکر تین سال کے عرصے میں مکمل ہو گیا تمام فصیل کی عمارت پکی اینٹ اور چونے کی نہایت مضبوط بنی ہوئی تھی۔ احمدآباد کی مقامی زبان میں دیوار حصار کو کوٹ کہا جاتا ہے۔ زمانہ حال میں شہر وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ آبادی بڑھتی گئی اور (ٹرافیک) آمد و رفت کی بڑھ جانے کی وجہ سے آج وہ فصیل قائم نہیں رہی۔ چند دروازے ہیں جو آج بھی شہر کی جاہ و جلالی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ قلعہ کا جس قدر حصہ دریائے سابر کے دامن سے لگ کر تھا وہاں بنیاد سے کمر تک سنگِ خارا کا بنا ہوا ہے۔ اس قلعہ کے کل بارہ دروازے اور ۱۳۹ بروج اور نو گوشے تھے۔ قلعہ کی عمارت میں اِس سرے سے اُس سرے تک فصیل قلعہ پر ۶۷۶۳ کنگرے بنے ہوئے تھے۔ قلعہ کی ساخت تقریباً ۴ مائل کی تھی۔ قلعہ ارک جس کو بھدر بھی کہتے ہیں۔ انھیں ایام میں مع ایک پتھر کی مسجد کے تیار ہوا تھا۔ قلعہ کی دیوار کی بلندی سات آٹھ گز سے زیادہ نہیں تھی مگر شاہ جہاں کے زمانے میں قلعہ ارک (بھدر) میں کھڑکی سے ملحقہ دیوار صیف خان نے از سرنو تعمیر کروائی تھی جو تخمیناً پندرہ گز اونچی ہوگئی۔ کیونکہ اس دیوار کے باہر سے دریائے سابرمتی بہتا تھا۔ شاید قلعہ کی حفاظت کے خیال سے یہ دیوار اس قدر بلند بنائی گئی ہوگی۔ [۷]

شہر کے دروازوں کے نام

مشرقی (۱) کالوپور

(۲) سارنگ پور

(۳) آسٹوڈیہ

مغربی (۴) خان پور

(۵) رائے خیر

(٦) خان جہان

(۷) دریاپور

(۸) دہلی دروازہ

(۹) شاہ پور دروازہ

جنوبی (۱۰) جمال پور

(۱۱) بند دروازہ

(۱۲) رائے پور [۸]

چونکہ شہر احمدآباد ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت بنایا گیا تھا۔ اس کی بنیاد اور بناوٹ کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ سلطان خود بزرگانِ دین کا معتقد اور مداح تھا۔ اسی لیے جس طرح شہر کے بارہ دروازے مشہور ہیں اسی طرح اس زمانے میں بارہ باوا بھی اپنی شہرت کے مالک تھے۔ یہ بڑے متقی اور بزرگان دین تھے۔ یہ بارہ بابا قلعہ احمدآباد کی تعمیر میں معاون دعاگو تھے۔ [۹] ان کے نام ہیں۔

(۱) بابا خوجو

(۲) بابا لادو

(۳) بابا کرامت

یہ تینوں حضرات دھولکہ میں مدفون ہیں۔

(۴) بابا علی شیر

(۵) بابا محمود

یہ دونوں بزرگ سرخیز میں مدفون ہیں اور یہ وہیں مقیم بھی تھے۔

(۶) بابا توکل

نصیرآباد میں مدفون ہیں۔

(۷) بابا لولوئی جن کو بابو محمد بھی کہتے تھے۔ ان کا مزار دریائے سابر کے کنارے ہے۔ (جمال پور دروازہ کے باہر)

(۸) بابا احمد ہنگوری

یہ نالبندی کے نام سے مشہور تھے۔ اور سلطان نظام الدین اولیاء سے آپ کو خرقۂ ادارت ملا تھا۔

(۹) بابا لڈّھا

یہ کھڑکی کے نزدیک مدفون ہیں۔

(۱۰) بابا دھوکل

یہ دہلی دروازہ اور شاہ پور دروازہ کے مابین مدفون ہیں۔

(۱۱) بابا سیاح

ویرم گام میں مدفون ہیں۔

(۱۲) بابا کمال کرمانی [۱۰]

ان کی قبر بہرام پور کے ایک مینار والی مسجد سے متصل واقع ہے۔ ان بزرگ کو بھی سلطان نظام الدین اولیاء کے سلسلے سے خرقۂ ادارت ملا تھا۔

شہر احمدآباد اپنی لطافت کے اعتبار سے اور آبادی کی کیفیت کے لحاظ سے تمام عالم اسلام میں مشہور تھا اور کئی شہروں پر اسے ترجیح دی جاتی تھی۔ کیونکہ یہاں کی عمارتیں انتہائی نزاکت اور نزاہت کے اعتبار سے دوسرے شہروں سے مستثنٰی تھی اور زمانہ اور وقت کے ساتھ سلاطین گجرات نے اس کو زیادہ سے زیادہ سنوارنے کی کوششیں کی تھیں۔ [۱۱] اس کے محلات پورہ جات پر تقسیم تھے۔ شہر میں ۱۷ چکلے یعنی

چوراہے بنائے گئے تھے جن کے نام ہیں۔

(۱) چکلہ بازار

(۲) پیپولہ

(۳) مانیک چوک

(۴) دھیکو

(۵) لیمبڑی

(۶) بہندری

(۷) چولہ ازدر چور جس کو اپر پور بھی کہتے ہیں۔ (کھاڑیا)

(۸) رائے پور چکلہ

(۹) استوڈیا چکلہ

(۱۰) جمالپور چکلہ

(۱۱) رائے کھڑ

(۱۲) خان پور

(۱۳) شاہ پور

(۱۴) اشرُریہ

(۱۵) دریا پور

(۱۶) صدر جہاں

(۱۷) جوہری باڑہ [۱۲]

ان تمام چوراہوں پر چبوترے بنے ہوئے تھے اور ان پر محافظ متعین تھے۔ اسی طرح احمدآباد کے محلات اور مضافات پورہ جات سے مشہور تھے۔ ان کی فہرست بہت طویل اور تفصیل سے مِراتِ احمدی میں لکھی گئی ہے۔ لیکن ہم یہاں چند پورہ کے نام بطور تعارف کے درج کرتے ہیں۔

کالوپور

تاج پور

جمال پور - عیسن پور

گیاس پور

عثمان پور

شاہ پور

قاضی پور

حاجی پور

دریا پور

لودھی پور

ہری پور

رسول پور

سرس پور

میٹھا پور

سلیم پور

سارنگ پور

راج پور

گومتی پور

بابی پور

ہیر پور

فتح پور۱۳ؔ

صاحب مرأت احمدی نے لکھا ہے کہ ابتداء میں جب احمدآباد آباد کیا گیا تو اس وقت آبادی زیادہ نہ تھی اس لیے گجرات کے ہر ایک امیر اورشہزادے نے حصار کے اندر اور باہر اپنے رہنے کے لیے ایک جگہ معین کر لی۔ اور یہی جگہ ان کے نام کی

نسبت کے ساتھ پورہ کے نام سے مشہور ہو گئی۔ آگے چل کر یہ پورہ مخفف ہو کر 'پُر' رہ گیا مثلاً تاج پور اور جمال پور لیکن جب شہر پوری طرح آباد ہو گیا تو شہر کے باہر آبادی شروع ہوئی اور نہایت کثرت سے پورے آباد ہوتے چلے گئے۔ جن کی تعداد تقریباً ۳۶۰ بلکہ ایک روایت کے مطابق ۳۸۰ تھی۔ اور یہ تمام پورے گجراتی امراء نے اپنے نام پر آباد کیے تھے۔ ۱۴؎ اور وہ ان میں نہایت احتشام کے ساتھ سکونت رکھتے تھے۔ یہ پورے درحقیقت بہت چھوٹے چھوٹے شہر کی شکل میں تھے۔ تمدن کے تمام ضروری ساز و سامان موجود تھے۔ تذکرۃ الملک کے مؤلف نے عثمان پورہ کے لیے لکھا ہے کہ یہاں کم از کم کاریگروں کی بارہ ہزار دکانیں ہیں۔ فتنہ وہ فساد کے ظہور سے پہلے تمام پورے تاجروں، کاریگروں اور اہل کاروں سے بھرے ہوئے تھے اور نہایت پرتکلف اور شاندار عمارتیں ان میں موجود تھیں بعد کو یہ پورے ویران ہو گئے۔ اکبر کی فتح کے بعد ان کی آبادی میں کافی تغیر و تبدل ہو گیا۔ اور بعض کے تو صرف نام ہی باقی رہ گئے ہیں۔ ۱۵؎

مولانا جناح الدین لکھتے ہیں کہ احمد شاہ (۱۴۱۱ء میں ۸۴۲ھ) کے عہد کے ساتھ گجرات میں ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی جس میں بڑے بڑے فنی حوصلے حسب منشا تعمیل کو پہنچے اور اس کے دارالسلطنت احمد آباد کا شمار ان شہروں میں ہوتا ہے جو تعمیر کے بہت سے حسین نمونوں سے آباد ہے۔ ۱۶؎ احمد آباد کی جامع مسجد مغربی ہندوستان میں اپنی قسم کی بہترین عمارت مانی جاتی ہے۔ یہاں کی عمارتوں کو دیکھ کر ان کی طبیعت کی شگفتگی کا خیال آتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ بنانے والوں کی خیال اور نظریۂ زندگی خون کی طرح گردش کرتے ہوئے ان کے ہاتھوں کے ذریعہ ان تخلیقات میں پہنچ گیا ہے جو ان کے ہاتھوں نے بنائی ہے۔ ان کی مسجدوں میں روشنی پہنچانے کے لیے جو طریقہ استعمال کیا گیا ہے وہ کافی پیچیدہ ہے۔ روشنی کا رخ بدلا جاتا ہے پھر اس کا عکس اس طرح ڈالا جاتا ہے کہ پوری مسجد میں روشنی یکساں پھیلتی ہے۔ مرکزی اور بغلی حصوں کی ترکیب اس مسئلے کو خوب یا بہت خوشنما طریقے سے حاصل کرتی ہے کہ بلندی

کے رجحان سے روشنی کی ضرورت کو کیسے پورا کیا جائے عمارات کی تقریباً ہر خصوصیت فن تعمیر سے ذرا سی بھی دلچسپی رکھنے والے کو ان کی تعریف کرنے پر مجبور کر دے گی جامع مسجد سے احمد شاہ کے محل تک جو راستہ جاتا ہے اس پر تین دروازوں کے نام کا ایک فتح دروازہ بھی ہے۔ اس کے گرد دکانیں ہیں جس کی وجہ سے اس کی شان جاتی رہی۔ مگر اس کے محرابوں کا فن اب بھی نمایاں ہے۔ ۱۷

والیٔ گجرات سلطان مظفر خان کی خوش ذوقی اور فنِ تعمیر سے اس کی دلچسپی کی عام شہرت تھی۔ چنانچہ سلطان حسین لنگاہ نے قاضی محمد اوچوی کو گجرات بھیجا تاکہ وہاں کی عمارات کے نقشے تیار کروا کر لائے۔ انھوں نے گجرات پہنچ کر احمد شاہ کی خدمت میں اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ احمد شاہ نے بڑی خوشی سے اس کو اجازت دے دی ان دنوں احمد آباد نیا نیا بسایا گیا تھا۔ قاضی محمد نے ان تمام نوتعمیر محلات کے خاکے تیار کیے اور واپس ملتان پہنچ کر سلطان حسن لنگا کی خدمت میں پیش کیے اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ اگر ملتان کا تمام محصول بھی صرف کر ڈالیں تو بھی احمد آباد کے محلات جیسا ایک محل بھی وہ تعمیر نہیں کرسکیں گے۔ ۱۸

سلاطین گجرات نے ہمیشہ احمد آباد کی توسیع کی طرف زیادہ دھیان دیا اور اسے حسین سے حسین تر بنانے کی فکر میں لگے رہے۔ ہر نیا آنے والا سلطان چاہتا تھا کہ اس کا نام شہر احمد آباد سے جڑا رہے۔ اس لیے ان لوگوں نے سڑکیں بنوائیں، پل بنوائے، لنگرخانے، شفاخانے، مسافرخانے، یتیم خانے اور بہت سے تالاب بنوائے۔ یہاں کی سڑکیں کافی چوڑی ہوا کرتی تھیں۔ تاریخ فرشتہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ احمد آباد کی سڑکیں اسقدر کشادہ اور چوڑی تھیں کہ دس دس گاڑیاں آسانی کے ساتھ پہلو بہ پہلو چل سکتی تھیں۔ سلطان محمود اول کے وقت میں ایک بڑی سڑک پٹن سے بڑودہ تک تیار کی گئی تھی۔ ۱۹ جس کے دونوں کناروں پر سایہ دار درخت بھی لگائے گئے تھے۔ اسی کناروں پر طرح محمود ثالث نے اپنے عہد میں احمد آباد سے محمود آباد تک ایک سڑک تیار کروائی۔ جس کے دونوں جانب دکانیں تھیں۔ چانپانیر میں ایک عالیشان قصر

بھی بنوایا اور اس کا نام دلکشا رکھا۔ بہادر شاہ مظفر اکثر اسی محل میں رہتا تھا۔ اس عمارت سے متصل ایک بہت وسیع اور عظیم الشان مکان بنایا گیا تھا۔ جس کو دربار کہتے تھے، غیر ممالک کے سفیر یہیں رہتے تھے۔ ۲۰

محمود ثالث نے محمود آباد میں دو میل لمبا آہوخانہ تیار کیا تھا۔ اس میں متعدد قصر اور مختلف عمارتیں بھی بنوائی تھیں۔ اس عہد میں دریا خان نے احمد آباد میں ایک عالیشان گنبد تیار کروایا تھا۔ یہ تمام گجرات اور کاٹھیاواڑ میں اپنے طرز کی واحد اور بے مثل عمارت تھی۔ اس وقت تک گجرات میں جتنی عمارتیں تعمیر ہوئی تھیں وہ سنگی ستونوں پر قائم کی جاتی تھی۔ مگر یہ گنبد ایرانی اور عربی طرز کا پکی اینٹوں پر قائم کیا گیا تھا۔ کیونکہ یہ طرز تعمیر گجرات کے لیے بالکل نیا تھا اس لیے اس گنبد کی بڑی شہرت تھی۔ ۲۱ احمد آباد کے علاوہ گجرات میں دوسرے شہروں میں بھی کافی شاندار عمارتیں بنوائی گئیں۔ جو اپنی خوبصورتی دلآویزی اور شان و شوکت میں بے نظیر تھیں۔ کھمبایت، مانگرول، بھروچ، احمد آباد کی جامع مسجدیں (ہلتے مینارے) احمد آباد کی قدیم مسجدوں میں اکثر دو ہی مینارے ہوتے۔ جس کی خصوصیت یہ تھی کہ ایک مینار کو ہلانے سے دوسرا بھی ہلنے لگتا تھا۔ مساجد میں جھوٹ کاکے کی مسجد، جالی والی مسجد، رانی سپری کی مسجد، احمد آباد میں اپنی صناعی کے بہترین نمونے مانے جاتے ہیں۔ شاہ جہان نے احمد آباد میں شاہی باغ کے ساتھ دریا کے کنارے پر جو محل تعمیر کروایا تھا وہ بھی اپنی نظیر آپ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شہر احمد آباد میں ۵۰۰ مسجدیں پتھر کی تعمیر کی گئیں۔ جب شاہ جہاں احمد آباد میں گورنر کی حیثیت سے عرصے تک رہے۔ یہاں کی عمارتوں کو دیکھ کر ان کو عمارتوں کا ذوق پیدا ہوا۔ ۲۲

شہر احمد آباد نہ صرف عمارات اور باغات کے لیے مشہور تھا بلکہ یہاں کے پارچہ ذات بھی تمام ہندوستان میں مشہور تھے۔ مرأت احمدی میں لکھا ہے کہ محمود شاہ اوّل کے دور میں احمد آباد میں کمخواب، قشطی، مخمل، چکن، کارچوب کا کام بہت عمدہ قسم کا ہوتا تھا۔ اور یہاں کے کاریگروں کے نام ایران، تہران، روم اور شام تک مشہور تھے۔ ۲۳

خلاصۃ التاریخ میں لکھا ہے کہ احمد آباد میں زری کا چیراں، پھوتا، جامہ دار، مخمل، زربفت، خارہ وغیرہ بہت اچھے تیار ہوتے تھے اور روم فرنگ اور ایران کے کاریگروں کی تقلید کی جاتی تھی۔ یہاں کے کاریگروں نے شاہ جہاں کے دور میں مخمل اور زربفت کا ایک خیمہ ایسا قیمتی بنایا تھا جو ایک لاکھ میں مکمل ہوا تھا۔ گجرات کے یہ اہل فن ایسے تھے کہ دنیا کے دور دراز گوشوں میں ان کی صناعی مشہور تھی۔ اسی طرح احمد آباد کے مبارک نام کا یہ اثر ہوا کہ یہاں بہت سے اصحاب عالم طریقت بھی ہوئے شیوخ، فقیر بھی اور دنیوی فنون میں کمال رکھنے والے بھی اور بہت سے علماء نے اپنی قلم کے اعجاز سے بھی احمد آباد کو چار چاند لگا دیے۔ ان صوفیاء اور علماء کا ذکر ہم مختصر طور پر ضرور کریں گے۔ ۲۴

تاریخ میں احمد آباد خجستہ بنیاد اپنی ایک اور صفت کی وجہ سے بہت مشہور ہے اور وہ یہ کہ یہاں کے سلاطین، صوفیائے کرام اور بزرگان دین کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے اور ان کے بہت ہی معتقد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ گجرات میں دور دور سے بزرگان دین اور اولیائے کرام کی آمد ہوا کرتی تھی۔ یہ حضرات حتی الامکان یہاں دین کی تبلیغ کرتے انہیں کے نیک اقدام کی وجہ سے گجرات پھلتا پھولتا رہا اس کی شاندار عمارتیں آج بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ کسی زمانے میں ان بزرگان کی جاہ و جلالی کتنی پرنور تھی جس کی وجہ سے شہر احمد آباد تمام ہندوستان میں اور خاص کر مرکز یعنی دہلی میں اپنی جداگانہ حیثیت کا حامل تھا۔ یہاں کے زیادہ تر سلاطین اہل سنت والجماعت تھے۔ حکومت کی طرف سے عالموں اور صوفیوں مسجدوں کے اماموں اور درویشوں کو کثرت سے وظائف دیے جاتے تھے۔ نہ صرف گجرات کے عالموں اور صوفیوں کو یہ وظائف دیے جاتے تھے بلکہ غیر ملکی عالموں کو بھی یہ وظائف ملتے تھے۔ ۲۵

بزرگان دین کو جو جاگیریں عطا کی جاتی تھیں وہ دو قسم کی ہوتی تھیں ایک موروثی اور دوسری غیر موروثی، موروثی جاگیریں زیادہ تر سپاہیوں، مساجد کے اماموں اور مشائخ کو دی جاتی تھیں۔ چنانچہ سلطان قطب الدین احمد کے زمانے میں گجرات کا

دو حصّہ سپاہیوں کے قبضے میں تھا اور ایک حصّہ مسجد کے اماموں، مشائخ، صوفیاء اور علماء کے نام تھا۔ ۲۶

غنیت المنیتا ہندی موسیقی پر ایک تالیف ہے۔ جو فیروز شاہ تغلق کے عہد میں امیر شمس الدولہ والدین اسیر اسیم حسن ابو رضا حاکم گجرات کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب ہندی ماخذ پر مبنی ہے۔ اور دو قسم چار باب اور اٹھارہ فصلوں پر حاوی ہے۔ چنانچہ قسم اول باب اول در معارفت بسروت (فصل چار) باب دوم اور در معارفت مرزا امیر (فصل دوم)

قسم دوم - باب اول درمیان رقص فصل چار باب دوم و شرائط و آداب سروت (فصل آٹھ) اس سے بہتر ایک عربی تالیف فرید الزماں کی فی معرفت الہان ہے۔ جس کا موضوع ایرانی موسیقی سے اسی والی کے اشارے پر ترجمہ کی گئی تھی۔ ۲۷

گویا بخشو

راجہ مان نے موسیقی میں بے حد ترقی کی تھی۔ دھرو پد کو اس کے تصریفات نے کمال پر پہنچا دیا تھا۔ اس کے دربار میں اچھے موسیقی دان جمع تھے۔ جس میں بعض اس فن کے امام مانے جاتے تھے۔ مثلاً نائک بخشو جو مسلمان ہے اور انہیں راجہ کا تربیت یافتہ تھا۔ نائک بخشو راجہ مان کی وفات کے بعد کچھ عرصے اس کے فرزند راجہ وکرما جیت کے پاس رہا اس کے بعد وہ کالنجر کے راجہ فراہت کے پاس چلا گیا۔ وہاں سے گجرات کے بہادر شاہ گجراتی کے دربار میں پہنچا اور باقی عمر وہیں بسر کی۔ بخشو کے بعد تان سین نے موسیقی میں نام پیدا کیا۔ تان سین شیخ محمد غوث گوالیاری کا مرید تھا۔ ابتدا میں وہ چندر واگھیلا کے پاس تھا۔ جب جلال الدین محمد اکبر نے اس کی شہرت سنی تو اسے اپنے دربار میں بلا لیا۔ اس طرح احمد آباد نے موسیقی میں بھی اپنی جگہ بنائی تھی۔ ۲۸

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں احمد آباد میں بزرگان دین کی ہمیشہ آمد رہی۔ اس لیے یہاں چند سادات خاندان کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

ساداتِ احمدآباد

(۱) سادات بخاریا

یہ حضرت قطب شاہ اور شاہ عالم کی اولاد ہیں۔

(۲) سادات قادریہ

یہ پیران پیر سید عبدالقادر جیلانی کی اولادوں میں سے ہیں۔ ان میں سے سید جمال پتھری رحمت علیہ سید عبدالجلیل اور سید عبدالخالق رحمت اللہ علیہ مشہور و معروف بزرگوں میں سے ہیں۔

(۳) سادات شیرازی :

سادات میں سے ایک اور خاندان سادات شیرازی کا ہے۔ جن میں سے سید احمد جعفر شیرازی ان کی اولاد میں سے ہیں اسی طرح سید کمال الدین شیرازی جن کا مزار پرانے اشاول میں مسجد ادینہ کے پیچھے واقع ہے۔

(۴) سادات رفاع

سید احمد کبیر رفاعی کی اولاد میں سے ہیں۔ ان میں سے سید عبدالرحیم ہیں۔ جن کا مزار احمدآباد قلعہ کے باہر سلطان پور قلعہ میں واقع ہے۔ ان کی اولاد میں علی جی گام دھنی وغیرہ شمار کیے جاتے ہیں۔ ۲۹

(۵) سادات مشہدی

اس خاندان میں سید شریف الدین مشہدی ہیں جو مخدوم جہانیاںؒ کے داماد ہیں اور ان کا مزار بھروچ میں ہے۔

(۶) سادات عید روسیہ

سادات میں سے سادات عید روسیہ بھی ہیں جو سید شریف الدین ابوبکر عید روس خضر مدنی کی اولاد میں سے ہے۔ سید شیخ عیدروس کا مزار جوہری واڑہ میں ہے۔ جن کی اولاد سورت اور بھروچ میں آسودۂ لحد ہیں۔ ۳۰

(۷) سادات ترمذی

جو سید مخدوم یحییٰ ترمذی کی اولاد میں سے ہیں۔ مخدوم جہانیان کے خلیفہ تھے۔ ان کا مزار بڑودہ میں تالاب کے نزدیک واقع ہے۔ جو تالاب ماتریا کے نام سے مشہور ہے۔

(۸) سادات سید یعقوب

یہ مخدوم سید بھدر بھکری کی اولاد سے ہیں اور وہ بھی مخدوم سید جہانیان کے خلیفہ تھے۔

(۹) سادات عریضی

سید خواند میر اور سید یعقوب یہ دونوں سید سادات عریضی میں سے ہیں۔ جن کا مزار بی بی پور میں واقع ہے۔

(۱۰) سادات زیدیا

سید عثمان شمع برہانی یہ سادات زیدیا میں سے ہیں۔ اس طرح احمدآباد میں سادات خاندان اور کئی دوسرے سادات خاندان بھی موجود تھے۔ جنھوں نے اپنی علمی قابلیت کی بنا پر مذہب و ادب کی دل کھول کر خدمت کی یہاں تک کہ تاریخ ادب میں ان کی تصانیف کا جابجا ذکر ملتا رہتا ہے۔ [۱۳]

جیسا کہ ہم جانتے ہیں گجرات میں تاریخی تصانیف دستیاب ہیں۔ تاریخی کتب جو گجرات پر لکھی گئی ہیں درج ذیل ہیں۔

(۱) مظفر شاہی (۷۸۲، ۱۱۰۶)

اس میں سلطان مظفر شاہ اوّل کے دور کا ذکر ہے۔

(۲) احمد شاہی (۱۱۰۳)

سلطان احمد شاہ کے عہد کو اس کتاب میں منظوم بیان کیا گیا ہے۔ یہ علوی شیرازی کی تصنیف ہے۔

(۳) محمود شاہی (۹۶۶، ۱۱۰۶)

اس کتاب کا دوسرا نام متاع محمودیا بھی ہے جو محمود شاہ کبیر کے دور سلطنت کی تاریخ ہے۔ اس کے مصنف شمس الدین شیرازی ہیں۔ جو زیرک کے لقب سے مشہور ہیں۔

(۴) طبقات محمود شاہی (۲۲۰، ۱۱۲۰)

اس کتاب میں سیدنا آدمؑ کی تخلیق سے لے کر ۹۱۵ھ تک کے حالات مذکور ہیں۔ اس کے مصنف شیخ عبدالکریم بن عطاؤاللہ شیرازی ہیں۔ جنھوں نے سلطان محمد شاہ کبیر کے دور میں اس کو تصنیف کیا ہے۔

(۵) مظفر شاہی (۲۸۷، ۱۱۰۶)

اس میں سلطان مظفر بن محمود شاہ تک کے حالات مذکور ہیں ہلالی کی تصنیف ہے۔

(۶) بہادر شاہی (۹۶۷، ۱۱۰۵)

سلطان بہادر شاہ بن مظفر کے عہد میں لکھی گئی اس کتاب کے مصنف حسام خان ہیں۔

(۷) مِرأت سکندری

سکندر بن محمود نے ۱۰۲۰ء میں سلاطین گجرات کے حالات اس کتاب میں بیان کیے ہیں۔

(۸) مرأت احمدی

یہ بھی گجرات کی تاریخ ہے جسے مرزا محمد علی نے تصنیف کی۔

(۹) تاریخ صغیر گجراتی

یہ بھی تاریخ کی کتاب ہے۔ شیخ ابو تراب بن کمال الدین حسینی اس کے مصنف ہیں۔

(۱۰) ظفر لالوالہ بمظفر والہ

اس میں عربی زبان میں گجرات کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ جو شیخ عبداللہ بن محمد عمرو سید آصفی مکی کی تصنیف ہے۔

(۱۱) تحفۃ السعادت

یہ فارسی میں لکھی ہوئی آرام کاشمیری کی تصنیف ہے۔ جو سید مبارک حسینی بخاری

کے لیے تصنیف کی گئی ہے۔

(۱۲) یاد ایام

حضرت مولانا سید عبدالحئی حسینی کی تصنیف ہے۔ اردو زبان میں ہے۔

(۱۳) تاریخ گجرات اور گجرات کی تمدنی تاریخ

یہ دونوں تصنیفات مولانا ابوظفر ندوی کی ہیں۔ ۳۲

نوٹ : جن کتابوں کے سامنے مابین القوسین نمبر درج ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں یہ کتابیں اس نمبر پر دستیاب ہیں۔

(بحوالہ مشائخ احمد آباد صفحہ ۹۴)

شہر احمد آباد گجرات کا مرکز رہا ہے۔ یہاں ادبی، مذہبی بہت سی شخصیتیں ایسی تھیں جنھوں نے ادب و مذہب میں اپنا نام روشن کیا۔ یہاں صوفیوں اور بزرگوں، شعراء اور ادیبوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ کئی خاندان ایسے تھے جو ادبی خدمات انجام دے رہے تھے۔ مثلاً مولانا غلام محمد

مولانا غلام محمد کا وطن احمد آباد تھا۔ انھوں نے مولانا نظام الدین فرنگی محلی سے تحصیل علم کی تھی۔ اور ایک بزرگ عارف بلّاہ سید عبدالرزاق ہاشمی سے انھوں نے روحانی علم سیکھا تھا۔ یہ فن قرأت میں یگانہ روزگار تھے۔ برہان پور کا ایک صوبیدار جس کا نام محمد انور صوبیدار تھا آپ کا معتقد تھا۔ وہ آپ صاحب کو اپنے ساتھ برہان پور لے گیا۔ اور وہاں آپ کے لیے مدرسہ و خانقاہ تعمیر کروائی۔ اور دہلی سے سالانہ چھتیس ہزار روپیہ مقرر کروا لیا تھا۔ مولانا غلام محمد نے اپنے فرزند ولی اللہ کو احمد آباد سے طلب کر کے سات سال تک تعلیم دی۔ وہ جہاں بھی جائے ان کی دعائیں ان کے ساتھ رہتی حج بیت اللہ گئے وہاں حضرت ولی اللہ شیخ محمد مدنی محدث سے بیعت کی اورقرأت میں سند حاصل کی۔ مولانا غلام محمد نے بمقام برہان پور ۱۷۳۶ء میں وفات پائی۔

غلام محمد کے بعد ان کے فرزند غلام احمد عرف خوب میاں نے درس و تدریس

کے فرائض انجام دیے۔ انھوں نے ۱۸۵۹ء میں انتقال کیا۔ ان کا مزار بھی اپنے والد کے پہلو میں واقع ہے۔ ان کے بیٹے عبدالغنی کی قبر بھی اسی مسجد میں ہے۔ شاہ تجرد بھی اسی جگہ درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ ۳۳

احمد آباد کے شعراء

کلیم احمد آبادی

ان کا نام عبدالکریم اور کلیم تخلص کرتے تھے۔ ان کا تعلق قریش (قصاب) برادری سے تھا۔ وطن احمد آباد گجرات۔ انسانی زندگی کا ایک اصول یہ ہے کہ مختلف شعبوں میں بس جانے والی شخصیتیں اپنی طبعی افتاد کے تعلق سے وہ اپنے فن کا راستہ کسی نہ کسی طرح دریافت کر لیتی ہیں۔ اسی طرح کلیم صاحب نے ابھی ایسے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں۔ جہاں دینی یا دنیوی تعلیم کا زیادہ رواج نہ تھا۔ اسی وجہ سے آپ نے ابتدائی دور میں اردو گجراتی کی معمولی تعلیم پائی تھی۔ کم عمری میں آغوش مادری سے محروم ہو چکے تھے۔ اور نئی ماں کے گھر میں آنے کے بعد گھر کا ماحول بھی سازگار نہ رہا۔ ساتھ ہی محلے کے حالات بھی کچھ ایسے نہ تھے کہ جہاں سے ان کے ذہن کو جلا ملتی۔ کلیم صاحب کی زندگی کا یہی وہ دور تھا جس میں ان کی ذہنی تعمیر ہوئی تھی۔ ۳۴ افلاس تنگ دستی ، کسم پرسی کا عالم، یہ تمام مصائب ان کی ذہن و قلب پر اثر پذیر ہوئے۔ اور یہی چیزیں ان کی متاع حیات میں کارہائے نمایاں کر گئیں۔ ان تمام عناصر کی وجہ سے ان کی طبیعت میں سوز و گداز کی ایک ایسی لذت پیدا ہوگئی۔ جو انھیں آہستہ آہستہ ادب و شعر کی وادیوں میں کافی دور تک لے گئی۔ اور اس غیر ادبی ماحول میں بھی پاکیزہ افکار، لطیف جذبات و احساسات نے مزاج میں شاعرانہ رنگ بھر دیا تھا۔ شاید شاعری کی نعمت ان کی قسمت میں پہلے ہی سے لکھی جا چکی تھی۔ شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ اس غیر ادبی ماحول میں بھی کلیم صاحب کی فنکارانہ شخصیت تپ کر کندن بن گئی۔ ۳۵

ان کی زندگی میں ایک ایسا موڑ آیا جو انھیں شعر و سخن کی بلندیوں کی طرف

لے جاتا ہے۔ یہ وہ موڑ تھا جب ان کی ملاقات عزیز اِٹاروی سے ہوئی۔ شعر و ادب کی دنیا میں ان کا سلسلہ غالبؔ سے ملتا ہے۔ کیونکہ عزیز کے استاد حضرت سہیلؔ سورتی جو حضرت اعجازؔ بھڑوچی کے شاگرد تھے۔ اعجازؔ صاحب رضوان علی خان مرادآبادی کے شاگرد تھے۔ رضوان علی خان حضرت غالب کے تلامذہ میں سے تھے۔ اس طرح کلیم صاحب کو غالب سے براہِ راست نہ سہی لیکن ان کے شاگردوں سے فیض حاصل تھا۔ کلیم صاحب کے زمانے میں دہلی میں حضرت داغؔ دہلوی اور لکھنؤ میں امیرؔ و جلالؔ شاعری کے آسمان میں چمک رہے تھے۔ احمدآباد میں عزیزؔ صاحب کی کتابوں کی دکان تھی اور اسی دکان سے کلیم نے کافی استفادہ کیا۔ انھوں نے صنف غزل کو اپنا موضوع بنایا۔ ۳۶؎

۱۹۱۲ء میں کلیم بمبئی چلے گئے۔ وہ وہاں مسلسل چار سال تک رہے۔ بمبئی کے شاعروں اور ادبی مجلسوں میں لگاتار شرکت کی وجہ سے کلیم صاحب وہاں ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہو چکے تھے۔ اور عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ بمبئی کے ماحول کا ان کی شخصیت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ان کی روش اور وضع داری جوں کی توں رہی۔ توکل، استغناء عیش و طیش دونوں حالتوں میں ان کی مزاج و طبیعت کا دھارا ہمیشہ یکساں رہا۔ وہ سادہ اور بے تکلف زندگی پسند کرتے تھے۔ بمبئی سے آنے کے بعد ان کی طبیعت کا میلان تصنیف کی طرف ڈھل گیا۔ اور انھوں نے فکر و سخن سے کوئی واسطہ نہیں رکھا۔ انھیں دنوں شاہ جہاں پور کے ایک طبیب حضرت شاد احمدآباد تشریف لائے اور انھوں نے یہاں اپنا مطب شروع کیا۔ شادؔ کے آتے ہی احمدآباد کی ادبی دنیا میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ جگہ جگہ مشاعرے اور مجلسیں ہونے لگیں۔ ماحول کی اس گہما گہمی میں کلیم بھی کھنچتے چلے آئے اور از سر فکر سخن کا آغاز کیا۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۷ء تک کا ابتدائی کلام جلوہ یار میں اور ترقی سخن میں چھپتا رہا۔ ۳۷؎ کلیم صاحب بہ یک وقت اردو گجراتی دنوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے اور دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ لیکن زیادہ تر وہ اردو زبان میں ہی شعر کہتے

تھے۔ ۱۹۵۱ء میں احمد آباد والوں نے اپنے اس مایۂ ناز صوفی منش شاعری کی جیوبلی نہایت تزک و احتشام سے منائی اردو گجراتی کے ادباء، شعراء، کالجوں کے پرنسپل، پروفیسر، علمی اداروں اخبار نویسوں اور مِل مالکوں نے متفقہ طور پر یہ جشن منایا۔ مسلسل تین دن تک اجلاس منعقد ہوتے رہے۔ پہلا اجلاس پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ صدر صاحب کے خطبہ کے بعد پروفیسر ظہیرالدین مدنی، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار نے مقالے پیش کیے۔ مولانا سید ابو ظفر ندوی کا بھی ایک مقالہ پڑھا گیا۔ اس اجلاس میں باشندگانِ احمد آباد کی جانب سے مبلغ ۱۰۰۰ روپے کی تھیلی اور سپاس نامہ حضرت کلیم کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ دوسرے روز اردو کا مشاعرہ تھا۔ جو پروفیسر ڈار کی صدارت میں ہوا۔ اس مشاعرے میں جگن ناتھ آزاد اور شکیل بدایونی کے علاوہ متعدد مقامی اور بیرونی شعراء نے حصّہ لیا تھا۔ تیسرے روز گجراتی ہندی مشاعرے کی نشست رکھی گئی۔ اس کی صدارت احمد آباد کے ہر دل عزیز شری چیتنیہ پرشاد دیوان جی نے کی۔ یہ ایک ایسا اجلاس تھا جس میں ہندو، مسلم، پارسی، عیسائی، عوام و خواص نے مشترکہ طور پر حصّہ لیا اور ایک گوشہ نشین اور گمنام شاعر کی عظیم الشان پیمانہ پر جوبلی منائی۔ یہ ایک ایسی جوبلی تھی جو احمد آباد کی علمی و ادبی تاریخ میں یادگار رہے گی۔ ۳۸

کلیم صاحب نے اردو کی مشہور کتاب طلسم ہوش ربا کا گجراتی میں ترجمہ کیا۔ جس نے شائع ہوکر کافی مقبولیت حاصل کی۔ ان کے نعتیہ کلام کا مختصر مجموعہ گلزار طیبہ کے نام سے گجراتی رسم الخط میں شائع ہو چکا ہے۔ ۳۹

متاع کلیم کے علاوہ انھوں نے آغا حشر مرحوم کے چند ڈراموں کو بھی گجراتی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس طرح احمد آباد کے اس لاڈلے شاعر نے اردو ادب کی ترقی میں اپنا حصّہ بخوبی نبھایا۔

نمونۂ کلام

چلے تو موج محبت سبک روی سے چلے
یہ کیا کہ شورش بے اختیار بن جائے
کچھ اس ادا سے شگفتہ ہوا ہے غنچۂ دل
خزاں بھی آئے تو فصلِ بہار بن جائے
سحر دعا کے لیے ہے دعا سحر کے لیے
کہو کلیم سے شب زندہ دار بن جائے

......

رگ رگ میں مرے بھر دی بے تابی و بے چینی
آرام سے بیٹھے ہیں لے کر وہ سکوں میرا

......

مطلب یہ تھا کہ اور کسی کو خبر نہ ہو
دل کی پکار دل کی زباں سے کہی گئی
آداب بزمِ ناز کی مجبوریاں نہ پوچھ
کہنے کی بات بھی نہ زباں سے کہی گئی

......

گلشن بھی جنوں ساز بیاباں بھی جنوں ساز
ہر چیز یہاں کی ہے تماشہ مرے آگے

......

ہمیشہ کھیلتا رہتا ہے جو طوفاں کی موجوں سے
سہارا اس کو تنکے کا بھی نہ منظور ہوتا ہے ۴۰

......

یہ حالت بھی تعجب خیز حالت ہے مرے دل کی
جہاں مختار ہوتا ہے وہیں مجبور ہوتا ہے

......

کلیم اہل بہشت دیکھتے ہیں کہہ نہیں سکتے
کہ ہر دار و رسن کے ساتھ اک منصور ہوتا ہے

......

آدمیت کا تقاضہ ہے کہ لے ضبط سے کام
ورنہ فطرت میں ہر اک آدمی دیوانہ ہے

......

صیاد کا قصور نہ میرا قصور ہے
اک دانۂ ہوس نے گرفتار کر دیا
امید و بیم کی یہ کشاکش نہ پوچھیئے
جینا بھی چار روز کا دشوار کر دیا

......

خود کہتا ہوں خود گاتا ہوں وہ مستِ غزل ہوں
خود جھومتی ہے میری تمنا میرے آگے

......

ٹوٹا نہ کاروان محبت کا سلسلہ
ہارے تھکے سب ایک ہی منزل میں آ گئے

......

اچھا ہوا مرقعۂ عشق میں کلیم
ہر مدتی کے سامنے ہم مست کھو گئے اہا

......

فخرالدین فخرؔ

فخرؔ صاحب ۱۸۹۳ء میں شہر احمدآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا گھرانہ پہلے ہی سے علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ وہ حسنی حسینی سید گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم منشی علاؤالدین اور حافظ غلام حسین سے پائی تھی۔ آگے چل کر فارسی و عربی ادب کے علاوہ آپ نے منطق، فلسفہ اور دینیات جیسے علوم فقیہ العصر مولانا جناب عبدالرحیم صاحب اور حافظ مولوی ضیا اللہ علوی صاحب سے حاصل کیے۔

آپ کا پیشہ مدرسی تھا۔ وہ میونسپل اردو اسکول احمدآباد کے صدر مدرس تھے۔ آپ میونسپل اسکول بورڈ میں اردو سپروائزر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ اس طرح انھوں نے وہاں بھی اردو کی قابل قدر خدمات کی۔ فخرؔ صاحب نے احمدآباد کے ٹریننگ کالج سے سینئر ٹرینڈ ٹیچر کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا تھا۔ شروع ہی سے آپ کو اردو زبان سے بڑا لگاؤ تھا۔ اردو شعرگوئی میں وہ پہلے ہی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ فن سخن میں انھوں نے حضرت سہیلؔ سورتی کو اپنا استاد بنایا تھا۔ ایک مرتبہ احمدآباد شہر میں شاعر جناب عینی خان نشترؔ کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔ اس میں حضرت سہیلؔ سورتی اور اعجازؔ بھروچی کے شاگردوں کے علاوہ شہر کے مشہور ارباب علم و ادب اور عمائدین شہر نے شرکت کی تھی۔ اسی جلسے میں فخر صاحب کو ان کی علمی قابلیت، روشن دماغی اور پختہ کلامی کے پیش نظر جناب سہیلؔ سورتی کا جانشین تسلیم کیا گیا تھا اور اسی جلسہ میں انہیں فخر گجرات کے لقب سے نوازا گیا تھا۔ ۴۲؎ یہ اسی جلسے کی برکت ہے کہ سید فخرالدین آج تک فخر گجرات کے نام سے مشہور ہوئے اور گجرات کا اردو ادب بھی ان پر فخر محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے احمدآباد کے خزانۂ اردو ادب میں اپنا قیمتی اور بہترین سرمایہ چھوڑا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ فخر صاحب کی شاعری کا تمام سرمایہ شاید اردو والوں کو دستیاب نہیں ہوا۔ گجرات جس پر فخر کرتا ہے ان کا کلام بہت کچھ ضائع ہوگیا۔ جس کا غم احمدآباد کے اردو جاننے والوں کو ہمیشہ بے چین رکھتا ہے۔ اور وہ کف افسوس کے ملنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن اتفاق سے حکیم محمد اکبر صاحب کے پاس سے فخر صاحب کی ایک بیاض دستیاب ہو گئی۔ اور یہ قیمتی سرمایہ انھوں نے اردو ساہتیہ اکادمی گجرات کے حوالے کر دیا۔ اکادمی والوں نے بڑے اہتمام اور فخر سے ان کا مجموعۂ کلام کائنات فخر کے نام سے ۱۹۹۸ء میں شائع کیا۔ اور اردو ادب کا حق ادا کر دیا اور ساتھ ہی نئی نسل کو فخر صاحب سے روشناس کروا دیا۔ ۴۳

فخر صاحب کی زندگی بڑی پرسکون رہی آپ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ لہذا یہی اشعار ان کی یادگار ہیں۔ وہ بہت قادرالکلام شاعر تھے۔ زبان و بیان پر ان کی کافی دسترس تھی۔ عربی اور فارسی زبان سے خوب واقف تھے۔ عروض کے بڑے ماہر تھے۔ اردو اور فارسی کلاسیکی شاعری کا انھوں نے وسیع مطالعہ کیا تھا۔ سچ پوچھیے تو شاعری آپ کی فطرت ثانیہ تھی۔ احمدآباد کے اردو ادب میں ایک بلند قامت شخصیت کی حیثیت رکھتے تھے۔ اصناف سخن میں آپ نے تقریباً سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ جیسے مرثیہ، غزل، نظم، قطعہ، رباعی، منقبت وغیرہ وغیرہ ان کے مجموعے کلام کائنات فخر میں ان کے مراثی شامل کیے گئے ہیں جنھیں ''میخانۂ حسین'' کے نام سے شامل کیا گیا ہے۔ مجموعہ اعتبار سے فخر کے مراثی بہت ہی اعلیٰ ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں وہ خود بھی امام حسینؓ کے ورثہ میں سے تھے۔

اس زمانے میں فخر صاحب کا شمار عمائدین شہر میں ہوتا تھا۔ اور وہ بہت ہی معزز شخصیت کے مالک تھے۔ فخر صاحب کے وجہ سے شہر میں محفل سخن ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ ان کا حلقۂ احباب وسیع تر تھا۔ جو اکثر شعری نشستوں اور شاعروں کا انتظام کرتے تھے۔ فخر صاحب کا لب و لہجہ بے ساختہ تھا اور الفاظ کا برجستہ استعمال کرنا جانتے تھے۔ ان کے اشعار پیش ہیں۔

مبتلائے زلف ہوکر مانگ کیوں کی وصل کی
کیوں دل ناداں شکارِ پنجۂ شہ نہ ہوا

......

کیا زبانِ شمع کیا شعلہ بیانی دیکھ کر
سرد گفتارِ اجل خاموش پروانہ ہوا

......

جانتے ہیں فخؔر گجراتی کو سب اچھی طرح
شاعرِ خوش گو ہوا منشی و فرزانہ ہوا

......

فخؔر کہتے ہیں مجھے لوگ میں گجراتی ہوں
احمدآباد وطن ہے مرا آباد رہے

......

نشانہ جان کر میرے جگر کو
اِدھر ہی پھینک دو تیرِ نظر کو

......

حسینوں کو خدا نے حسن بخشا
رکھا چکّر میں خورشید و قمر کو

......

کیا سن بتاؤں نامہ رساں تجھکو یار کا
بچہ نہیں، وہ پیر نہیں، نوجواں نہیں

......

جام ہم میں ہے صراحی ہم میں ہے خم ہم میں ہے
رکھتے ہیں سینہ میں اک میخانے کا میخانہ ہم

......

الٰہی زندگی بھر کھیل سے فرصت نہ ہو ان کو
جو اپنے ہر کھلونے کو ہمارا دل سمجھتے ہیں

آسماں بھی میرا دشمن ہے زمیں بھی دشمن
ابر ہے برق ہے گلچیں بھی ہے صیاد بھی ہے

......

نہ بچ سکتا کبھی سحر بتانِ دہر سے لیکن
تمھارے اسمِ اعظم کا وظیفہ کر لیا میں نے

......

عبث برباد کی لہو و لعب میں زندگی ساری
بہت پچھتا رہا ہوں فخرؔ یہ کیا کر لیا میں نے ؎۴۴

......

جمیلؔ کلیمی

جمیلؔ کلیمی کے والد کا نام عبدالکریم کلیم تھا۔ وہ بھی قریش جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ شاعری انھیں ورثہ میں ملی تھی۔ احمدآباد کے خاص بازار میں ان کی کتابوں کی دکان تھی۔ شاعری اور یہ دکان انھیں ورثہ میں ملی تھی۔ کیونکہ خاص بازار کی یہ دکان ایک بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ جہاں روزانہ اردو والوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ پورے شہر کے شعراء اور ادباء اور ماہرین تعلیم یہاں آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بچپن ہی سے جمیلؔ کلیمی کو ادبی اور تہذیبی ماحول ملا۔ اسی دکان پر انھیں نامور شخصیتوں کا ساتھ ملا۔ جس کی وجہ سے جمیلؔ کلیمی میں بھی مطالعہ کرنے اور لکھنے کا رجحان بڑھا۔ خاص بازار میں الف کی مسجد کے سامنے ایک چھوٹا سے میدان تھا جو شوکت میدان کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہاں بہت سے جلسے ہوا کرتے تھے۔ چاہے وہ سیاسی سرگرمیوں کے ہوں یا ادبی مجالس۔ جس میں کارکن بھی شرکت کرتے تھے۔ ان لوگوں کی ملاقاتیں کلیم بک ڈپو پر ہوا کرتی جہاں ادبی سیاسی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ جن میں جمیلؔ صاحب بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ ؎۴۵

احمدآباد کے مضافاتی علاقوں میں مل مزدوروں کی ایک بہت بڑی بستی تھی اور

وہاں اردو والوں کی بڑی تعداد تھی۔ ان مل مزدوروں کے لیڈر جناب جکن خان نے جب احمدآباد، نڈیاد، کلول اور سورت کے مل مزدوروں کے لیے کتب خانے کھولے تب ان کی لائبریری کے لیے جمیل صاحب انقلابی اور ترقی پسند ادب کی کتابیں مہیا کرواتے اس طرح مل مزدور کی محبت میں جمیل صاحب بھی ترقی پسندوں میں شامل ہوگئے مرزا پور کی بزم قریش ہر سال ایک مشاعرے کا اہتمام کرتی تھی۔ جس میں ترقی پسند شعراء بہ خلاف روایتی طرز کے جدید اسلوب میں اپنا کلام پیش کیا کرتے تھے۔ اور جمیل کلیمی صاحب بھی اپنی شاعری سے سامعین کا دل موہ لیتے تھے۔ ۴۶؎

۱۹۴۴ء میں مسلم لیگ کا اثر بے حد بڑھتا چلا گیا۔ اور احمدآباد میں یہ حالت تھی کہ لیگ ایک طاقت ور پارٹی تھی۔ ساتھ ہی شوکت میدان کے چاروں طرف مسلم مکانات بسے ہوئے تھے۔ اس وقت کسی اور پارٹی کی اتنی حیثیت نہ تھی کہ وہ خاص بازار میں کوئی جلسہ منعقد کریں۔ اس وقت قومی تحریک سے متاثر نوجوانوں کے ساتھ کلیم بک ڈپو کے جمیل صاحب بھی اس پارٹی سے منسلک تھے۔ ان کا ایک وسیع حلقۂ احباب تھا۔ وہ خدمت خلق میں لگے رہتے تھے۔ اسی وجہ سے جمیل صاحب مرزا پور مسلم لیگ کے صدر منتخب کیے گئے۔ انجمن ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جمیل کلیمی صاحب وارث علوی، امین قریشی، میر قادری، زوار حسین اور تبسم مبارک پوری صاحب اس انجمن کے رکن بنے۔ انجمن کی ساری کارروائی خاص بازار میں سنہری مسجد کے پاس واقع ایک آفس میں ہوا کرتی تھیں۔ یہ کمیونسٹ پارٹی کے نام سے پہچانی جانے لگی۔ حکومت نے یہاں آنے جانے والے کی تمام ممبران کو شک کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا۔ سبھی کے نام پولیس درج کرتی تھی۔ جب گرفتاریاں ہوئیں تب احمدآباد سے جمیل کلیمی، احسان جعفری، وحید بنارسی، اشعر نوری اور عزیز جاوید کو بھی گرفتار کیا گیا۔ اور بڑودہ کی سینٹرل جیل میں ایک سال تک قید رکھا۔ ۴۷؎

جمیل صاحب بہت ہی سلجھے ہوئے خیالات کے آدمی تھے۔ انھوں نے قریش جماعت میں بھی بہت اصلاح کی۔ بچوں کی پیدائش، شادی کے موقع اور موت کے بعد

کے رسم و رواج پر ہونے والی فضول خرچیوں کو بند کروانے میں آپ نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور اپنی جماعت میں انجمن امداد باہمی کا قیام کیا۔ ساتھ ہی آل انڈیا قریش کانفرنس بھی منعقد کی۔

جمیؔل صاحب کو شعر وسخن کا بڑا ذوق تھا۔ اپنی تمام مصروفیات کے باوجود وہ ایک اچھے سخن ور تھے۔ ان کا کلام بمبئ اور دہلی سے شائع ہونے والے اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ماہنامہ شاعر جو سیمابؔ اکبرآبادی کے زیر ادارت آگرہ سے چھپتا تھا اس کے طرحی مشاعروں میں بھی حصّہ لیتے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں جمیل صاحب کا پہلا شعری مجموعہ 'لفظوں کا سفر' شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں ۱۹۶۰ء کے بعد کا ان کا منتخب کلام لیا گیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے بھی کلیم نے سینکڑوں غزلیں اورنظمیں لکھی تھیں۔ کلیم بک ڈپو پر محمد علوی، عادل منصوری، سرشاؔر بلند شہری وغیرہ جمع ہوتے اور جدید شاعری میں اپنی نئی غزلیں باہم سناتے رہتے۔ ان لوگوں سے متاثر ہوکر جمیؔل کلیمی نے بھی جدید رنگ میں کہنا شروع کر دیا تھا۔ جمیؔل کلیمی کے مجموعۂ کلام 'لفظوں کا سفر' سے کچھ منتخب اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔ [۴۸]

وہ دیکھ خون اگلتے بھری جوانی میں
غریب شہر جو پھرتے ہیں دربدر مارے

......

یا ہواؤں نے گرائے ہیں یہاں کانچ کے گھر
یا تیرے نقش کف پا سے چمکتی ہے زمین

......

کانچ کے گھر میں کبھی تم جھانک کر دیکھو جمیؔل
پھینکتا رہتا ہے ہر لمحہ وہ پتھر کون ہے [۴۹]

......

منصور ہوں نہ کوئی پیمبر مگر مجھے
سولی پہ بے قصور چڑھانے چلے ہیں وہ

......

ہر لمحہ مجھے غور سے وہ دیکھ رہا ہے
اندر مرے یہ میرے سوا کون چھپا ہے

......

سورج کو زیر کرنے کے کچھ کیجیے جتن
مہتاب کے نگر میں بہت سو لیے جناب

......

پڑھے گا کیسے بھلا میری زندگی کی کتاب
یہ شخص تو مجھے اندھا دکھائی دیتا ہے ۵۰

......

حسنؔ

سید حسن منشی باقر علی کے بیٹے تھے اور حسنؔ تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے والد صاحب سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا۔ اس لیے زیادہ تر مشورہ سخن بھی وہ اپنے والد سے ہی کیا کرتے تھے۔ وہ یہاں ولی ثانی کی حیثیت رکھتے تھے۔ اندازِ سخن بھی ولی سے مماثلت رکھتا تھا۔ بڑے پر گو شاعر تھے۔ ۵۱

نمونۂ کلام

گر گریہ کی طغیانی یہ دیدۂ نم پکڑے
پھر نوح کا طوفاں بھی جھک جھک کے قدم پکڑے

......

توصیف صنم اپنی لکھنے کے لیے یارو
پرواز کے پر کا جب ہاتھوں میں قلم پکڑے

کیجیے مجھ پہ کرم بہر خدا رات کی رات
بات کی بات میں گزاری ہے ملاقات کی رات
ایک تو ہجر کی شب دوسری زاری اپنی
اس طرح کی تو نہ دیکھی کبھی برسات کی رات
اہل مقبول شبِ قدر کو اور اہل جنون
ہجر کی رات کو سمجھے ہے مناجات کی رات
آفریں تجھ کو حسنؔ بعدِ ولی کے تونے
صبح مضموں سے مبدل کیا گجرات کی رات ۵۲؎

......

باقرؔ

منشی باقر علی باقرؔ احمدآباد کے صوفی شاہ عالم بخاری صاحب کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے بڑے بھائی کاظم علی کھیڑے کے فوجدار تھے۔ باقر نے بہت کم عرصہ احمدآباد اور کھمبات میں گزارا۔ ۱۸۸۲ء میں وہ بمبئ چلے گئے تھے۔ اور پھر عمر کا زیادہ تر حصّہ وہیں گزارا۔ بمبئ میں فداستیہ جی بھائی ایک مشہور پارسی خاندان تھا۔ یہ ان کے مصاحبین میں شامل تھے۔ شعر خوب کہتے تھے۔ اردو شاعری میں انھوں نے احمدآباد کو بڑی شہرت عطا کی ہے۔ ۵۳؎

نمونۂ کلام

جو اپنے لفظ سے اپنے شبنم کو گلعذار کرے
دہانِ غنچہ صبا کیوں نہ بخیادار کرے

......

ہم کو یہ منظور ہی ہووے اگر دیکھنا
زلف و رخِ یار کا شام و سحر دیکھنا
تیری میری ہے یہی شرطِ محبت کے تو
ہوتے میرے غیر کو نہ آنکھ بھر کر دیکھنا

موتی کا بالا تیرا دیکھ کر رخسار پر
پھول کے میں بول اٹھا شمس و قمر دیکھنا
باؔقر اگر ہوں میں تو مر کر گروں کا یہیں
کہنے پہ موقوف کیا ہوگی خبر دیکھنا

......

رسؔوا

مرزا عبداللہ بیگ بن قائم قلی خان اپنا تخلص رسؔوا کرتے تھے۔ احمدآباد میں وہ ایک صوبیدار کے دیوان بھی رہ چکے تھے۔ دھولکہ اور پیٹلاد میں ان کی جاگیریں تھیں۔ ان کے خاندان کے کئی افراد جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانے میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ رسؔوا نے حضرت بڑا صاحب خدانما سے بیعت کی تھی۔ اور انھیں سے کسب باطنی حاصل کیا تھا۔ بڑے ہی خدا رسیدہ آدمی تھے۔ آخری عمر میں خوف خدا اس قدر طاری تھا کہ ایک دن مارے ندامت سے اپنا دیوان غرق آب کر دیا تھا۔ بمشکل تمام ان کے چند اشعار حاصل ہو سکے ہیں۔

نمونۂ کلام

بستان دل کے اندر گلزار ہیں تو ہم ہیں
اشجار ہیں تو ہم ہیں اثمار ہیں تو ہم ہیں
ہے عندلیبِ بے نطق اس گلشن جہان میں
اس عین لامکاں کے مختار ہیں تو ہم ہیں [۵۴]

......

ظفؔر

سید ظفر حسین بن سید غلام رسول نقوی ظفؔر تخلص کرتے تھے۔ یہ احمدآباد کے قطبی بخاری تھے۔ انگریزی فوج میں میر منشی کے عہدے پر عرصۂ دراز تک فائز رہے۔ اس کے بعد وہ کراچی کے قریب بندرگاہ میں فوجداری کے عہدے پر معمور ہوئے۔ جب

سندھ کو علاقۂ بمبئی میں الحاق کیا گیا تھا ظفر صاحب دھولکہ، چھکلی وغیرہ گجرات کے اضلاع میں فوجداری کے عہدے پر ملازمت کرتے تھے۔ ملازمت سے دستبردار ہونے کے بعد انھوں نے گجرات کی طرف توجہ کی اور اپنا زیادہ تر وقت کاشتکاری میں گزارا۔ ۱۸۸۳ء میں ساٹھ سال کی عمر میں یہیں گجرات میں انتقال کیا۔ انھوں نے زیادہ تر اشعار مداحِ اہلبیت میں کہے ہیں۔ ظفرؔ صاحب کو فارسی نثر نویسی اور تاریخ دانی میں بھی مہارت حاصل تھی۔

نمونۂ کلام

امت جو پیاری تھی رسولِ دوسرا کی
شبیر نے پیارا نہ کیا جان و تن اپنا
کشتوں کے یہ پشتے کیے سرور نے کہ ان میں
پھر منہ نہ بتاتا تھا کوئی تیغ زن اپنا
اکبر کو دِکھا کہتے تھے حضرت رفقا سے
پہنچے گا جو میدان میں یہ صف شکن اپنا
چھ لاکھ میں یا اس سے فزوں لشکر اعدا
پر رخ نہ بتا دے گا کوئی فیل تن اپنا ۵۵

......

کمترؔ

سید سراج الدین عرف باوا میاں قادری نام تھا اور کمترؔ تخلص کرتے تھے۔ ۱۸۵۰ء میں احمد آباد کے قریب ویرم گام میں پیدا ہوئے تھے۔ اس خاندان کے بزرگوں میں سید شاہ تاج الدین اور شاہ قمیص بہت بڑے صوفی حضرات گزرے ہیں۔

کمترؔ نے اردو فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی تھی اور سرکاری ملازمت پر فائز تھے۔ حکومت برطانیہ نے انہیں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا تھا۔ ریاست رادھن پور میں وہ چیف جج کی حیثیت سے رہے۔ کچھ دنوں بعد رادھن پور ہی میں دیوان کی حیثیت

سے خدمات انجام دیتے تھے۔ اس کے بعد وہ احمدآباد چلے آئے یہاں انھوں نے اپنی باقی عمر گزار دی وہ ہر ماہ کی گیارہویں کو نیاز کرتے تھے۔ وہ بہت بڑے بخیر تھے۔ ان کے گھر سے شاید ہی کوئی سائل خالی جاتا ہو۔ ۱۹۱۱ء میں گیارہ نومبر کو سید صاحب کا انتقال ہوا۔ وہ احمدآباد میں رائے کھڑ ہی میں ان کی کوٹھی کے باغیچے میں مدفون ہیں۔

کمترؔ کو شاعری سے بہت شغف تھا۔ وہ زیادہ تر نعت کہتے تھے۔ ان کے کلام (۱) میلاد نامہ (۲) امداد پیغمبری (۳) پیغام مہجوری (۴) فروغ ایزدی (۵) فروغ دل (۶) عطائے خیرالمرسلین التحفہ جیسے چھوٹے چھوٹے مجموعۂ کلام جمع کیے گئے اور شائع ہو چکے ہیں۔

نمونۂ کلام

کبھی اے دل انھیں ڈھا کر عدو کا گھر دکھا دینا
تماشا ضبط کا اے صبر کے خوگر دکھا دینا
تمھارے دوست ہی تو دیکھتے ہیں آنکھوں سے ورنہ
خدا دشمن کو تو بدلے ہوئے تیور دکھا دینا

......

مرحبا مرحبا زہے دیوان جس میں اشعار نعتیہ ہیں سبھی
ہیں مصنف جناب باوا میاں یہ چہارم کتاب ان کی چھپی

......

نعت گوئی کا شوق ہے ان کو اہل شعراء میں ہیں فہیم و ذکی
نئے مضموں نئی تلاش ہر اک نظم مرغوب بندشیں اچھی ۵۶

......

نسیم

منشی امیر میاں نسیم تخلص کرتے تھے۔ یہ احمد آباد کے ایک معزز گھرانہ فاروقی خاندان سے تھے۔ ان کی ولادت ۱۸۱۰ء میں ہوئی۔ وہ احمدآباد کے پرائمری اسکول

میں مدرسی کے عہدے پر فائز تھے۔ اپنی ملازمت کے آخری ایام میں وہ احمدآباد کے زنانہ پرائمری پریکٹسنگ اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے اور بعد میں ترقی کرتے ہوئے ڈپٹی انسپکٹر بن گئے تھے۔

نسیم صاحب کو اردو فارسی اور گجراتی تینوں زبانوں سے بڑا شغف تھا۔ انھوں نے مولانا روم کی مثنوی کے چند حصے گجراتی زبان میں بھی ترجمہ کیے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک پرچے میں گجراتی پر عربی فارسی کے اثرات کے عنوان سے اپنے خیالات واضح کیے ہیں۔ وہ بہاؔر کے شاگرد تھے۔ اور انھیں سے اصلاح کلام کرواتے تھے۔ افسوس ان کا کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ ۵۷

☆

بڑوده

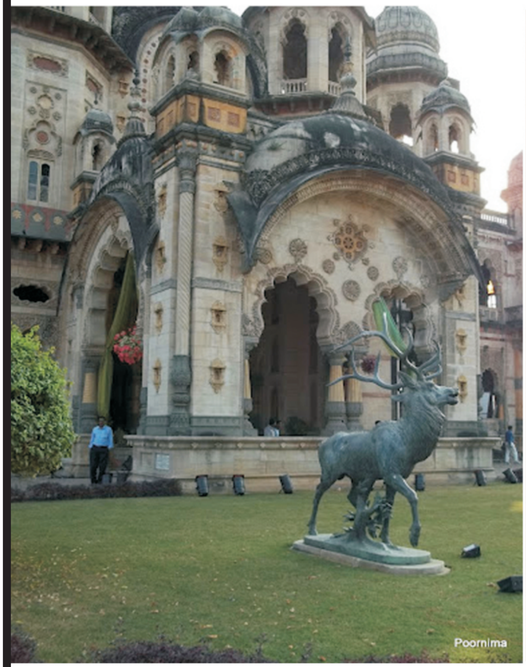

بڑوده کا قلعه

مہاراجه سیاجي راؤ (بچپن)
بڑوده

مہاراجه سیاجي راؤ
بڑوده

مکر پوره کا قلعه بڑوده

بڑودہ

بڑودہ کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرنے سے پہلے ایک بار پھر گجرات کے تاریخی سیاسی حالات پر غور کرنا ہوگا۔ ہندوستان میں مغل حکومت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ ملک کے مختلف حصّوں میں چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستیں قائم ہونے لگی تھیں۔ تاریخ اس دور کو ایک بار پھر دہرا رہی تھی۔ عظیم ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ہوئی تھی اس وقت کے سیاسی حالات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ تمام ہندوستان میں راجپوتوں کی حکومتوں کے چھوٹے چھوٹے حصے ہو گئے تھے۔ ہندوستان اسی طرح کئی ریاستوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ تمام راجے مہاراجے آپس میں خانہ جنگیاں کرتے رہتے تھے۔ کوئی ایک مضبوط اور مسبط حکومت نہیں تھی۔ ٹھیک اسی طرح مغلوں کی حکومت کا سورج غروب ہو رہا تھا۔ شمالی ہند کو چھوڑ کر گجرات سے لے کر دکنی ہندوستان پر نظر ڈالتے ہیں تو سیاسی حالات میں بڑا خلفشار نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں جہاں بہت سی ریاستیں قائم ہونے لگیں تھیں ان میں مراٹھا حکومت بھی تھی۔ شیواجی نے اپنی حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے دکن کی سنگلاخ پہاڑیوں میں جس حکومت کی بنیاد ڈالی اس کے حکمرانوں میں بھی خانہ جنگیاں شروع ہو چکی تھیں یہاں پیشوا اور گائیکواڑ دو مقابل حکومتیں تھیں جو ایک دوسرے کو زیر و زبر کرنے میں مصروف تھیں۔ ۵۸؎ ادھر انگریزوں کا غلبہ ہندوستان میں آہستہ آہستہ قائم ہو چکا تھا۔ ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو سبھی محسوس کر رہے تھے اور ان سے خوفزدہ بھی تھے۔ اس وقت بڑودہ میں بابی حکومت تھی۔ دوسری طرف مغلوں کی طاقت تھی جو اگر چہ بہت کمزور ہو چکی تھی پھر بھی گجرات میں اس کی ایک حیثیت قائم تھی کیونکہ یہاں نظام الملک نے اپنی آزادی کا پرچم بلند کر رکھا تھا۔ ۵۹؎ گائیکواڑ کو ان قوتوں سے نبرآزما ہونا پڑتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا دشمن شیواجی تھا جو گائیکواڑ حکومت کے لیے سر درد بنا ہوا تھا۔ گائیکواڑ کا ایک اور زبردست دشمن خاندان نے اس وقت عروج پایا

جب شیر خان کا لڑکا صفدر خان یابی کڑی اور پٹن کا حاکم تھا۔ ۱۶۸۰ء میں شیواجی کی وفات کے بعد ان کے پوتے نے شاہو کا لقب اختیار کیا اور دوبارہ اپنی حکومت قائم کرنے کی سعی کی۔ اس نے اورنگ زیب کی زیرنگرانی تربیت پائی تھی۔ شاہو کا ایک دشمن راجا رام کولھاپور میں موجود تھا۔ شاہو نے دکن کے حاکم داؤد خان کی مدد سے یہ حکومت حاصل کر لی اور ادھر نظام حیدرآباد دکن نے پیشوا کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر مرہٹوں کی مدد سے برار میں شکست دی۔ اس جنگ کے نتیجے میں داماجی گائیکواڑ کو آصف خان کی طرف سے شمشیر بہادر کا خطاب ملا۔ ۶۰؎ داماجی کے بعد اس کے بیٹے پیلاجی نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ پیلا جی گائیکواڑ نے حکومت کو بہت مضبوط کیا۔ یہ چھوٹی چھوٹی حکومتیں جو مغلوں سے مدد طلب کرتی تھیں۔ اب مراہٹوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے لگیں۔ چنانچہ والیانِ گجرات خاندان بابی قائم رہے۔ مومن خان، اجیت سنگھ صوبیدار مارواڑ وغیرہ سبھی گائیکواڑ کے دوست ہو گئے۔ اب بھی گائیکواڑ کے لیے۔ پیشوا سردرد بنا ہوا تھا۔ اور اس کے علاوہ کئی اور لوگ بھی تھے جو گاہے بہ گاہے مراہٹوں کے سامنے اپنا سر اٹھاتے تھے۔ ریاکاری سیاسی چالیں، فوج کی غداری یہ تمام حربے استعمال کیے جا رہے تھے۔ ادھر احمد خان نے پیلا جی سے سازباز کر لی اس نے دریا مہی کے شمالی پرگنوں کی چوتھ کنبائی کو جنوبی پرگنوں یعنی بڑودہ، چانپانیر، بھروچ اور سورت کا اختیار پیلاجی کو دیا اور اس طرح پہلی بار پیلاجی کے عہد میں بڑودہ میں مراٹھوں کا تسلط قائم ہوا۔ ۶۱؎ لیکن سربلند خان نے ایک بار پھر احمدخان اور تمام مراٹھا طاقتوں سے گجرات کو خالی کروا لیا۔ اس کے لیے اس نے جودھ پور کے راجا اَبھے سنگھ اور بابیوں سے مدد حاصل کی تھی۔ لیکن پیلا جی کی وہ سرکوبی نہ کر سکے۔ اور اسے خراج ادا کرنا پڑا۔ مراٹھوں میں ایک طرف گائیکواڑ اور دوسری طرف پیشوا کی زبردست طاقتیں تھیں۔ اس دوران پیلا جی کی کئی بار جھڑپیں ہوتی رہیں۔ اس اثناء میں کئی مختلف جنگوں کے بعد گائیکواڑ کی حالت ابتر ہوتی گئی اور پیلا جی جو ریاست گائیکواڑ کا بانی تھا اس کو ابھے سنگھ نے دھوکے سے قتل کروا دیا اور بڑودہ پر قبضہ کر کے وہاں کا حاکم مشیر خان بابی کو مقرر کر دیا۔ بعد میں پیلا

جی کے بھائی مادھاجی نے دوبارہ بڑودہ کی حکومت حاصل کر لی۔ اور بڑودہ گائیکواڑ حکومت کا دارالسلطنت قائم رہا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ گائیکواڑ اور پیشوا دونوں نے آپس میں صلح کر لی اور منظّم طریقے سے مغل حکومت کے سامنے کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا۔ ۶۲ ۱۷۵۳ء میں داماجی، رگوناتھ، ہولکر، جیاجی راؤ سندھیا اور وٹھل وغیرہ مراٹھوں نے مل کر احمدآباد پر حملہ کیا اس وقت جوانمرد خان بابی شہر کا محافظ تھا۔ اس نے بڑی جوانمردی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ لیکن ان لوگوں نے شہر کو محصور کر رکھا تھا۔ مجبوراً شہر کو مراٹھوں کے حوالے کرنا پڑا۔ اس طرح مراٹھوں نے گجرات میں مغلوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس دوران میں انگریزوں کی کھٹ پٹ جاری تھی وہ موقع محل کے انتظار میں تھے اور مراٹھا حکومت پر ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ ۳۰ اپریل ۱۸۰۵ء میں ملکی انتظامات میں انگریز پوری طرح داخل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ پیشوا کا اثر بڑودہ میں بالکل ختم ہو گیا۔ اب مہاراجہ بڑودہ کا تقرر انگریزوں کی مرضی سے ہونے لگا۔ ۶۳ ملکی سیاست پر انگریزوں کی بالادستی قائم ہو گئی۔ انگریز انھیں صرف ظاہری دوست مانتے۔ جی چاہتا وہ موضع ضبط کر لیتے تھے۔ مہاراجہ کھانڈیراؤ کے زمانے سے ہی بڑودہ میں امن و سکون کی ابتداء اور تہذیبی آثار کی بنیاد پڑی ہے۔ جس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ ۱۸۵۹ء جنگ آزادی میں مہاراجہ کھانڈیراؤ نے انگریزوں سے کچھ تعارض نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ حیدر علی اور ٹیپو سلطان جیسے بہادر لوگ انگریزوں کو مغلوب نہ کر سکے تو گائیکواڑ کیسے کر سکتے ہیں۔ گائیکواڑ انگریزوں کے وفادار تھے اسی لیے مہاراجہ کھانڈیراؤ کی وفاداری کے صلے میں برٹش گورنمنٹ میں ایک حکم نامہ بھی جاری کیا تھا۔ جس میں گائیکواڑ حکومت کے لیے بہت سی آسانیاں تھیں۔ مہاراجہ کھانڈیراؤ غوث الاعظم محبوب سبحانی جیلانی کا بڑا معتقد تھا۔ انھیں وہ اپنا پیر مانتا تھا۔ انھوں نے گیارہویں شریف قائم کی تھی۔ چاند کی ہر گیارہ تاریخ کو پلاؤ زردہ پکتا تھا۔ ۶۴ یہ رسم مہاراجہ سیاجی راؤ سوم اور ان کے بعد مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں بھی کچھ دنوں تک قائم رہی۔ مالیاتی خرچ کے لیے صرافے کی دو دکانیں قائم کی تھیں ایک کا نام قطب ربانی اور دوسرے کا نام محبوب سبحانی

رکھا تھا۔ ریاست میں امن و سکون قائم کیا تھا۔ رعایا خوش تھی ملک کی پیداوار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ کھانڈیراؤ نے تقریباً ۱۴ سال تک حکومت کی تھی۔

کھانڈیراؤ کا جانشین ملہار راؤ انگریزوں کا سخت مخالف تھا۔ لیکن ہندوستان میں سیاسی حالات ایسے ہو چکے تھے کہ انگریزوں کی اطاعت قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ آخرکار برٹش گورنمنٹ نے اس پر کچھ الزامات لگائے اور معزول کر دیا۔ مہاراجہ سیاجی راؤ سوم کا زمانہ بڑودہ کا سنہرا دور ہے۔ مراٹھا تاریخ میں بڑودہ کی تمام علمی، ثقافتی، تہذیبی اور معاشی ترقیاں اسی دور کی مرہون ہیں۔ تاریخ بڑودہ پر نظر ڈالنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۱۷۳۴ء سے ۱۸۵۷ء تک کا زمانہ انتہائی سیاسی بے چینی کا زمانہ ہے۔ جس میں تہذیب و ثقافت کی طرف توجہ دینا حکمرانوں کے لیے ناممکن تھا۔ مسلمانوں کی زبوں حالی اور ان کی ناخواندگی کو دور کرنے کے لیے سب سے پہلے مہاراجہ سیاجی راؤ نے نمایاں کوششیں کی تھیں۔ ۶۵

مہاراجہ سیاجی راؤ نے تعلیم کی طرف خاص توجہ دی ان کا حکم تھا کہ جس گاؤں میں کم از کم سولہ لڑکے جمع ہوسکیں وہاں ایک مدرسہ قائم کیا جائے۔ مولوی فریدالدین استادِ فارسی بڑودہ کالج ضمیمہ کتاب سلطاطین بڑودہ میں لکھتے ہیں۔

ایک نقطۂ خاص بلا لحاظ بہ رعایت قومی و مذہبی قابل دید ہے وہ یہ کہ یہاں کے مسلمان مثل ہندوستان کے اور مقامات کے تحصیل علمی میں ہر مذہب اور ہر قوم کی بہ نسبت پست ہمت تھے۔ صرف انھیں کی تعلیم کی غرض سے اردو اسکول جاری فرمائے۔ چنانچہ مدارس میں بالادخال کی فیس زبان اردو اور گجراتی کی تعلیم ہوتی تھی۔ اس قسم کے ۳۰ مدرسے موجود ہیں۔ ۲۶ مردانے اور ۴ زنانے۔ ۶۶

تعلیم نسواں کے لیے بہت سے مدرسے کھولے گئے جس میں خطاطی، زردوزی، سوزن کاری، موسیقی و طباخی وغیرہ کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا۔ کلا بھون قائم کیا گیا۔ جس میں مختلف قسم کی صنعت و حرفت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان میں جدید ترین آلات کا استعمال شروع کیا گیا۔ غرض یہ کہ سیاسی سکون ہونے کی وجہ سے سماج کے

ہر طبقے کی ترقی کا دھیان رکھا گیا۔ مہاراجہ سیاجی راؤ دوراندیش اور مردم شناس بھی تھے۔ ساتھ ہی وہ اہل ہنر کے قدردان بھی تھے۔ بڑودہ حکومت کی ترقی میں ان کے لائق و فائق وزیر کا بڑا عمل دخل تھا۔ ۱۹ ویں صدی کا یہ نصف عرصہ بڑے ہی عجیب و غریب ماحول سے گزر رہا تھا۔ اگر کہیں سکون میسر تھا تو صرف بڑودہ میں کچھ پرسکون ماحول تھا۔ جبکہ شمالی ہند میں انتشار اور خلفشار کے سوا کچھ نہ تھا حکومتیں پلٹ چکی تھیں اہل ہنر دربدر مارے پھر رہے تھے۔ انھیں ایسے سرپرست کی تلاش تھی جہاں وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرسکیں اور یہ بات اس وقت گجرات میں حکومت بڑودہ میں نظر آتی تھیں۔ ۶۷ے

اس وقت شہر بڑودہ نے ہنرمند لوگوں کے لیے اپنے دروازے کھول دیے۔ سیاجی راؤ نے ایسے اہل علم اور ہنرمندوں کی بڑی قدردانی کی۔ شعراء حضرات نے بھی یہاں اپنی محفلیں سجائیں اور ہر طرف زبان وقلم کے جوہر چمکنے لگے۔ کئی بار شعراء کے دلچسپ معرکہ بھی ہو جاتے تھے۔ مولانا محمد علی جوؔہر بھی یہاں کچھ دنوں ملازم رہے۔ ثاقبؔ بدایونی، احتشام حسین جادو، سید جمیل الدین اور افسر مودودی اس انجمن کی جان تھے۔ ضیم وارث علی عرف حبشی یہاں اور حکیم کاظم علی اپنے فن میں نادرۂ روزگار حیثیتوں میں سے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ادب کی یہ محفل خوب جمے گی اور گجرات میں شاعری کو پھر کوئی زبردست رنگ و آہنگ ملے گا۔ ۶۸ے

جب کوئی حاکم اپنے رعایا کا خاص طور سے خیال رکھتا ہے اور اہل ہنر کی قدردانی کرتا ہے تو وہاں کے رؤسا اور امراء بھی اسی بات پر عمل پیرا ہوتے ہیں اس طرح بڑودہ میں بھی وہاں کے خاندانوں نے عالموں اور ادیبوں کی قدردانی کی۔ ان میں خاص کر بڑودہ کا نواب خاندان سرفہرست ہے۔

بڑودہ کا نواب خاندان

۱۵۰۰ء میں اس خاندان کے ایک بزرگ عربستان سے ہرات آئے اور ہرات سے ۱۶۰۰ء میں اسی خاندان کے ایک فرد ہندوستان میں تشریف لائے۔ یہ زمانہ مغلوں

کی حکومت کا زمانہ تھا۔ نواب خاندان کے ان حضرات کو حکومت مغلیہ میں اعلیٰ منصب حاصل تھا۔ اس خاندان کے چشم و چراغ نواب نورالدین حسین خان ۱۷۸۰ء یعنی ۱۱۹۴ھ میں نواب غازی الدین کے ہمراہ حج بیت اللہ جاتے ہوئے سورت آئے۔ سورت میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے غزی الدین سے گزارش کر کے اپنی کمپنی میں لے لیا اور اپنا وکیل بنا کر پیشوا کے دربار میں بھیجا نواب موصوف کے سات بیٹے تھے۔ ایک بیٹا نواب فخرالدین پیشوا کے دربار میں پیشکار تھے۔ دوسرے نظام الدین تھے۔ جنھیں نظام علی خان آصف جاہ کے عہد میں پنج ہزاری خطاب نظام نواز جنگ بہادر اور قلعہ داری حاصل تھی۔ یہ حضرت شاعر بھی تھے۔ انھوں نے گجرات میں نوساری کے مقام پر انتقال کیا۔ تیسرے بیٹے نواب نصیرالدین سلطان نواز جنگ تھے۔ نصیرالدین کو گووند راؤ گائیکواڑ پونا سے بڑودہ لائے تھے۔ نصیرالدین ایک نمائندہ کی حیثیت سے پیشوا کے مقابلے میں گائیکواڑ کی طرف سے احمدآباد بھیجے گئے تھے جہاں ۱۷۹۹ء میں وہ جنگ میں شہید ہو گئے۔ چھوٹے بیٹے میر کمال الدین حسین خان تھے۔ یہ ناگپور میں بھونسلے کے دربار میں منصب دار تھے۔ نصیرالدین کے انتقال کے بعد مہاراج گائیکواڑ نے میر کمال الدین کو بڑودہ بلا کر منصب و جاگیرداری عطا کی۔ پانچویں بیٹے صدرالدین یاور الدولہ اورنگ آباد کے صوبیدار بنے۔ چھٹے بیٹے اور ساتویں میر صرف الدین اور جمال الدین خان تھے۔ اس خاندان کے لوگ ریاست گائیکواڑ کے بہت وفادار تھے۔ کمال الدین بن نورالدین کے بعد ان کے بیٹے میر امین الدین جانشین ہوئے۔ یہ شاعر تھے اور نصیریؔ تخلص کرتے تھے۔ امیر امیرالدین کی کئی اولادیں تھیں۔ لیکن زندہ نہ رہیں لہٰذا ان کے انتقال پر ۱۸۳۷ء میں ان کے بھائی حسام الدین جانشین ہوئے۔ ان کے بعد میر کمال الدین دوم ان کے منصب پر فائز ہوئے۔ ۶۹ے

اس خاندان میں اورنگ آباد کے صوبیدار کی اولادوں میں سے صدرالدین حسین اپنے وقت کے اچھے شاعر گزرے ہیں۔ نواب موصوف کا صدرؔ تخلص تھا۔ یہ حالیؔ کے زیر اثر اصلاحی نظمیں کہتے تھے۔ قوم کی اصلاح کا انھوں نے بڑا کام کیا ہے۔

انھوں نے تقریباً ۱۰۰ چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کروائے۔ جس کا مقصد قوم کی اصلاح تھا۔ ان کی تصانیف بڑودہ کی جامع مسجد لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں نواب صاحب نے وفات پائی۔ ان کی اولاد میں امین الدین معزالدین و فخرالدین تین بیٹے تھے۔ یہ تینوں وفات پا چکے ہیں۔ صدرالدین ریونیو کلکٹر تھے۔ معین الدین مہاراجہ بڑودہ کے مصاحبوں میں تھے۔ فخرالدین امریکہ سے میڈیکل کی ڈگری لے کر آئے تھے۔ فخرالدین نیشنلسٹ تھے۔ صدرالدین کی ایک بیٹی کی شادی احمدآباد کے سید مصطفیٰ حسین قادری حامد میاں دیوان کے بیٹے سے ہوئی تھی۔

نواب کمال الدین دوم کے بعد ان کے بیٹے جانشین ہوئے۔ ۱۹۳۰ء کے آس پاس ان کا انتقال ہوا ان کے بعد نورالدین جانشین ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۵۲ء میں انتقال کیا۔ اس نورالدین کے فرزند کا نام مظہرالدین تھا۔ ۷۰

میر صاحب کا خاندان

میر سرفراز علی بن ممتاز علی ذوالفقار علی بن روشن علی سہسوان ضلع بدایوں سے بڑودہ آئے تھے۔ میر صاحب سہسوان کے مودودی چشتی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان کے چند بزرگ سید روشن علی سید اکبر علی آخری شاہان مغلیہ کے زمانے میں بہت باا‌ثر شخصیتیں گزری ہیں۔ میر سرفراز علی نے اپنی سیاحت دانی اور فوجی لیاقت کی وجہ سے سرکار گائیکواڑ بڑودہ میں اسلحہ دار سردار کا درجہ حاصل کیا تھا۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھی معتمد اور خیرخواہ تھے۔ گائیکواڑ اور کمپنی کے درمیان سفارتی خدمات بھی انجام دیتے تھے۔ موصوف کی شادی بڑودہ کے نواب خاندان میں ہوئی تھی۔ میر صاحب نے عبدالقادر سورتی جمعدار نے اپنی حویلی کی زمین سے ایک قطعہ بعوض قیمت دیا تھا۔ جس پر انھوں نے حویلی تعمیر کروائی تھی جو میر صاحب کے باڑے کے نام سے بڑودہ رامپور میں مشہور تھی۔ ۷۱

میر سرفراز علی کے تین بیٹے میر اکبر علی سید جعفر علی اور میر باقر علی تھے۔ سید علی اپنے وقت کے اسلحہ دار نامزد کیے گئے۔ میر جعفر علی سورت کے نواب افضل الدولہ کے

داماد تھے۔ جو نواب صاحب کے بعد ان کے جانشین مقرر کیے گئے تھے۔ اکبر علی کا ۱۸۶۰ء میں انتقال ہوا۔ ان کے بیٹے میر ابراہیم علی وفا جانشین ہوئے۔ وفا چچا میر جعفر علی کے زیر تربیت تھے۔ لہٰذا سورت میں منشی لطف اللہ فریدی سے عربی، فارسی، انگریزی تعلیم پائی تھی۔ ۱۸۵۵ء میں وفات پائی ان کے بھائی عالم علی غالب کے شاگردوں میں سے تھے۔ وفا بہت وضع دار شخص تھے۔ ان کو لحن داؤدی و دیعت تھا۔ یہ ہر مہینے اپنے گھر پر مجلس میلاد منعقد کرتے اور خود قصیدے پڑھتے۔ ان کی قصیدہ خوانی کی شہرت لکھنؤ تک پھیلی تھی۔ ان کی شادی بڑودہ کے ایک معزز خاندان میں ہوئی تھی۔ اولاد میں چار بیٹے میرا احتشام علی جادؔو، میر ناصر علی، میر یوسف علی اور میر محمود علی تھے۔ ۲؎

جادؔو بھی اچھے شاعروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ جادؔو کے فرزند میر انتظام علی گائیکواڑ کے سرداروں میں سے تھے۔ انتظام علی کے بیٹوں میں راشد علی محبوب علی اور آصف علی تین بیٹے ہیں۔

بڑودہ میں اردو کی ترویج کا ذکر کریں تو مندرجہ بالا خاندانوں کے علاوہ کئی حضرات اور بھی ہیں جنھوں نے بڑودہ میں اردو زبان و ادب کی خدمت کسی نہ کسی طرح کی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خود تو شاعر اور ادیب نہیں تھے پھر بھی شاعری کی ترویج و اشاعت میں نمایاں کام کیا ہے۔

مولوی نجم الدین یہ بڑودہ کے مہدوی فرقے کے پیشوا تھے۔ انھوں نے حیدرآباد میں تعلیم حاصل کی اور بڑودہ میں اپنے فرقے کی روحانی، تعلیمی اور سماجی رہبری کے لیے مقرر ہوئے۔ ان کی مادری زبان اردو تھی۔ اس لیے اپنے حلقے میں ان کی ساری خدمات اردو زبان کی توسط سے ہوتی رہی ہے۔ وہ مختلف امور میں صاحب فکر تھے۔

مولوی عباس ندوی سلیمانی بوہرہ جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مولوی شاکر ضؔیا کی زندگی میں انھیں کی رہنمائی میں اپنے حلقے میں اردو کی خدمات انجام دیتے رہے۔

تاعمر اردو کے لیے کام کرتے رہے انھوں نے مولوی شاکر ضیاؔ کے منتخب شعری کلام کو ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ ۳ے

طیب جی انھوں نے بڑودہ کے مسلمانوں کے سبھی فرقوں میں تعلیمی اور سماجی ترقی کی خاص توجہ کی ہے وہ آئی اے ایس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنا سارا وقت سماجی بہبود کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اردو کی ترویج و اشاعت میں خصوصی دلچسپی لی۔ یہ بھی سلیمانی بوہرہ جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔

۲۰ ویں صدی کے اوائل میں گجرات میں بڑودہ بھی اردو شاعری کا ایک مرکز بن گیا تھا۔ نورالدین فائق کا جمع کردہ تذکرۂ مخزن الشعراء میں ہمیں یہاں کے شعراء حضرات سے متعلق معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اس تذکرہ کو انجمن ترقی ہند نے شائع کیا ہے۔ اس کا مقدمہ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ چند شعراء حضرات پر بعض اہل قلم نے طویل یا مختصر مقالے لکھے ہیں۔ گجرات کے جن شعراء حضرات کو غالبؔ کا تلمذ حاصل تھا ان کے شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ یہاں موجود تھا۔ ان کی وجہ سے یہاں شاعری کا بازار گرم تھا۔ اس دور میں یہاں لکھنؤ کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جاتے تھے۔ میاں داد خان سیاحؔ غالبؔ کے شاگرد تھے۔ لیکن انھیں لکھنؤ کی صحبتیں راس آئیں وہ زیادہ تر اشعار اس وقت کے لکھنؤ کے رنگ میں کہتے تھے۔ ۴ے 'جلوۂ یار' اور 'پیام یار' کے پرچوں میں گجرات اور لکھنؤ کے شعراء کے کلام بھی چھپتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ جلالؔ اور داغؔ کا سکہ چلتا تھا۔ گجرات میں عام طور سے شعراء نے یہی رنگ قبول کیا تھا۔ بڑودہ میں اردو شاعری کے رواج پانے سے سورت کو اردو شاعری کے اعتبار سے مرکزی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ غالبؔ کے شاگرد فدا اپنے وطن سہسوان سے آ کر سورت ہی میں پہلے مقیم ہوئے تھے۔ اور غالباً یہیں غالبؔ سے ملاقات ہوئی تھی بعد میں جب فداؔ بڑودہ آئے تو وہ اور ان کے معاصر شعراء نے اردو شاعری کا چمن کھلا دیا۔ ۵ے

فدؔا

حکیم سید احمد حسن مودودی فدؔا اور جماؔلی تخلص کرتے تھے یہ حکیم میر سرفراز علی صاحب سہسوانی کے عزیزوں میں سے تھے۔ فدؔا سہسوان سے سورت اور سورت سے بڑودہ آئے تھے۔ ان کے ایک عزیز میر محمد علی زمیندار و مجسٹریٹ سہسوان کا بیان ہے کہ موصوف حاذق طبیبوں میں سے تھے۔ بڑودہ میں مطب کرتے تھے۔ ۱۳۰۳ھ میں انتقال ہوا۔ ان کے فرزند اکبر الحاج حکیم حافظ سید محمود حسن بھی شاعر تھے اور افسؔر تخلص کرتے تھے۔ فدؔا نے ۱۹۰۵ء میں تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ۷۶

فدؔا ان خوش نصیبوں میں سے تھے۔ جنھیں غالؔب کا شرف تلمذ حاصل تھا۔ غالب کے ایک خط بنامِ احمد حسن قنوجی ۲۱ ستمبر ۱۸۶۰ء میں پتہ چلتا ہے کہ فدا حکیم احمد حسین قنوجی کی وساطت سے ۱۸۶۰ء میں غالؔب کے شاگرد ہوئے فدؔا کے نام غالؔب کے گیارہ خط ہیں۔ فدؔا نے کسی ایک خط میں غالؔب کو قبلہ یا کعبہ لکھا ہوگا جس پر غالؔب نے انھیں متنبہ کیا تھا کہ یہ سوئے ادب ہے۔ میر ابراہیم علی اور میر عالم علی فدؔا کی وساطت سے غالب کی زمرۂ تلامذہ میں شامل ہوئے تھے۔ ایک خط میں غالب نے اپنی کبر سنی کی وجہ سے اصلاح سے معذرت لکھی ہے۔ مگر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں شکایت پائی جاتی ہے کہ آپ کی غزلیں برستی ہیں کہاں تک دیکھوں۔ ایک روز میر ابراہیم علی خان نے فدا کے ذریعہ ۱۰۰ روپے غالب کے نام بھیجے ہوں گے۔ شاید فدؔا نے کئی بار اس کی رسید کے لیے یاد دلایا ہوگا جس کا ذکر غالؔب کے خط میں اس طرح ملتا ہے۔ ۱۰۰ روپے کے نوٹ کی رسید ۱۰۰ بار مانگتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب بہت پُرگو تھے۔ مگر افسوس کہ ان کے خاندان کے لوگوں سے بھی ان کا کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ تھوڑا سا کلام میر ابراہیم علی وؔفا کے مجموعۂ کلام کے حاشیے پر ملتا ہے۔ فدؔا کا کلام دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی طبیعت میں تصوف رچا ہوا تھا ان کی نظموں اور غزلوں میں بھی یہی رجحان نظر آتا ہے۔ ۷۷ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بڑودہ میں بہت پہلے سے مسلمانوں کے مختلف فرقے رہتے چلے آ رہے ہیں۔ ان میں خاص کر سلیمانی وہرا، علوی وہرا، داؤدی وہرا، اثناعشری

شیعہ، مہدوی اور بعض دوسرے فرقے بھی تھے جو اب بھی موجود ہیں۔ فدؔا کو اردو کی ترویج و اشاعت سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ یہاں مذہبی ماحول میں انھوں نے نوحہ، مرثیہ اور سلام کو بھی رواج دیا جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ روایت یہاں اب بھی باقی ہے۔ فدؔا طبعی طور پر نعت گوئی کی طرف مائل تھے اس لیے نعت اور منقبت کو انھوں نے الگ موضوعِ شاعری بنایا اور اگرچہ ان کی شاعری پر مذہب کی چھاپ زیادہ پڑتی چلی گئی لیکن وہ ذہنی تعیش کے اثر سے باہر نکل گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فدا کے بعد بڑودہ کی اردو شاعری میں تعمیری رجحان غالب نظر آتا ہے۔ زبان و بیان میں لکھنؤ اسکول کی پیروی کے باوجود یہاں کی عشقیہ شاعری ابتذال سے دور ہے مذہب کی جگہ اخلاق نے لی ہے اور شاعری میں عصری رجحانات بھی نظر آنے لگے۔ فدؔا کے بعد بڑودہ میں جن لوگوں نے اردو شعر ادب کو ترقی دینے میں نمایاں حصّہ لیا۔ ان میں خاص طور سے تین شخصیتیں قابل ذکر ہیں۔ ایک خود فدؔا کے فرزند افسؔر دوسرے ضیؔا جو سلیمانی بوہرہ جماعت کے روحانی پیشوا تھے۔ تیسرے دردؔ، افسؔر اور ضیؔا دونوں لکھنؤ اسکول کے شاگرد تھے۔ ۸؎

فدؔا کی شخصیت اس وقت کے سورت کے بیشتر شعراء کے مقابلے میں نمایاں نظر آتی ہے۔ انھوں نے زبان کا استعمال زیادہ محبت کے ساتھ کیا ہے۔ یہ فدؔا کا کچھ کم کارنامہ نہیں ہے۔ اگر سورت کے شعراء میں صرف میاں داد خان سیاح کے کلام سے فدؔا کے کلام کا موازنہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری کے اعتبار سے صرف سیاح کو فدؔا پر فوقیت حاصل ہے۔ سیاح نے سورت کے شعراء کی رہنمائی کی اور بڑودہ میں فدؔا نے اردو زبان و شاعری کی طرح ڈالی۔ ۹؎

فدؔا کی اکثر غزلیں سوز و گداز سے خالی ہیں۔ البتہ کہیں کہیں روانی اور برجستگی نے کلام میں دلآویزی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ مندرجہ ذیل شعر سے ان کے انداز بیان کا پتہ چلتا ہے ؎

شب فرقت میں یہ بیتاب ہوں میں
شرر ہوں برق ہوں سیماب ہوں میں

فدؔا کی ایک نعت اور منقبت کے اشعار میں جذبے کی صداقت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے قادرالکلامی کا اندازہ بالخصوص ان کے قصائد اور مثنوی سے ہوتا ہے۔ کوئی بھی صنفِ سخن ہو ان کے لیے کوئی ردیف مشکل ہے نہ کوئی قافیہ دشوار نظم ہو غزل وہ طویل سے طویل تر لکھ سکتے ہیں۔ طویل غزل اور پرگوئی بھی لکھنؤ کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

فدؔا کا ایک قصیدہ اور کچھ مزاحیہ اشعار مہاراجہ راوٴ کی تعریف میں بھی ملتے ہیں۔ اس میں انھوں نے بعض تاریخی واقعات کی طرف اشارے کیے ہیں۔ جن کی نشاندہی ذیل میں کی جاتی ہے۔ ۸۰؎

مہاراجہ سیاجی راوٴ نے عوام کی خوشحالی اور معاشی و تعلیم ترقی کی طرف خصوصی توجہ کی۔ ہر شخص کو اس کی قابلیت کے مطابق ملازمتیں ملیں اس وقت یہ ملازمتیں موروثی ہوتی تھیں۔ اسکولوں میں مرہٹی، گجراتی، اردو، انگریزی اور فارسی کی تعلیم کا انتظام تھا۔ ایک جگہ انھوں نے مہاراجہ کی تعریف میں اپنے قصیدے میں یہاں تک کہہ دیا کہ میرا مطب نہیں چلتا کیونکہ بیماریاں مہاراجہ کے ڈر سے نہیں آتیں۔ پھر حسن طلب کے ساتھ مہاراجہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔ کہیں کہیں اپنے معاصر شعراء رضوؔی، مائؔل اور مفتوؔن کے انتقال کا پرملال اظہار کیا ہے۔ وفؔا کی شاعری پر اظہار مسرت بھی کرتے ہیں۔ احتشام حسین جو جادؔو تخلص سے مشہور ہوئے شعر لکھ لکھ کر دیتے ہیں۔ وہ اسکول میں سناتے اور داد حاصل کرتے ان تمام باتوں کا ذکر فدؔا کے قصیدے میں ملتا ہے۔ ۸۱؎

فدؔا کا قصیدہ زبان و بیان کے اعتبار سے معیاری اور رواں ہے اس میں قصیدے کے تمام اجزائے ترکیبی کا خیال رکھا گیا ہے۔ قصیدے کی طرح فدا کے خمسہ بھی ان کی قدرت بیان کو ظاہر کرتے ہیں۔ فدؔا لکھنؤ کی ہی زبان کو معیار سمجھتے تھے اور لکھنؤ کی قائم کردہ شاعری کے اصولوں پر چلنا درست سمجھتے تھے۔ فدؔا کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دور میں یہاں کے لوگوں میں اردو فارسی پڑھنے کا شوق پیدا کیا۔ اسکولوں میں اردو تو پڑھائی جاتی تھی لیکن فارسی کی تعلیم نہ تھی انھوں نے اپنے ایک قصیدے میں فارسی کی تعلیم کی خواہش کا اظہار بھی کیا ہے۔ اپنے معاصر

شعراء کا نام ہمیشہ عزت سے لیتے تھے۔ سب کو دادِ سخن دیتے ایسا معلوم ہوتا ہوتا ہے کہ شاعری کے ذریعہ وہ گجرات میں اردو کی ترویج چاہتے ہیں۔ اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے بڑودہ میں فدؔا نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ وہ یقیناً اردوداں طبقے کے بہت بڑے محسن ہیں۔ ۸۲؎

بڑودہ میں فدؔا کی شخصیت کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ یہاں کی اردو شاعری میں شعراء کی فنی ترتیب کا خاص خیال کیا جانے لگا۔ یہاں کے اساتذہ عموماً دلی یا لکھنؤ کے کسی استاد کے شاگرد ہوتے تھے۔ پھر ان استادوں کے شاگردوں کے حلقے قائم ہوئے۔ استادی اور شاگردی کی اس روایت نے فن کو بے راہ روی سے بچا لیا آج بھی بڑودہ میں یہ روایت بڑی حد تک زندہ ہے۔ اس کے علاوہ تصوف کے رجحان کے سبب اور نعت و منقبت، سلام و نوحہ وغیرہ کو رواج دے کر فدؔا نے بڑودہ کی اردو شاعری کو ذہنی تعیش سے بچا لیا۔ چنانچہ ان کے فوراً بعد یہاں کی شاعری متحرک نظر آنے لگی۔ آج بھی یہاں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ فدؔا کا موجودہ کلام بہت کم ہے یہ جو کچھ بھی ہے فدؔا کے ہاتھ لکھے ہوئے خطوط کی شکل میں ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ ان کا بہت سا کلام ۱۹۲۷ء کے بڑودہ سیلاب میں ضائع ہو گیا۔ ان کے مجموعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فدؔا اپنے چشم دید واقعات اور حالات کو اکثر منظوم قلمبند کر لیتے تھے۔ ملیار راؤ کے قتل کے واقعہ پر اظہار خیال اور قطعۂ تاریخ مختلف قطعات کی تاریخ اور قصائد کے بہت سے اشعار اس امر کی طرف نشاندہی کرتے ہیں۔ ۸۳؎

فدؔا کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے کہ سہسوان کے بہت سے سربرآوردہ مسلمان ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصّہ لینے کے سبب انگریزوں کے ظلم و تشدد کا نشانہ بن گئے۔ انھیں بندوق کی گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کے گھروں میں آگ لگا دی گئی یا انھیں توپ سے اڑا دیا گیا۔ اور ان کی املاک کو ضبط کر لیا گیا۔ فدؔا نے سہسوان کو خاک و خون میں غلطاں انہی آنکھوں سے دیکھا تھا اور یہی واقعہ ان کی جلاوطنی کا سبب تھا۔ ۸۴؎

ایسے دل گداز اور جان فرساں واقعہ کو فدؔا کبھی فراموش نہ کر سکتے تھے۔ انھوں نے یقیناً اس واقعہ سے متاثر ہوکر بھی کچھ لکھا ہوگا۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کا بہت سا کلام دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔

نمونۂ کلام

میں اپنی تیرگی بخت پر فدا ہوں فدؔا
الجھ گیا دلِ آوارہ زلفِ یار میں کل

......

وہ یاد آتا ہے اس کا بچشم نم کہنا
سفر سے جلد پھر آنے کی کھایئے قسمیں

......

رلاتا ہے یہ کہنا ان کا رو کر
یہ کہہ جاؤ کب آؤ گے سفر سے

......

تصور ہے رخِ روشن کا دل میں
منور آج کل ہے گھر ہمارا

......

غزل

شب فرقت میں یہ بیتاب ہوں میں
شرر ہوں برق ہوں سیماب ہوں میں
یہ چشم یار سے کہتا ہے ابرو
کہ رخ کعبہ ہے اور محراب ہوں میں
ذلیل اعدا اگر سمجھیں تو سمجھیں
عزیزِ خاطرِ احباب ہوں میں

ملی ہے آبرو بحرِ جہاں میں
صدف ہوں دُر ہوں دُر میں آب ہوں میں
جہاں کو مفت میں ہاتھ آ گیا ہوں
وگرنہ گوہرِ نایاب ہوں میں
کروں گر پار اترنے کا ارادہ
کہے دریائے غم نایاب ہوں میں
مرا نقش قدم فرما رہا ہے
زمیں پر مہرِ عالمتاب ہوں میں
شگفتہ ہیں چمن داغوں کے تن پر
برنگِ گلشنِ شاداب ہوں میں
فدؔا رہتا ہوں گر یاں پنجوقتہ
بڑودہ اب کہے پنجاب ہوں میں

......

غزل 2

تمھارے غم میں آخر دھج بنا ہم نے فقیرانہ
اٹھایا شہر سے بستر بسایا جا کے ویرانہ
کہا رو رو کے میں نے شب جو اپنے غم کا افسانہ
تجاہل دیکھیے کہتے ہیں تو کس کا ہے دیوانہ
لپٹ جاتا ہے فرطِ شوق سے کیا بے حجابانہ
فدؔا ہم دیکھ کر جلتے ہیں وصل شمع و پروانہ

......

غزل 3

ہو سکے تو کیجیے ڈھب آخری دیدار کا
لب تک آ پہنچا ہے دم اس ناتوان و زار کا
ہم ہی کچھ مرتے نہیں ہیں آپ کی اس چال پر
ایک جہاں پامال ہے اس نازکی رفتار پر
عاشقوں کو کوچۂ قاتل میں ہے ازدحام
روز بہر امتحاں ہوتا ہے خوں دو چار کا ۸۵؎

......

شیداؔ

شیداؔ کا نام خواجہ سعیدالدین تھا۔ یہ نواب حشام الدین حسین خان بہادر چغتائی کے بیٹے تھے۔ اور شیداؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کے بزرگ دہلی سے آئے تھے۔ شیدا کی جائے پیدائش بڑودہ ہے۔ مخزن الشعراء میں شیداؔ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ نہایت نیک سیرت اور خوش طبع آدمی تھے۔ وہ ذہین، سلیس اور مفکر بھی تھے۔ ان کی شاعری کا یہ عالم تھا کہ سنگلاخ زمینوں میں بھی دو دو تین تین غزلیں کہہ لیتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے جب نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نواب آف بڑودہ کے مہمان تھے شیدا ان سے صرف نیاز حاصل کرنے گئے۔ شیدا نے مصرع طرح چاہا اور بہت اصرار کرنے پر شیفتہؔ نے یہ شعر پڑھ دیا۔ ۸۶؎

احباب تنگ کرتے ہیں فکر حسن کو اور
تنگ آرہے ہیں جان سے اپنی سفر میں ہم

اس شعر کا سننا تھا کہ شیداؔ نے اسی زمین پر اسی وقت پوری غزل کہہ دی۔ اس کا مقطع ہے۔

شیدا طرح جو مانگے تو کہتے ہیں شیفتہؔ
تنگ آرہے ہیں جان سے اپنی سفر میں ہم

یہ غزل سن کر شیفتہؔ نے بہت داد دی تھی۔ ۱۸۴۱ء، ۱۲۵۵ھ میں سفر حجاز و زیارت وغیرہ سے واپس لوٹنے پر عین جوانی میں انتقال کیا وہ صاحب دیوان تھے۔

نمونۂ کلام

میں نے کہا کوچہ میں ترے آؤں تو بولا
جاتا نہیں جنت میں گنہگار کوئی شخص

ہنستا کسی گلرو سے نہیں میں کہ مبادا
ہو جائے گلے کا نہ مرے ہار کوئی شخص

......

کیا بڑی عمر ہے یاد اس کو ابھی کرتے تھے
وہ سواریٔ بتِ ہوش رُبا آتی ہے

......

کس مزے سے مجھے کہتے ہیں وہ دے کر بوسہ
کس کو بیمارِ محبت کی دوا آتی ہے

......

قصد توبہ شکنی خلد میں حوروں کو ہوا
تا دمِ مرگ جو شیدا نے نبھائی توبہ

......

بزم میں رونے لگا جو ابھی ہنستے ہنستے
تیرے شیدا کو خدا جانے کہ کیا یاد آیا ۸۷ے

......

مائلؔ

میر عالم نام تھا۔ یہ رسالدار تھے تخلص مائلؔ کرتے تھے اور میر مودود بخش صاحب کے

بیٹے تھے۔ ان کا خاندان بھی ضلع بدایوں سہسوان سے آیا تھا۔ بخت کے مارے اس خاندان کے تمام بزرگ بڑودہ آئے تھے۔ گھرانہ معزز تھا ریاست میں اس خاندان کے افراد کو سردار بہادر کا خطاب عنایت ہوا تھا۔ اسی طرح حکومت برطانیہ نے ان لوگوں کو خان بہادر کا خطاب دیا تھا۔ مائلؔ کی تعلیم و تدریس پرانے طریقے پر ہوئی تھی۔ وفاؔ اور فداؔ کے ساتھ ساتھ یہ بھی غالب سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ مرزا غالب کے کئی خطوط ان کے نام ہیں۔ مائل حسین صورت اور حسین سیرت کے اعتبار سے بڑی شہرت رکھتے تھے۔ لوگ دور دور سے ان کے دیدار اور شرف ملاقات کے لیے آتے تھے۔ مائل نے عین عالم شباب میں تقریباً ۱۲۹۰ھ میں انتقال کیا۔ ان کے بیٹے خان بہادر میر مظہر علی ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ میر مظہر علی کے بیٹے میر اظہر علی بھی شاعر تھے۔ ان کا کلام شائع ہو چکا ہے۔ اظہر علی کے بیٹے محمد علی خاندانی روایت کو قائم رکھتے ہوئے سہسوان میں سکونت پذیر ہوئے۔ ؁۸۸

نمونہ کلام

منہ رکھنے میرے منہ پہ وہ کہتے ہیں پیار سے
مائلؔ ہے اب بھی جی میں ترے کچھ ہوس رہی

......

خطا ثابت کریں گے اپنی ہم اور انکو چھیڑیں گے
سنا ہے ان کو غصے میں چمٹ جانیکی عادت ہے
کہتے ہیں وہ مدام کہ ہیں تابع رضا
مائلؔ ہے جی میں آج انہیں آزمائینگے ؁۸۹

(طور کلیم اور بزم سخن بھوپال)

......

گل پوش بعد مرگ ہمارا مزار ہے
کیا لطف ہے کہ عین خزاں میں بہار ہے
ظالم کدورتوں کی تری انتہا ہے کچھ
ہم خاک ہو گئے ترے دل میں غبار ہے

انکار بادہ ساقی سے ناصح نہ ہو سکا
معذور ہوں کہ طبع مروت شعار ہے
کیونکر اٹھائینگے وہ مسّی کی دھڑی کا بار
اپنا ہی رنگ جس لبِ نازک پہ بار ہے
حیلہ سے مہندی ملنے کے ہاتھ اس کے چھو لیے
مائلؔ بھی اپنے فن کا بڑا دستکار ہے ۹۰

......

صدرؔ

نواب میر صدرالدین حسین خان نام تھا اور صدرؔ تخلص کرتے تھے۔ یہ نواب وجیہ الدین خان صاحب کے بیٹے تھے۔ ان کا شجرۂ نسب یاور دودولہ صوبیدار اورنگ آباد میں سے ملتا ہے۔ بڑودہ کے نواب میر کمال الدین دوم کے بعد ان کے بھتیجے داماد شجرالدین جانشین ہوئے۔

صدرؔ ۱۸۷۸ھ میں محرم جمعہ کے دن بڑودہ میں پیدا ہوئے۔ صرف تین سال کی عمر میں ان کے والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ اس زمانے ے دستور کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت گھر ہی پر ہوئی۔ عربی، فارسی، اردو کے معقول معلموں کے پاس انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ ۱۸ سال کی عمر میں نواب کمال الدین دوم کی بیٹی سے شادی ہوئی۔

صدرؔ سچے مسلمان تھے۔ قوم و مذہب کے لیے دل میں درد رکھتے تھے۔ سر سید و حالی وغیرہ کی اصلاحی تحریکوں سے بہت متاثر تھے۔ گجرات میں موصوف نے سماجی مذہبی اصلاح کے لیے ہر ممکن طریقے پر کوشش کی۔ چھوٹے چھوٹے رسالے لکھ کر چھپواتے اور مُفت میں تقسیم کرواتے۔ نثر و نظم کے تقریباً ۷۰ رسالوں کا پتہ چلتا ہے۔ بڑودہ کی جامع مسجد اور عربی، فارسی کے مدرسے کے بانی ہونے کا موصوف کو فخر حاصل ہے۔ ۹۱

نمونہ کلام

شریعت سے بیزار ہر پیشوا ہے
نہیں عیب تھا جو وہ اب برملا ہے
ترقی میں جن کا قدم بڑھ رہا ہے
ہر ایک علم پر جان و دل سے فدا ہے
عجب ہائے عالم میں محشر بپا ہے
نہ رنگ محبت نہ بوئے وفا ہے
حسد کا مرض اس قدر بڑھ رہا ہے
ہے جائز ستم اور غیبت روا ہے
ہر ایک دوست اصراف میں مبتلا ہے
لٹیروں کو خوب ان پہ قبضہ ملا ہے

......

دنیا میں زیست ہے تری جور و جفا کے ساتھ
افسوس دن گزرتے ہیں مکر و دغا کے ساتھ
اے کور دیدہ ربط نہ رکھ فتنے جہاں کے ساتھ
دل کو لگائے بیٹھا ہے کس بے وفا کے ساتھ
دل دادہ خود نمائی پہ رہتا ہے کیوں بشر
چھوڑے گا گر خودی تو ملے گا خدا کے ساتھ
عمر عزیز تیری ہے مصروف حرص و یاس
آزارِ خلق ہے تیری ہر ہر ادا کے ساتھ
خواہش ہے گر نجات کی رکھ شرع میں قدم
چل صدؔر بے خطر تو اسی رہنما کے ساتھ ۹۲ھ

......

وفاؔ

میر ابراہیم علی خان میر اکبر علی خان کے بیٹے تھے۔ اور وفاؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کے جد امجد میر سرفراز علی خان ہمدانی تھے۔ وفا نے شروع شروع میں طالبؔ تخلص بھی اختیار کیا تھا۔ ان کی سن پیدائش ۱۸۳۵ھ سے ۱۸۴۰ء کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے گھر پر ہی حاصل کی۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد سورت میں اپنے چچا میر جعفر علی خان کے پاس رہے۔ یہاں انھوں نے منشی لطیف اللہ فریدی سے عربی، فارسی اور انگریزی پڑھی تھی۔ والد کی وفات کے بعد وہ بڑودہ واپس چلے آئے اور فوج میں اصلاح دار سردار کا منصب انہیں مل گیا۔۹۳

وفاؔ خوش رو اور وضع دار شخص تھے، چھریرا بدن، میانہ قد اور رنگ صاف تھا۔ ڈاڑھی بہت خوبصورتی کے ساتھ ترشواتے تھے۔ سر پر بڑودوی پگڑی۔ انگریزی اور آڑھا پاجامہ پہنتے تھے۔ آنجہانی مہیش پرشاد و بنارس والوں کے پاس بھی ان کی تصویر تھی۔ میر صاحب بہت خوش گلو تھے۔ ہر ماہ ان کے دولت کدے پر مجلس میلاد منعقد کرتے تھے اور خود قصائد میلاد پڑھتے تھے۔ آواز میں درد تھا جب پڑھتے تھے تو مجلس میں سکتہ کا علم ہو جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس بات کا شعراء لکھنؤ تک پہنچا تھا۔ اور عالم پیا نے انھیں بلوا کر سنا اور خوب داد دی تھی۔ اگر ۱۸۵۶ء کا بلوہ نہ ہوتا اور لکھنؤ نہ اجڑتا تو ممکن تھا کہ مٹیا برج میں بھی انھیں طلب کیا جاتا۔ وفاؔ کی طبیعت مذہب و تصوف کی طرف مائل تھی۔ وہ احمدآباد کے صوفی محمود میاں چشتی کے مرید تھے۔

وفاؔ غالبؔ کے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کی غالب سے خط و کتابت بھی تھی۔ لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ انھوں نے غالب سے کبھی ملاقات بھی کی ہے یا نہیں۔ حکیم احمد حسن فدا کے توسط سے یہ غالب کے تلامذہ میں شامل ہو گئے تھے۔ اور اس بات کا انھیں بڑا فخر تھا۔ اپنی شاگردی کا اظہار وہ اپنے شعر میں کچھ اس طرح کرتے ہیں۔۹۴

بجا لاؤ وؔفا شکر خدا ہو مائل قسمت
کیا استاد اپنا تم نے غالبؔ سے سخنداں کو

اردوئے معلیٰ میں ان دونوں کے نام خطوط موجود ہیں۔ رسمِ خط و کتابت غالب کی وفات تک قائم رہی تھی۔ وفا کے یہاں بیٹا تولد ہوا تو غالب نے ایک رنگین عبارت نثر میں اور ایک رباعی قطعہ اور ایک قطعہ احمد حسن کے اکمل اخبار میں چھپوا دیا تھا۔ غالب کی رباعی اور قطعہ ان کے خط میں بھی درج ہیں۔ وؔفا نے بمقام بڑودہ ۱۸۸۵ء میں انتقال کیا۔ ۹۵

نمونۂ کلام

ارمان کچھ ارم کے نہ باغ جناں کے ہیں
ہم تو نثار سید کون و مکاں کے ہیں
تیر نگاہ یار کا آماجگاہ ہوا
یہ حوصلے ہمارے دل ناتواں کے ہیں
کرتے ہیں آسماں پہ ملائک سبھی الحفیظ
شعلے بلند یہ میری آہ و فغاں کے ہیں
بس ہے جو ہوئی عمر دو روزہ بھی چین سے
ارمان کس کو زندگی جاوداں کے ہیں
کیا غم جو ہو وسیلۂ محمود حشر میں
طالبؔ مرید آپ تو قطب زماں کے ہیں

......

نوحہ

مقتل میں یہ شہ کہتے تھے بھائی میرے پیارے
ہے ہے مرے عباسؓ
ہے ہے میرے عباسؓ

اب کون اٹھائے گا علم بعد تمھارے

ہے ہے مرے عباسؑ

کس طرح نہ نکلیں دل سوزاں سے شرارے

ہے ہے مرے عباسؑ ۹۶

افسؔر

سید محمود حسین نام اور افسؔر تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد سید احمد حسین فدا تھے۔ خانۂ جاوید میں افسر کا نام ہے جس میں غلطی سے انھیں فنا خلق اکبر لکھ دیا ہے۔ افسؔر کا سلسلہ نسب حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی سے ملتا ہے۔ جن کا سلسلۂ نسب امام علی نقیؑ کے واسطہ سے حضرت امام حسینؑ شہید کربلا تک پہنچتا ہے۔ سب سے پہلے خاندان مودودی کے ایک فرزند سید محمد جن کا لقب خواجہ خطیر تھا بلبن کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے۔ خواجہ خطیر کی پیدائش ترکستان کے مقام نقشب میں ہوئی تھی۔ یہ وہی جگہ ہے جو ماہِ مقنّاع اور چاہِ نقشب کی وجہ سے معروف ہے جب چنگیزی حملہ آوروں نے ایران اور ترکستان کے بہت سے لوگوں کو ترکِ وطن پر مجبور کر دیا تو خواجہ خطیر نے ہندوستان میں پناہ لی۔ یہاں ان کے علم و ہنر کا بہت شہرہ ہوا۔ جس سے متاثر ہوکر غیاث الدین بلبن نے انہیں شہزادہ محمد شاہ کا اتالیق مقرر کر لیا۔ رفتہ رفتہ ان کے تدبر اور سیاست سے متاثر ہوکر غیاث الدین بلبن نے ان کو مہمات ملکی میں بھی اپنا مشیر و معاون بنا لیا اور آخر میں وزرات کے منصب پر بھی فائز کرلیا۔ جلال الدین فیروز شاہ علاؤالدین خلجی اور غیاث الین تغلق کے زمانے میں بھی آپ وزارت کے منصب پر فائز رہے۔ قران السعدین میں امیر خسرو نے آپ کی تعریف و توسیع کی ہے۔ ۹۷

خواجہ خطیر نے ۱۵۰ سال کی عمر میں امروہہ میں وفات پائی ترک منصب و مہمان کے بعد وہ جس علاقہ میں اقامت گزیں تھے۔ آج تک اس محلے کو نقشی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

۱۰ ویں صدی ہجری میں اسی خاندان کے ایک فرزند قاضی عبدالشکور شہر سہسوان کے قاضی مقرر ہوئے۔ انہیں کے کسی رشتہ دار نے انہیں شہید کر دیا۔ سہسوان کے مودودی خاندان کے مورثِ اعلیٰ یہی قاضی عبدالشکور ہیں۔ افسؔر کا شجرۂ نسب قاضی عبدالشکور کے فرزند سید ابو صالح سے ملتا ہے۔ اور اسی نسبت سے اس خاندان کے لوگ اپنے کو صالحی مودودی کہتے ہیں۔ ۹۸

ہندوستان میں مودودی خاندان میں ارباب علم و فضل بھی ہوئے۔ عارف و صوفی بھی اور مدبر و منصرم بھی۔ اسی وجہ سے اکثر اس خاندان کے لوگ امراء اور بادشاہوں کے منظورِ نظر رہے ہیں۔ اور مختلف مناسب اور ملکی فرائض کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں مامور کیے جاتے تھے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں خاندان پھیل گئے۔ گائیکواڑ کے زمانے میں بڑودہ میں بھی اس خاندان کے لوگوں نے مہاراجہ سے بڑا اعزاز و اکرام حاصل کیا اور یہ لوگ یہاں کے معزز ترین شرفاء میں شمار کیے جاتے تھے۔ ۹۹

افسؔر کے والد سید احمد حسین فدا نے وہ زمانہ بھی دیکھا تھا جبکہ ہندوستان انگریزوں کے مظالم سے خاک و خون میں غلطاں تھا۔

۳/ مارچ ۱۸۷۴ء کو افسؔر کی ولادت ہوئی۔ فدا کی بیاض میں افسر کی تاریخ پیدائش مرقوم ہے۔ جب افسر کی عمر ۱۹ سال کی تھی تب فدؔا فوت ہو چکے۔ افسر نے ساری تعلیم بڑودہ میں اپنے والد سے پائی۔ عربی، فارسی، منطق، فلسفہ اور طب میں دستگاہ حاصل کی۔ انھوں نے گجراتی زبان بھی سیکھی۔ ان باتوں سے افسر کی خداداد ذہنی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ افسر نے اپنے والد کی وفات سے قبل اپنی بیوی کے ساتھ حج کیا تھا۔ اس کا پتہ فدا کے ان خطوط سے ہوتا ہے جو انھوں نے مکہ و مدینہ کے معلمین کو لکھے تھے۔ جس میں ان کی بیوی کے حج کا ذکر ہے۔ ان خطوط کے حوالے ان کے تذکرۂ حج میں ملتے ہیں۔ یہ خطوط خود فدا کے ہاتھ کی تحریر میں افسر کے پوتے

سید واجد حسین کے پاس محفوظ ہیں۔ ۱۳۱۲ء میں ایک نعت میں دوبارہ سفر مدینہ کی تمنا ظاہر کی ہے۔ ۱۰۰؎

ہند سے اپنے مدینے میں بلاؤ مجھ کو
روضۂ پاک پھر اِک بار دکھاؤ مجھ کو
التجا افسرِ محزوں کی یہ ہے حضرتؐ
درِ اقدس پہ پھر اک بار بلاؤ مجھ کو

دوبارہ سفر مدینہ کا اظہار انھوں نے اور بھی دوسری نعتوں میں کیا ہے۔ افسر کی شادی بڑودہ کے نواب خاندان میں ہوئی تھی۔ بیوی کا نام خدیجہ تھا۔ جو نواب سید نورالدین کی بیٹی تھی۔ خدیجہ کو کچھ کاشت کی زمین اور شہر میں کچھ مکانات وراثت میں ملے تھے۔ اس لیے افسر کی معاشی حالت شروع سے ہی اچھی تھی۔ مہاراجہ سیاجی راؤ نے از سرنو آراضی کی اصلاح کی تو زمینداری کا خاتمہ ہوگیا اور زینیں کاشت کاروں کے نام ہوگئی اس لیے زمین داروں کی مالی حالت نازک ہوگئی۔ خدیجہ بیگم اور نواب خاندان میں مقدمہ بازی کی نوبت آئی۔ افسر کو اس مقدمے کے سبب مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کہیں کہیں افسر نے اشعار میں اشارہ بھی کیا ہے۔

تردد کا یہ عالم اور پھر شوق غزل گوئی
نئے مضموں کہیں اس حال میں افسؔر نکلتے ہیں

......

اٹھے نہ دست دعا بھی سوال تو کیسا
کیا وہ فقر میں ہم نے کہ جو شاہ کر نہ سکے

افسؔر نے شہر میں ایک مطب کھول رکھا تھا۔ وقت مقررہ تک مطب میں رہنے ان کے شاگرد رشید عاشقؔ بڑودوی کے قول کے مطابق افسر کی فیس چار آنے تھی۔ حکیم حبشی میاں حکیم پنو میاں اور حکیم قاسم علی کے ساتھ اکثر صحبتیں گرم رہتی۔ وہ تلاوت قرآن مجید بڑی پابندی سے کرتے۔ ۱۰۱؎

افسرؔ کو معاش کے لیے ریاضت نہیں کرنی پڑی ان کی معاشی حالت پہلے سے ہی اطمینان بخش تھی۔ اوائل عمر میں ہی حج کر لیا تھا۔ زمینداری کے علاوہ بھی شہر میں ان کی جائداد تھی، مطب کی آمدنی بھی الگ تھی۔

افسرؔ نے وقت کے مروجہ علوم و فنون میں دستگاہ حاصل کر لی تھی۔ لیکن اس زمانے میں ذوق شاعری کو معیار قابلیت سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے باپ نے بیٹے کی شاعرانہ صلاحیت کو دیکھ کر زورؔ لکھنوی کے والد مرزا ذاکر حسین یاسؔ کی شاگردی میں دے دیا۔ افسر اپنے استاد کے بارے میں کہتے ہیں۔

یوں تو ہونے کو سخنداں ہیں بہت اے افسرؔ
یاسؔ سا کوئی مگر دہر میں استاد نہیں

جلوؤں کے ایک پرچے میں افسر کو داغؔ کا شاگرد لکھا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ یہ بات صحیح ہو سکتی ہے کہ کبھی انھوں نے داغؔ کو بھی اپنا کلام بتایا ہو افسر کے شاگرد عاشقؔ بڑودوی کا بیان ہے کہ ان کے استاد افسرؔ نے جلالؔ لکھنوی کو بھی اپنا کلام دکھایا تھا۔ ان کے بعض کلام سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے وقت کے کئی استاد سے استفادہ حاصل کیا تھا۔ لیکن باقاعدہ تلمذ کا شرف یاسؔ لکھنوی سے حاصل ہوا۔ افسر کے ان اشعار سے یہ بات آسانی سمجھ میں آجاتی ہے۔

مرے کلام میں کس طرح نقص ہو افسرؔ
کہ خوب سیکھا ہے اس فن کو باکمالوں سے
اساتذہ کی بہت صحبتیں اٹھائی ہیں
یہی سبب ہے کہ افسرؔ جو خوش بیاں ہوئے ہیں [۱۰۲]

افسرؔ زندگی بھر مشق سخن کرتے رہے۔ نعت، منقبت، غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، مسدس سب کچھ لکھا ہے۔ ان کا کلام جلوۂ یار، پیامِ یار اور گلدستۂ منصور، شفاعت بمبئ میں چھپا تھا۔ انھوں نے بہت لکھا لیکن بہت سا کلام محفوظ نہ رہ سکا۔ کہتے ہیں کہ ۱۹۲۷ء کے طوفانی سیلاب میں بیشتر کلام بہہ گیا۔ افسرؔ نے کلام کسی ایک بیاض

میں جمع نہیں کیا تھا۔ وہ اپنا کلام کسی پرچے پر لکھ کر کہیں بھی ڈال دیتے تھے۔ اس لیے بڑی حد تک کلام کی بربادی کا سبب خود افسؔر کی بے پروائی ہے۔

افسؔر نے گجرات میں شاعری میں خاصی شہرت پائی۔ وہ استاد الشعراء اور افسر الشعراء کے خطاب سے یاد کیے جاتے تھے۔ داغؔ اور امیر کے ساتھ بھی مشاعروں میں شرکت کی تھی۔ جلوۂ یار اور پیامِ یار کے پرچوں میں جلالؔ، امیؔر اور داغؔ کے کلام کے ساتھ ان کے کلام کو بھی جگہ ملتی تھی۔ عمر میں بہت چھوٹے ہونے کے باوجود داغ انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ مولانا احسن مارہروی سے بھی افسؔر کے دوستانہ روابط تھے مولانا ان کی بڑی عزت کرتے اور بھائی کہہ کر پکارتے تھے۔ آرزؔو لکھنوی بھی افسؔر کے قدردان تھے۔ شاعری میں استادی کا درجہ رکھنے کے باوجود افسر نہایت خاکسار اور منکسرالمزاج تھے۔ اس بات کا اظہار ان کے کئی اشعار سے ہوتا ہے۔ مثلاً

خاکساران جہاں میں افسؔر
غیر افسر نہیں افسر کا جواب

افسؔر کی استادی کا اعتراف گجرات میں سبھی کو تھا اگرچہ معاشرانہ چشمک بھی کم نہ تھی۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک بار سورت میں نواب حفیظ الدین کے مکان میں ایک مشاعرہ فخرالدین فخر گجراتی کی زیر صدارت ہوا۔ کیونکہ افسر پہلے سے بغیر اطلاع دیے مشاعرے میں پہنچ گئے اور عام جگہ پر بیٹھ گئے۔ اس لیے نواب صاحب اور فخر کو ان کی شرکت کی اطلاع نہ ہوسکی۔ کیونکہ افسؔر جیسے شاعر کو اسٹیج پر ہونا چاہیے تھا کہ عام سامعین میں صرف تین چار شاعروں کے بعد افسر کو پکارا گیا۔ لوگ یہ سمجھے کہ یہ استاد الشعراء نہیں بلکہ کوئی اور افسر ہوں گے۔ افسر جب اسٹیج پر پہنچے تو نواب صاحب اور صدرِ مشاعرہ نے بہت معذرت کی کہ انھیں ان کی شرکت کا علم نہ تھا۔ افسر نے فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی۔

کس طرح کہوں میں کہ سخن ور میں ہوں
ایک ذرّۂ ناچیز سے کمتر میں ہوں [۱۰۳]

پہچان لیں واقف نہ ہوں جو اہل سخن
احباب جسے کہتے ہیں افسؔر میں ہوں

اس رباعی کے پڑھتے ہی اعلان ہوا کہ آپ ہی استاد الشعراء افسؔر بڑودوی ہیں۔ آپ کا کلام آخر میں سنایا جائے گا۔

افسؔر نے جگہ جگہ اپنی ناقدری کا شکوہ کیا ہے بلکہ ماتم منایا ہے۔ ذیل کے اشعار سے ان کی اس بات کا پتہ چلتا ہے۔

کہاں ہیں قدرِ سخن آج خلق میں افسؔر
سکوت خوب ہے ہر ایک خوش بیاں کیلئے

......

کہاں ہے آج اس دنیا میں افسؔر قدرداں کوئی
یہ لالے بے بہا ہیں رائیگاں بزم سخنداں میں

......

گلشن میں بلبلوں سے بھی گرم سخن رہا
افسؔر ملا نہ کوئی مرا ہم زباں کوئی

......

چلتے ہوئے فقروں سے کیے جاتے ہیں دشمن
افسر کی اس زبان میں تلوار کے انداز

......

ہے صرف مجھے سخنوری کا دعویٰ
کیا جرم ہے کوئی شاعری کا دعویٰ

کیوں برسر پرخاش ہیں احباب افسؔر
کیا میں نے کیا پیمبری کا دعویٰ

لیکن اس وقت کے استاذۂ فن کا اعتماد حاصل ہو جانا افسؔر کی شاعری کے اعتبار کے لیے کافی تھا اور احباب خوش ہوں یا ناخوش افسؔر اس اعتبار سے خوش نصیب تھے البتہ محرومی اور بہبودی کے ان کا کلام ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ اس لیے اردو ادب کی تاریخ ان کے ذکر سے خالی رہ گئی۔ افسر کو خود بھی اپنے فن کا احساس تھا اس کا اظہار انھوں نے جگہ جگہ کیا ہے۔ مثلاً ؎

خنجر کا کام کرتی ہے سیدھی سی بات بھی
قائل ہیں افسؔر آپ کی اس بول چال کے

......

حسینان جہاں سن سن کے میرے شعر کہتے ہیں
زمانے میں نہ افسؔر سا کوئی جادو بیاں ہوگا

......

اگرچہ کہنے کو لاکھوں ہیں خوش بیاں لیکن
جہاں میں ایک بھی افسؔر کا ہم نوا نہ ہوا

......

یہاں تک دسترس حاصل ہے فن شعر گوئی میں
زمینِ نا شگفتہ میں بھی رنگ افسؔر جماتے ہیں [۱۰۴]

......

افسؔر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حاذق طبیب اور ذی علم انسان تھے ذہانت اور حاضر جوابی میں صرف یہاں کے حکیم وارث علی عرف حبشی میاں ان کے ہم عصر تھے۔ طبیعت میں بڑی بے نیازی تھی۔ زہد و عبادت کی طرف مائل ہونے کے سبب عزلت نسبتی ہی انہیں پسند تھی تاہم معاصرین میں بعض ایسے تھے جن کے اخلاق و وضع داری اور ذہانت کے افسؔر بہت قائل تھے اور ان کے ساتھ صحبتیں گرم رہتی تھیں۔

افسر کا دائرہ احباب بہت مختصر تھا۔ اسمیں حکیم حبشی میاں، منشی مہدی حسین، حکیم پنو میاں اور حکیم کاظم علی خاص تھے۔

اگر ہم افسؔر کے حلقۂ احباب کا جائزہ لیں تو مندرجہ ذیل حضرات افسر کے حلقۂ احباب کے خاص الخاص نظر آتے ہیں۔

سید ابراہیم علی خان وفؔا، رئیسؔ بڑودوی، حکیم احمد حسین فدؔا کے توسط سے یہ مرزا غالبؔ کے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے افسؔر سے گہرے دوسانہ مراسم تھے۔ گاہے گاہے یہ اپنا کلام افسؔر کو دکھایا کرتے تھے۔ وفا کے گھر پر ادبی نشستیں اکثر ہوا کرتی تھیں۔

حکیم وارث علی عرف حبشی میاں شاہی طبیب اور رئیس تھے۔ نہایت خوش اخلاق اور وضع دار تھے۔ یہ اپنے وقت کے جید عالم اور طبیب حاذق تھے۔ مذہبی اعتقاد سے یہ اِثناء عشری شیعہ تھے۔ افسر اور حبشی میاں میں اکثر مذہبی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے قدردان تھے۔

میر احتشام علی خان جادؔو یہ ریاست بڑودہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ افسؔر سے مشورہ سخن کرتے تھے۔

مولوی شیخ اسداللہ صاحب اردو اسکول میں مدرس تھے اور نہایت خوش بیان واعظ تھے۔

ثاقبؔ بدایونی عرصۂ دراز سے بڑودہ میں قیام پذیر تھے۔ ان کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا۔ افسر کے بے حد معترف تھے نیّرؔ بڑودوی ثاقب کے شاگرد تھے۔

منشی عبدالکریم انوؔر بڑودوی یہ زودگو شاعر تھے۔ اکثر افسر کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ یہ ان کے بے حد معترف تھے۔ کہتے رہتے تھے کہ دور دور تک افسر کا جواب نہیں۔

حکیم فخرالدین ناظم بڑودوی قابل حکیم اور نہایت عمدہ خطاط تھے۔

منشی سید عبد میاں صاحب طاہر بڑودوی یہ قاضی سید عظیم الدین کے دادا تھے اور عوامی گیت لکھتے تھے۔

حکیم شرف الدین صاحب خاکی طبیب تھے اور ٹریننگ کالج میں استاد تھے۔

حاشم میاں نابینا تھے۔ میلاد خوانی میں اپنا جواب آپ رکھتے تھے۔ بلا کی یادداشت تھی۔

منشی قطب الدین عظیم الدین۔ وزیر بڑودہ ثاقب بدایونی کے شاگرد تھے۔ کبھی کبھی افسؔر سے بھی مشورۂ سخن کرتے تھے۔ یہ زیادہ تر نعت اور منقبت لکھتے تھے۔

منشی عبدالکریم جوشؔ احسنی صاحب۔ مولانا احسؔن مارہروی کے شاگرد تھے۔ ان کی جوتوں کی دکان تھی۔ یہ بھی کبھی کبھی اپنا کلام افسؔر کو دکھاتے تھے۔

حکیم گوہر علی صاحب۔ موجدِ عرق طہال فن علم دوست آدمی تھے افسؔر سے خاصہ یارانہ تھا۔

سر عباس طیب جی۔ ریٹائر سیشن جج تھے بعد میں کانگریس کے لیڈر بھی ہوئے تھے۔

یہ وہ حضرات ہیں جن سے افسؔر بڑودوی کے اچھے خاصے تعلقات تھے۔ اور یہ اس بات کی گواہی ہے کہ افسؔر کی شخصیت کتنی لچک دار تھی اور ان کے حلقۂ احباب میں ہر قسم اور ہر منصب کے لوگ موجود تھے۔ ۱۰۵؎

افسؔر بحیثیت شاعر

افسؔر نے یوں تو تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن انھوں نے غزل اور نعت کو خصوصیت سے اپنایا ہے۔ ان کی غزلیں کیفیت کے اعتبار سے حزنیہ اور موضوع کے اعتبار سے عشقیہ، طرز ادا کے اعتبار سے شوخی آمیز اور کہیں کہیں ظریفانہ اور زبان کے اعتبار سے سادہ اور بامحاورہ ہوتی ہیں۔ یہ تمام اجزاء مل کر افسر کی شاعری کو ایک مخصوص لہجہ اور آہنگ عطا کرتی ہیں۔

افسؔر کے احساس غم میں نہ تو میر سا سیلاب گریاں نہ غالب کا فلسفیانہ تفکر تھا ان کے کلام میں حزن کے ساتھ ضبط بھی ہے۔ وہ غم کو برداشت کرنے کے لیے پہلے ذہن کو آمادہ کرتے ہیں پھر اپنی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔ افسؔر نے اپنے غم کی کوئی فلسفیانہ توضیح نہیں کی ان کا غم صرف غم جاناں ہے۔ وہ صرف اپنے قلبی واقعات کو بیان کر دیتے

ہیں۔ چونکہ ان کے اظہارِ غم میں دلی جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس لیے اس میں تصنع، ذہنی ورزش یا آورد کا شائبہ نہیں ہوتا ہے۔ افسؔر نے اپنی شاعری کے بارے میں خود ہی اپنی رائے ظاہر کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں میرا دل ہمیشہ مضطرب اور بے چین رہا۔ اس نے کبھی فرصت ہی نہ دی کہ میں شاعری کے لیے فکر سے کام لیتا۔

اضطراب دل ناشاد ہے وارداتِ فکر
سر ہمارا کبھی منت کش زانو نہ ہوا

افسؔر کا غم ان کے تصور عشق کا غماز ہے۔ افسر کا غم بھی ایک توانا روح کی علامت ہے۔عشق کے ساتھ محبوب کا تصور ناگزیر ہے۔ افسر کا عشق اور ان کا محبوب کوئی ماورائی شئے نہیں ان کا عشق بھی ارضی ہے اور محبوب بھی ناز حسن اور نیاز حسن کے متعلق ان کی غزلوں میں وہ تمام باتیں ملتی ہیں جو اردو شاعری کی روایات، رہیں ہیں۔ جور محبوب، شوق وصال ہجر کے صدمے تمنائے مرگِ احساس، ناکامی، رقیب رشک اور قاصد کے معاملات شوخی اور ظرافت سبھی کچھ افسؔر کے کلام میں ملتے ہیں۔مگر یہ تمام روایات افسؔر کے کلام میں اس طرح جلوہ گر ہوئیں ہیں کہ ان میں ایک نیاپن اور ایک انداز محسوس ہوتا ہے۔ جو انہیں اپنے پیش روؤں سے ممیّز اور معاصرین میں ممتاز کرتا ہے۔ افسر اگر حزنیہ کیفیت کا اظہار بھی کرتے ہیں تو بالعموم اس پر ایک لطیف شوخی کا رنگ چڑھا دیتے ہیں۔ جو زیر لب خنداں ہوتا ہے۔ افسؔر کے کلام میں متانت اور ٹھہراؤ بہت کم ہے ان کے دل پر جو کچھ گزرتی ہے اسے وہ نہایت سادگی سے بیان کر جاتے ہیں ان کے یہاں نہ جوش بیان ہے نہ جذبۂ شدت وہ جب ظریف ہوتے ہیں تو صرف سنجیدہ ہوجاتے ہیں لیکن فلسفی نہیں بنتے۔ ۱۰۶

دل کے دینے سے نہ روک اے ناصح
اس میں تیرا ہے کہ ہے نقصاں مرا
آپ جو کہتے ہیں مجھ سے باز آ الفت سے تو
بندہ پرور کیا مرا دل آپ کا دل ہو گیا

افسؔر کا یہ غیر سنجیدہ لہجہ بڑا معنی خیز ہے۔ یعنی ناصح کی بات اس قابل نہیں کہ اسے اہمیت دی جائے۔ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور دلائل سے اسے قائل کیا جائے اس کے اندر نہ دلائل کو سمجھنے کی صلاحیت ہے نہ اس کا حل درد آشنا ہے لہٰذا اس سے کوئی بحث کرنا بے کار ہے۔ ایک جگہ افسؔر کہتے ہیں کہ ؎

دل کے عوض میں مجھ کو غم جانگزا دیا
بندہ نواز آپ نے کیا لے کے کیا دیا
رنج و غم دیتے ہو نقد دل شیدا لے کر
منصفی شرط ہے کیا دیتے ہو تم کیا لے کر

......

بزم غم میں احتیاج شمع کیا
دل جلے ایسا کہ خود بن جائے شمع [107]

......

مندرجہ بالا اشعار کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ افسؔر نے غم کو دل کے عوض قبول کیا ہے مگر وہ غم کو دل پر ترجیح نہیں دیتے یعنی زندگی غم کو قبول کرنے اور پھر اس پر قابو پانے کے لیے ہے۔ اس لیے افسر کا یہ غم ایک صحتمند علامت ہے۔ یہ ایک توانا روح کی علامت بن کر نمودار ہوا ہے۔ افسر کی ایک بڑی خوبی یہ رہی ہے کہ انھوں نے شوخی اور ظرافت میں لکھنؤ اسکول کی تقلید کی ہے۔ لیکن اپنے کلام کو ابتدال سے بچایا بھی ہے۔ افسر نے اس ماحول میں اپنے دامن کو بچایا ہے جب داغ کا سکہ چلتا تھا۔ افسر کی زبان شناسی اور بیان کی شائستگی واقعی قابل داد ہے۔ انھوں نے بے جا تخیل، تصنع اور خود عقیدے کے انداز سے بالعموم گریز کیا ہے۔ اور اگر کہیں ایسا کلام نظر آتا ہے تو آٹے میں نمک کی طرح یا بالکل ابتدائی کلام میں کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں روزمرّہ اور عام بول چال کی زبان ہے لیکن بلیغ انداز بیان نے ان کی غزلوں کو ایسا جیتا جاگتا مرقع بنا دیا ہے جس میں ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق

انسان کی نفسیاتی کیفیات کا مطالعہ کر سکتا ہے احساس ناکامی اور زورِ محبوب کے ذکر کے باوجود ان کا شوخی آمیز انداز دل پر ایک سرور آمیز اثر چھوڑتا ہے۔

نمونۂ کلام

ہے پاس وضع ورنہ رقیبوں کی بزم میں
ہم بیٹھیں سر جھکائے گنہگار کی طرح

......

کیا کریں تم پہ ہم نثار افسوس
زندگی بھی ہے مستعار افسوس

......

ان کی فرقت میں عجب حال ہوا ہے میرا
دیکھ کر حال مرا غیر بھی رو جاتے ہیں

......

مزا ہو ہم سے پوچھے کوئی حالِ شیخ محشر میں
ہمیں ہیں میکدہ کی پارسائی دیکھنے والے

......

کب اس کو سلیقہ تھا مگر تجھ سے ستمگر
سیکھی ہیں جفائیں فلکِ نیند فریں نے

......

آتی نہیں ہے یہ بھی شب فرقت میں الٰہی
سیکھے ہیں اجل نے بھی مگر اس کے قرینے

......

ترے خلوت کدے تک کس طرح میری رسائی ہو
یہاں تقدیر سوتی ہے وہاں بیدار درباں ہے

میرا دل لے کے فرمانا مجھی سے
بتاؤ تو میری مٹھی میں کیا ہے

......

قائل ہوں جب میں تیرے اچھلنے کا اے جگر
پہنچا دے مجھ کو بام تک ان کے اُچھال کے

......

انہیں یہ ناز دل لیکر نہ کچھ دینا پڑا ہم کو
ہمیں یہ صبر سودا ہو گیا ان سے ادھار اپنا

......

محبت کس قدر تھی میزباں کو اپنے مہماں سے
کہ دل باہر نکل آیا لپٹ کر ان کے پیکاں سے ۱۰۸؎

☆

بھروچ

بھروچ کا قلعہ

سردار سرووَر

بھروچ کا پرانا قلعہ

جامع مسجد

آپرکوٹ قلعہ

بھروچ

ریاست گجرات میں بھروچ کا بھی اپنا ایک مقام ہے۔ اس کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ کیونکہ اس شہر کے کنارے نربدا ندی بہتی ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق اسے شنکر بھگوان کی بیٹی مانا جاتا ہے۔ اسی لیے ہندو مؤرخوں نے اسے بھگوان کی بیٹی کہہ کر پکارا اور ساتھ ہی ان کے پرانوں میں نربدا ندی سے متعلق کئی قصے مشہور ہیں۔ اور ان کے مطابق کہا جاتا ہے ہ نربدا ندی شنکر بھگوان کی بیٹی تھی۔ جو انھیں بہت پیاری تھی۔ شنکر بھگوان نے عوام کی بھلائی کے لیے نربدا کو حکم دیا کہ وہ آبی شکل میں تبدیل ہوکر ایک بڑی دریا بن جائے۔ اور عوام کی فلاح و بہبود کے کام آئے۔ اس روایت کے مطابق نربدا نے دریا کی شکل اختیار کر لی اور پہاڑوں سے نکل کر میدانی علاقوں میں بہتی ہوئی ہزاروں سال سے لوگوں کی بھلائی کر رہی ہے۔ اسی نربدا کے کنارے بھروچ شہر آباد ہے۔ ۱۰۹ بھوگو رشی نام کے ایک منی نے یہاں ایک شہر بسایا اور ان کے نام پر اس کا نام بھروچ ہوا۔ ان کی بڑی زیارت گاہ بھی ہے۔ زمانۂ قدیم سے یہ کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ بھوگو کچھ، بھروگروپورا، بھروچ اسی طرح مراٹھی میں اسے بھڑوچ اور انگریزی میں بُروچ جیسے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ ۱۱۰ بھروچ شہر کے چاروں طرف قلعہ کی دیوار بنی ہوئی تھی۔ ایک پرانا مندر بھی تھا۔ بھروچ پر بار بار حملے ہوا کرتے تھے۔ ساتھ ہی نربدا ندی میں کئی بار سیلاب آیا جس کی وجہ سے قلعہ کی دیوار کافی جگہ سے ٹوٹ گئی ہے اور پھر ساتھ ہی سمندری راستوں سے آنے والے حملہ آوروں نے بھی قلعہ کی دیوار کو مسخ کر دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ بھروچ شہر سولنکی راجاؤں کے زمانے ہی سے مشہور ہیں۔ ۱۱۱

پندرہویں صدی میں بھروچ ایک مشہور اور مقبول بندرگاہ تھی۔ (یہاں کئی جہاز

لنگر انداز ہو سکتے تھے۔) اس لیے یہ بندرگاہ اور بھی مشہور تھی۔ یہاں جہازرانی کا بہت بڑا کام ہوا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے پرتگیزوں نے بھروچ کو بار بار لوٹا ہے۔ اور اسے تاراج بھی کیا۔ ۱۶۱۶ء میں سر ٹامس رائے نے بادشاہ جہانگیر سے یہاں تجارت کرنے کا پروانہ حاصل کیا تھا۔ اور انھوں نے بھروچ ہی میں سب سے پہلے کوٹھی کی بنیاد رکھی تھی۔ ۱۱۲

اورنگ زیب کے زمانے میں بھی شیواجی نے دو بار بھروچ پر حملہ کیا تھا۔ ۱۷۷۲ء میں بھروچ میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا اور یہاں انگریزی عمل داری شروع ہوگئی۔ جغرفیائی اعتبار سے بھروچ بڑا ہی زرخیز علاقہ مانا جاتا ہے اور یہاں اعلیٰ قسم کے کپاس کی پیداوار ہوتی ہے۔ ۱۹۰۱ء میں جب رانی وکٹوریہ کی وفات ہوئی تب بھروچ کے عوام نے چندہ اکٹھا کرکے ان کی یاد میں ایک ٹاور بنوایا تھا ۱۱۳ جو آج بھی وکٹوریہ ٹاور کے نام سے مشہور ہے۔ بھروچ کی کپڑا صنعت بہت مشہور تھی۔ یہاں کا بافتہ نام کا کپڑا ڈچ لوگ بہت پسند کرتے تھے اور وہ یوروپ تک تجارت کی غرض سے لے جاتے۔ کرنل ولیم اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ یہاں کے موچی جوتے اور گھوڑے کی زین بہت خوبصورت بناتے ہیں کہ اس قسم کی زین اور جوتے دوسری جگہ ملنا مشکل ہے۔ اس لیے یوروپ کے لوگ بھروچ سے یہ دونوں چیزیں خاص کر منگواتے تھے۔ ریشمی لحاف اور سوزنی آج بھی بھروچ کی مشہور ہے۔ دریا کے ساتھ ہر سال آئی ہوئی لاکھوں ٹن مٹی نے بھروچ کی بندرگاہ کی سطح کو اتھلا بنا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس بندرگاہ کی اہمیت کم ہوتی چلی گئی ہے۔ نربدا پر گارڈن برج دونوں کناروں کو جوڑتا ہوا ریلوے پل آج بھی مشہور ہے۔ اس پر سے اب موٹر گاڑیاں بھی جاتی ہیں۔ ۱۸۸۱ء میں انگریزوں نے یہ پل بنوایا تھا۔ اسی پل کے قریب ایک اور نیا پل بنوایا گیا ہے جس کی وجہ سے بھروچ کی آمد و رفت میں کافی آسانیاں ہو چکی ہیں۔ کیونکہ اس نئے پل سے ہائی وے نمبر ۸ گزرتا ہے۔ ۱۱۴ بھروچ نے اس وقت کافی ترقی کی ہے۔ آج سے ۵۰ سال ۶۰ سال پہلے بھروچ کے چھوٹو بھائی امبو بھائی پرانی

نے ایک ورزش گاہ بنوائی تھی۔ آج بھی یہاں ورزش کے چاہنے والے کھیل کود کے استادوں کی ٹریننگ ہوتی ہے۔ اسی طرح بھروچ نے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی۔ گرچہ بھروچ بندرگاہ بند ہوگئی۔ لیکن صنعتی اعتبار سے بھروچ نے کافی ترقی کی ہے۔ یہاں مصنوعی کھاد کا ایک وسیع پلانٹ نربدا ویلی نام کا بہت بڑا کارخانہ بنایا گیا ہے۔ حکومت گجرات نے یہاں ایسے تین کارخانے بنوائے ہیں جن کی وجہ سے بھروچ اور اس کے اطراف کی کایا پلٹ ہوگئی ہے۔ بھروچ سے قریب ہی دکن کی جانب راج پیپلا نامی ایک پرانا شہر ہے جہاں آج بھی قدیم راجاؤں کے محلات موجود ہیں۔ جنگلات اور کرجر ندی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہاڑیوں، جنگلات اور ندی وغیرہ نے بھروچ کے آس پاس کے علاقوں کو بہت ہی دلکش بنا دیا ہے۔ ۱۵؎

صرف گجرات بلکہ ہندوستان میں بھروچ اپنی ایک اور صنعت کے لیے انتہائی مشہور ہے کیونکہ اس کے قریب ہی انکلیشور شہر بسا ہوا ہے۔ جہاں ہندوستان کی مشہور فرٹیلائزر کمپنی آئی ہوئی ہے۔ یہ بھروچ سے تقریباً ۱۲ کلو میٹر کی دوری پر پیٹرولیم کی بہت بڑی کمپنی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گجرات میں سب سے زیادہ اور اچھا پیٹرولیم تیل اسی علاقے سے دستیاب ہوتا ہے۔ انکلیشور میں سے تیل کے کنویں دستیاب ہونے کی وجہ سے گجرات کا یہ شہر صنعتی کارخانوں سے چمک اٹھا ہے۔ اتنا ہی نہیں انکلیشور سے نکلا ہوا تیل رفائن ہونے کے لیے بڑودے کے پاس کوہلی پہنچایا جاتا ہے جو تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ ۱۶؎

دوسرے اضلاع کی طرح گجرات کا بھروچ بھی دنیاوی اور آسمانی مصیبتوں سے نہیں بچ سکا۔ آسمانی مصیبتوں نے بھروچ کو قدم قدم پر پریشان کر دیا ہے۔ دنیوی مصیبتوں نے اس پر بار بار حملہ کرکے اس کی حالت خراب کر دی۔ ۱۶۳۰ء میں بھروچ میں زبردست قحط پڑا۔ اس وقت یہاں مغل حاکموں کا راج تھا۔ ان لوگوں نے بھروچ کے لوگوں کی بڑی مدد کی۔ ۱۷۵۵ء میں بھروچ میں بالکل اناج نہیں ہوا۔ تب بھی حکومت نے یہاں کافی لگان معاف کر دیا تھا۔ ۱۷؎ اور ساتھ ہی روپیوں پیسوں سے

بھی مدد کی تھی۔ ۶۱-۱۷۶۰ء میں یہاں نوابوں کی حکومت تھی اور ساتھ ہی انگریز اور مہاراجہ سندھیانے بھی اس وقت بھروچ کی کافی مدد کی تھی۔ بھروچ کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں قحط سالی ہوتی رہی ہے اور عوام پریشان رہے۔ اکثر پڑوسی ریاست کے گوالے ان کے وہاں زراعت کم ہونے پر اپنے مویشیوں کو لے کر گجرات پہنچ جاتے۔ انھیں بھی سنبھالنا پڑتا۔ ایک بار بہت زیادہ بارش کی وجہ سے زراعت کو کافی نقصان ہوا۔ بے تحاشہ سیلاب نے لوگوں کو ہراساں کر دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب بھروچ میں بسنے والی تمام قومیں متحد ہوکر اپنے اپنے انداز میں پوجاپاٹھ اور عبادت کرنے لگی۔ سب نے مل کر جلوس نکالے اور دعائیں مانگیں جو قبول ہوئیں اور بارش کی شدت کم ہوگئی۔ بھروچ کی تاریخ میں یہ واقعہ اکثر لوگ بیان کرتے ہیں۔ قحط سالی کے علاوہ یہاں طوفان بھی بہت آئے اور انھوں نے بھروچ کو تاراج کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اس کے علاوہ متعدد بیماریوں سے بھی بھروچ نہ بچ سکا۔ جیسے طاعون بخار جیسی بیماریوں نے بھی آن پکڑا اور ان بیماریوں کی وجہ سے ہزاروں جانیں گئیں۔ لوگ بھروچ چھوڑ کر دوسرے شہروں میں منتقل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ ایک بار بھروچ شہر خالی ہوگیا۔ زیادہ تر باشندے بھروچ چھوڑ کر چلے گئے۔ ۱۱۸

جب مغل حکومت کمزور ہو چکی تھی اور مغل وارث مجبور و لاچار ہوچکے تھے تب ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ نے دہلی کا تخت حاصل کیا اس وقت ہندوستان میں ہر جگہ چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں قائم ہوچکی تھیں۔ جیسے ۱۷۲۷ء میں کاٹھیواواڑ میں مانگرول (کتیانہ) اوناستراپاڑہ، سومناتھ کے تھانیداروں نے ان مقامات کو اپنی جاگیریں بنا لی تھیں۔ ۱۷۲۹ء میں بھاؤنگر اور ۱۷۳۰ء دھانگدرا ریاستیں وجود میں آئیں۔ ۱۷۴۸ء میں شیر خان بابی جوناگڑھ کا خودمختار حکمران بن بیٹھا۔ ۱۷۲۹ء میں بھروچ بھی خود مختار حکومت بن گئی۔ ادھر مومن خاں دوم ناظم گجرات تھا۔ احمدآباد مراٹھوں کے سپرد کرکے کھمبایت میں اپنی خودمختار ریاست بنا لی۔ سارے ہندوستان میں انتشار پھیلا ہوا تھا۔ ادھر دکن بھی جنگ کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہاں فرانسیسی اپنے قدم جمانے میں مشغول

تھے اور ان کے حریف انگریز کسی طرح انھیں وہاں سے نکال دینے کے درپۂ آزار تھے۔ کرناٹک اور حیدرآباد میں بھی جانشینی کے جھگڑے تھے۔ تمام ہندوستان میں بڑی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ [۱۱۹]

بھروچ کا نواب خاندان

۱۷۲۳ء میں مرزا عبداللہ بیگ بھروچ کا متصدی تھا۔ جب آصف جاہ گجرات چھوڑ کر جانے لگا تو اس نے اپنی جاگیر کا علاقہ بھروچ عبداللہ بیگ کو دے دیا۔ اور ساتھ ہی اسے نیک عالم خان کا خطاب بھی عطا کیا۔ اس طرح بھروچ میں ۱۷۲۰ء سے خود مختار نوابی سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۷۳۸ء میں عبداللہ بیگ کا انتقال ہوا اور ان کا بیٹا مرزا بیگ جانشین ہوا۔ اور یہ نواب نیک عالم خان دوّم کے نام سے مشہور ہوا۔ نیک عالم دوّم کی وفات کے بعد ان کا بھائی بھروچ کی ریاست کا حقدار ہوا اور صرف تین ماہ کے عرصے میں داعی اجل ہوا۔ اب عبداللہ بیگ کے پوتے مرزا احمد بیگ خلف مرزا محمد بیگ کو بھروچ کی ریاست کا جانشین بنایا گیا۔ [۱۲۰] یہ حضرت نواب حامد بیگ کے نام سے مشہور تھے۔ انھوں نے 'رفیع الدولہ' کا خطاب اختیار کیا۔ موصوف علم دوست نواب تھے۔ ان کا دربار علماء اور شعراء سے بھرا رہتا تھا۔ اس ریاست میں دور دور سے ادیب اور شاعر آیا کرتے تھے اور نواب صاحب ان کی مدارات بھی کرتے تھے۔ نواب کو شعر وسخن سے بڑا شغف تھا۔ وہ صاحبؔ تخلص کرتے تھے۔ شاعری میں کافی دسترس رکھتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے معز خان جو 'امتیاز الدولہ' کا خطاب رکھتے تھے۔ جانشین ہوئے۔ کسی بناء پر نواب صاحب کی کمپنی سرکار سے ناراضگی ہوگئی۔ اور اسی کو بہانہ بنا کر کمپنی سرکار نے بھروچ کو اپنے قبضہ اختیار میں لینے کی کوشش کی اور نواب صاحب کے ساتھ جنگ چھیڑ دی۔ نواب نے شکست کھائی اور انگریز بھروچ کے مالک بن بیٹھے۔ نواب صاحب کے ایک درباری شاعر غمگینؔ نے جنگ کے اس واقعہ کی ایک رمزیہ مثنوی لکھی ہے۔ جس کا عنوان 'جنگ غمگینؔ' ہے۔ [۱۲۱] بھروچ پر قابض ہوجانے کے بعد انگریزوں نے نواب خاندان کو بالکل نظرانداز کر دیا۔

لہٰذا ان کے بیٹے احدالدین لندن چلے گئے۔ اور وہاں جاکر انھوں نے کمپنی کے ڈائرکٹر کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا۔ جس میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی اور اس سے انھیں اور ان کے خاندان کے قریبی اعزا کو وظیفہ ملنے لگا۔ احد الدین ۱۷۷۲ء میں اپنے والد کے ساتھ بمبئی چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اور اپنے والد کی وفات کے بعد ۱۷۹۴ء میں وہ لندن چلے گئے۔ یہ بھی علمی ادبی ذوق کے آدمی تھے۔ ضائق تخلص کرتے تھے۔ ۱۲۲

ریاست بھروچ کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے پتہ چلتا ہے کہ یہ ریاست ہر اعتبار سے مصیبت و آلام سے گھری ہوئی تھی۔ کاتب تقدیر نے شاید اس ریاست کی قسمت میں سکون و آسائش بہت ہی کم رکھا تھا۔ ہر طرح کی مصیبتوں نے بھروچ کا سختی سے امتحان لیا۔ اس کے باوجود یہاں کے حکمرانوں نے کسی نہ کسی طرح ادب کی خدمت ضرور کی لہٰذا جب کبھی بھی کسی نواب کو تھوڑا بہت سکون میسّر آتا وہ شعراء اور ادباء کی محفلیں جماتے اور ان کی خدمات ضرور کرتے اور ساتھ ہی کئی ایسے نواب بھی گزرے جو خود بھی شاعر اور ادیب تھے اور انھوں نے کسی نہ کسی طرح اردو ادب میں اضافہ کیا۔

بھروچ کے شعرا

فائق

سید محمد نورالدین حسین بن قاضی سید احمد حسین شیرازی ان کا نام تھا۔ اور فائق تخلص کرتے تھے۔ یہ ۱۸۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا۔ فائق گجرات کے مشہور بزرگ سید احمد جعفر شیرازی کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ حسب و نسب کے لحاظ سے ان کا واسطہ دسویں امام محمد تقیؑ سے ملتا ہے۔ ان کے خاندان کے ایک بزرگ سید ابراہیم مدینہ سے شیراز گئے۔ یہ خاندان شیراز میں بس گیا اور سید محمد شیرازی پہلے سندھ آئے اور سندھ سے گجرات میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔ فائق کے اسلاف بھروچ، احمدآباد وغیرہ میں تقریباً دو سو سال تک عہدہ قضاۃ پر فائز رہے۔ ان کے جد امجد سید حسن عرف سید میاں ۱۷۶۳ء میں دہلی میں ایک شہزادے

کے اتالیق مقرر کیے گئے۔ شاہ عالم ثانی نے بھروچ کے نواب مرزا رفیع الدولہ کے عہد میں سید احمد حسین کو بھروچ میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر معمور کیا۔ فائقؔ کے خاندان میں بیعت و خلافت کا سلسلہ بھی بزرگوں سے قائم ہے۔

فائق نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی شادی احمد آباد کے قاضی صدرالحق کی صاحبزادی سے ہوئی تھی ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ دوسری شادی بھروچ کے رئیس میر غلام علی کی بیٹی سے ہوئی۔ جن سے دو بیٹے تولد ہوئے۔ ایک کا نام سید محمد عرف سجاد حسین تھا جو بہت کم عمری میں فوت ہو گئے۔ دوسرے بیٹے کا نام سید احمد حسین تھا فائق کے بعد یہی احمد حسین قضاتا کے عہدے پر معمور ہوئے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مخزن الشعرا کے دیباچہ میں سید احمد حسین کا ذکر کیا ہے۔ یہ بڑے ادب نواز اور علم دوست تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے جو اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ سید زین سورت میں ٹریننگ کالج کے پرنسپل تھے۔

فائقؔ کی تعلیم و تربیت قدیم طرز پر گھر ہی میں ہوئی تھی۔ انھیں فارسی سے زیادہ شغف تھا۔ ان کی تصانیف میں (۱) طالعِ نجوم (۲) ذکر فرمان روانِ ہندوستان (۳) تذکرۂ ساداتِ شیرازیہ (۴) انشاء اسلام خوانی (۵) مخزن الشعرا (تذکرۂ شعراءِ گجرات) اور انھوں نے کئی کتابوں پر تقریظیں بھی لکھی ہیں۔۱۲۳

نمونہ کلام

جان دی تب ہوا وصالِ صنم
نفع کو دیکھ اور ضرر کو دیکھ
شمع پروانہ دیکھتا ہے کیا
تو مری شورش جگر کو دیکھ
کیا وہ جیتا ہے ہجر میں ظالم
پوچھتا ہے یہ نامہ بر کو دیکھ
ان کا پیکاں ہے آبدار بہت
پر میرے خون کا پیاسا ہے

اس بلندی پہ کیوں فلک ہے غرور
جتنی رفعت ہے وہ ہی پستی ہے

......

یاس امید کے جھگڑے میں پھنسے ہیں فائق
کب خدا جانے ہمیں ان سے رہائی ہوگی

......

ہوا یہ غم کھلی جب خلد میں آنکھ
یہاں کوچہ سے تیرے کون لایا

......

زلف کے کھلتے ہی تاریکی ہوئی شب میں نمود
روزِ محشر پر گرا سایہ شبِ دیجور کا ۱۲۴

......

اعجاز

عبدالقادر نام اور اعجاز تخلص کرتے تھے۔ رضوان مرادآبادی جو غالب کے شاگرد تھے ان سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ان کا وطن بھروچ تھا۔ گجرات کے اساتذۂ فن میں شمار کیے جاتے تھے۔ بڑی خوبی کی بات تو یہ ہے کہ امیر اور داغ سے انھیں شرف نیاز حاصل تھا۔ ایک جگہ خود لکھتے ہیں کہ ؎

تحریر داغ کہتی ہے جادو بیاں مجھے
خط میں امیر نے بھی لکھا نکتہ داں مجھے
اعجاز اپنے نام کا میں ایک ہی تو ہوں
کیا جانتے نہیں بت ہندوستاں مجھے

اعجاز کی حضرت سیماب سے اکثر نوک جھونک رہتی تھی۔ ایک دفعہ سیماب مرحوم مشاعرہ کے سلسلے میں سورت تشریف لائے تھے۔ محلّہ ترکی واڑہ میں محمدی محل نامی حویلی

میں مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ اعجازؔ نے اپنی طرحی غزل پڑھی جس میں ردیف 'پیشِ نظر کے سامنے' تھا۔ صدرِ مشاعرہ سیمابؔ تھے۔ جب انھوں نے اپنا کلام سنانا شروع کیا تو اعجازؔ پر اس طرح چوٹ کی ۔

کھل گیا سیمابؔ اعجازؔ بھروچی کا بھرم
لکھ گیا مردِ خدا پیش نظر کے سامنے

اعجازؔ نے تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے پوتے نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ نواسے مرحوم عبدالقادر بھی شاعر تھے اور کمترؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کا جھکاؤ تصوف کی طرف بہت زیادہ تھا۔ ۱۲۵

نمونۂ کلام

خیال زلف لیلیٰ جان بنکر دل میں رہ جاتا
جنون قیس کا پردہ اگر محمل میں رہ جاتا

......

شیشہ میں مئے سرخ بھری آئے گی
دیوانہ بنانے کو پری آئے گی
اعجازؔ میں مدہوش ہوا چاہتا ہوں
لینے کو خبر بے خبری آئے گی

......

اچھی طرح پہچان لے جادو والے
بندے کو ہی اعجازؔ کہا کرتے ہیں ۱۲۶

......

قطبی

جمال الدین حسن خان خلف نواب نورالدین خان نواب بھروچی تھے۔ قطبیؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کا شمار عالموں میں ہوتا تھا۔ یہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ۱۲۷

نمونۂ کلام

بوسہ وہ پہلے دیا کرتے تھے ہم کو بے حساب
خوبیٔ قسمت سے اب ٹھہرے ہیں بدلے سب کے دو
ایک بوسہ اس قفِ پا کا غنیمت ہے ہمیں
یہ کہاں اپنا دہن کہتے جو دو تم لب کے دو ۱۲۸

ریاست گجرات کا احمدآباد ایک مشہور تاریخی شہر ہے۔ وہ اپنی جاہ و جلالی کے اعتبار سے تاریخ کے ہر دور میں مشہور و معروف رہا۔ سلاطین دہلی کے زمانے میں بھی گجرات کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ اور یہ پٹن کے بعد ہمیشہ سے گجرات کا مرکز رہا۔ ہم نے اس کی تاریخی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اس کے مشائخ اور ان کی خانقاہوں وغیرہ کا بھی احاطہ کیا ہے۔ کیونکہ احمدآباد ہمیشہ سلاطین کے زیر دست رہا۔ جس کی وجہ سے دوسری ریاستوں کی طرح یہاں امراء و رؤسا کا غلبہ دکھائی نہیں دیتا بلکہ یہاں سلطان یا بادشاہ ہی ہمیشہ مختار کامل ہوا کرتا تھا۔ پھر بھی ہم نے مکالمے کو مدنظر رکھتے ہوئے یہاں کے اس وقت کے شعراء حضرات کی ادبی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن بڑودہ اور بھروچ کے امراء و شعراء حضرات کی سرپرستی کا فخر حاصل ہے۔ کئی امراء حضرات بذاتِ خود ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے اور خود بھی شاعر متکلم تھے۔ جیسے بڑودہ میں افسرؔ، فداؔ وغیرہ اور اسی طرح بھروچ میں فائقؔ، اعجازؔ اور قطبی وغیرہ تھے۔ ان تمام شعراء حضرات کا شمالی اساتذہ شعراء کے ساتھ براہِ راست تعلق بھی تھا کئیں حضرات نے ان کے تلامذہ سے بھی فیض اٹھایا ہے اور اردو ادب کی خدمات میں اپنا گراں مایہ حصّہ ادا کیا ہے۔

☆

حواشی

۱۔ ઐતિહાસિક નગરી અમદાવાદ પેજ - ૯, રત્નમણિ રાવ ભીમરાવ જોટે, અકદસ પ્રકાશન બેગમપુરા સુરત
ایتہاسِک نگری احمد آباد صفحہ ۹ رتن منی راؤ بھیم راؤ جوٹے، اقدس پرکاشن بیگم پورا سورت
۲۔ تمدنی کارنامے صفحہ ۱۲
۳۔ ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات صفحہ ۱۱۷
۴۔ مشائخ احمد آباد صفحہ ۲۵ سے ۳۲ مولانا یوسف مثالا، کتب خانہ انورحسن کراچی ۱۹۹۳ء
۵۔ تاریخ اولیاءِ گجرات صفحہ ۳، مولوی ابوظفر ندوی صاحب، گجرات اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر
۶۔ رسالۂ زبان، بنائے احمد آباد
۷۔ مشائخ احمد آباد جلد اول صفحہ ۱۶، مولانا محمد یوسف این سلیمان متالہ، کتب خانہ انور شاہ کراچی ۱۹۹۳ء
۸۔ تاریخ اولیاء گجرات صفحہ ۷، مولوی ابوظفر ندوی صاحب، گجرات اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر
۹۔ مشائخ احمد آباد جلد اول صفحہ ۱۶، مولانا محمد یوسف این سلیمان متالہ، کتب خانہ انور شاہ کراچی ۱۹۹۳ء
۱۰۔ مرات سکندری صفحہ ۲۴ سے ۲۸ بحوالہ تاریخ ادبیات ۱۵۴۱ء
۱۱۔ تاریخ اولیاء گجرات صفحہ ۲۴، مولوی ابوظفر ندوی صاحب، گجرات اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر
۱۲۔ مشائخ احمد آباد ۲۵ مولانا محمد یوسف این سلیمان متالہ، کتب خانہ انور شاہ کراچی ۱۹۹۳ء
۱۳۔ تاریخ اولیاء گجرات صفحہ ۱۲ سے ۱۷، مولوی ابوظفر ندوی صاحب، گجرات اردو ساہتیہ اکادمی
۱۴۔ مشائخ احمد آباد صفحہ ۲۹، مولانا محمد یوسف این سلیمان متالہ، کتب خانہ انور شاہ کراچی ۱۹۹۳ء
۱۵۔ تاریخ اولیاء گجرات صفحہ ۲۲ سے ۲۴ مولوی ابوظفر ندوی صاحب، گجرات اردو ساہتیہ اکادمی
۱۶۔ تمدنی کارخامے جلد دوم صفحہ ۴۰۵
۱۷۔ مشائخ احمد آباد صفحہ ۲۸ سے ۳۹، مولانا محمد یوسف این سلیمان متالہ، کتب خانہ انور شاہ کراچی ۱۹۹۳ء
۱۸۔ تاریخ فرشتہ صفحہ ۵۰، محمد قاسم فرشتہ
۱۹۔ تاریخ اولیاء گجرات صفحہ ۴۰، مولوی ابوظفر ندوی صاحب، گجرات اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر
۲۰۔ مشائخ احمد آباد صفحہ ۴۴، مولانا محمد یوسف این سلیمان متالہ، کتب خانہ انور شاہ کراچی ۱۹۹۳ء
۲۱۔ تاریخ اولیاء گجرات صفحہ ۲۲۶، مولوی ابوظفر ندوی صاحب، گجرات اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر
۲۲۔ ઐતિહાસિક નગરી અમદાવાદ પેજ - ૨૪, રત્નમણિ રાવ ભીમરાવ જોટે, અકદસ પ્રકાશન બેગમપુરા સુરત-૨૦૦૬
ایتہاسِک نگری احمد آباد صفحہ ۲۴ رتن منی راؤ بھیم راؤ جوٹے، اقدس پرکاشن بیگم پورا سورت ۲۰۰۶ء
۲۳۔ تمدنی کارخامے جلد دوم صفحہ ۴۰۷
۲۴۔ ઐતિહાસિક નગરી અમદાવાદ પેજ - ૬૦-૬૧, રત્નમણિ રાવ ભીમરાવ જોટે, અકદસ પ્રકાશન બેગમપુરા સુરત-૨૦૦૬
ایتہاسِک نگری احمد آباد صفحہ ۶۰، ۶۱ رتن منی راؤ بھیم راؤ جوٹے، اقدس پرکاشن بیگم پورا سورت ۲۰۰۶ء
۲۵۔ تاریخ اولیاء گجرات صفحہ ۴۵ سے ۵۰، مولوی ابوظفر ندوی صاحب، گجرات اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر

۲۶۔ مرات سکندری صفحہ ۲۸
۲۷۔ مشائخ احمدآباد صفحہ ۸۷، مولانا محمد یوسف این سلیمان متالہ، کتب خانہ انور شاہ کراچی ۱۹۹۳ء
۲۸۔ مراتِ احمدی صفحہ ۵۲
۲۹۔ تاریخ اولیاء گجرات صفحہ ۷۴، ۷۵، مولوی ابوظفر ندوی صاحب، گجرات اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر
۳۰۔ مشائخ احمدآباد صفحہ ۸۸، ۸۹، مولانا محمد یوسف این سلیمان متالہ، کتب خانہ انور شاہ کراچی ۱۹۹۳ء
۳۱۔ تاریخ اولیاء گجرات صفحہ ۷۶، ۷۷، مولوی ابوظفر ندوی صاحب، گجرات اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر
۳۲۔ تاریخ مشائخ احمدآباد صفحہ ۹۳، ۹۴، مولانا محمد یوسف این سلیمان متالہ، کتب خانہ انور شاہ کراچی ۱۹۹۳ء
۳۳۔ سخنوران گجرات صفحہ ۲۶۳، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی صاحب
۳۴۔ متاع کلیم صفحہ ۳، کلیم احمدآبادی، یونیورسل فائن آرٹ ایتھرپریس ٹھاکر دوار نوروجی اسٹریٹ بمبئی
۳۵۔ متاع کلیم صفحہ ۴، کلیم احمدآبادی، یونیورسل فائن آرٹ ایتھرپریس ٹھاکر دوار نوروجی اسٹریٹ بمبئی
۳۶۔ یادوں کے سائے صفحہ ۵۲، محمد نقی جاوید انصاری، خطیب کتاب گھر ۲۰۰۱ء
۳۷۔ جلوۂ نار میرٹھ ۱۹۷۱ء
۳۸۔ متاع کلیم صفحہ نمبر ۷، ۱۹۸۸ء
۳۹۔ گلزارِ طیبہ صفحہ ۴، ۵، کلیم بک ڈپو اینڈ آفسیٹ پرنٹرس
۴۰۔ متاع کلیم صفحہ نمبر ۱۳
۴۱۔ گلزارِ طیبہ صفحہ ۱۶، ۱۷، کلیم بک ڈپو اینڈ آفسیٹ پرنٹرس
۴۲۔ کائنات فخر صفحہ ۴، سید فخرالدین قادری فخر گجرات، اردو ساہتیہ اکادمی ۱۹۹۹ء
۴۳۔ کائنات فخر صفحہ ۷، ۸، سید فخرالدین قادری فخر گجرات، اردو ساہتیہ اکادمی ۱۹۹۹ء
۴۴۔ میخانۂ حسین، فخرالدین فخر
۴۵۔ متاع کلیم صفحہ ۳، ۴، کلیم احمدآبادی، یونیورسل فائن آرٹ ایتھرپریس ٹھاکر دوار نوروجی اسٹریٹ بمبئی
۴۶۔ یادوں کے سائے صفحہ ۵۲، محمد نقی جاوید انصاری، خطیب کتاب گھر ۲۰۰۱ء
۴۷۔ ایضاً صفحہ ۵۴
۴۸۔ ایضاً ۵۵
۴۹۔ لفظوں کا سفر، جمیل کلیمی
۵۰۔ یادوں کے سائے صفحہ ۵۸، محمد نقی جاوید انصاری، خطیب کتاب گھر ۲۰۰۱ء
۵۱۔ سخنوران گجرات صفحہ ۲۳۵، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۹۸۱ء
۵۲۔ ایضاً صفحہ ۲۴۰
۵۳۔ ایضاً صفحہ ۲۳۵
۵۴۔ ایضاً صفحہ ۲۳۵

۵۵؎ سخنوران گجرات صفحہ ۲۳۶، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۹۸۱ء
۵۶؎ ایضاً صفحہ ۲۳۶ سے ۲۴۰
۵۷؎ شعرائے گجرات صفحہ ۱۹۹، ایم۔ اے۔ شعلہ، امت پرکاشن ۱۹۸۳ء
۵۸؎ سخنوران گجرات صفحہ ۱۱۶، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی ۱۹۸۱ء
۵۹؎ ایضاً صفحہ ۱۱۷
۶۰؎ دیوان فدا صفحہ ۳، سید اشرف کچھوچھوی، مطبوعہ عثمانی پریس مدراس ۱۹۷۹ء
۶۱؎ رولرس آف بڑودہ از ایف۔ اے۔ ایچ۔ ایلیٹ
۶۲؎ سلاطین بڑودہ، فارسی ترجمہ از مولوی فریدالدین صفحہ ۳
۶۳؎ سلاطین بڑودہ صفحہ ۱۴۷
۶۴؎ افسر مودودی حیات و شاعری، سید اشرف کچھوچھوی، مطبوعہ عثمانی پریس مدراس ۱۹۷۹ء
۶۵؎ سخنوران گجرات صفحہ ۱۱۸، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۹۸۱ء
۶۶؎ کتاب سلاطین بڑودہ، ضمیمہ مولوی فریدالدین استادِ فارسی بڑودہ کالج
۶۷؎ ગુજરાતની અસ્મિતા પેજ - ૧૮-૧૯, રજની વ્યાસ, અક્ષરા પ્રકાશન
گجرات نی اَسمِتا صفحہ ۱۸، ۱۹ رجنی ویاس، اکشرا پرکاشن
بحوالہ افسر مودودی حیات و شاعری سید اشرف الدین کچھوچھوی
۶۸؎ سخنوران گجرات صفحہ ۱۶۸، سید ظہیرالدین مدنی صاحب، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۹۸۱ء،
افسر مودودی حیات و شاعری صفحہ ۱۶، ۱۷، ۱۸
۶۹؎ سخنوران گجرات صفحہ ۳۲۱، سید ظہیرالدین مدنی صاحب، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۹۸۱ء
۷۰؎ مضامین مدنی صفحہ ۱۲۴، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، گجرات اردو اکادمی ۱۹۹۰ء
۷۱؎ سخنوران گجرات صفحہ ۳۲۲، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۹۸۱ء
۷۲؎ مضامین مدنی صفحہ ۱۲۴، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، گجرات اردو ساہتیہ اکادمی ۱۹۹۰ء
۷۳؎ سخنوران گجرات صفحہ ۳۲۲، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۹۸۱ء
۷۴؎ ایضاً ۱۲۲
۷۵؎ جلوۂ یار میرٹھ سے اور پیام یار لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔
۷۶؎ دیوان فدا صفحہ ۱۸ سید اشرف کچھوچھوی
۷۷؎ سخنوران گجرات صفحہ ۲۲۴، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۱۹۸۱ء
۷۸؎ دیوان فدا صفحہ ۵۴ سید اشرف کچھوچھوی
۷۹؎ سخنوران گجرات صفحہ ۲۲۴، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۱۹۸۱ء
۸۰؎ دیوان فدا صفحہ ۵۵، ۵۶ سید اشرف کچھوچھوی

۸۱۔ دیوان فدا صفحہ ۵۸ سید اشرف کچھوچھوی
۸۲۔ ایضاً صفحہ ۶۰
۸۳۔ ایضاً صفحہ ۵۴
۸۴۔خزینۃ الانساب مولوی سید ابوالاولیٰ کی نظر احمد افسوں مہروائی مطبوعہ نظامی پریس بدایوں اوّل ۱۹۵۹ء
۸۵۔ دیوان فدا
۸۶۔سخنوران گجرات صفحہ ۲۲۲، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۱۹۸۱ء
۸۷۔ ایضاً صفحہ ۲۲۷
۸۸۔ ایضاً صفحہ ۲۲۵
۸۹۔طور کلیم اور بزم سخن بھوپال
۹۰۔سخنوران گجرات صفحہ ۲۳۲، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۱۹۸۱ء
۹۱۔ ایضاً صفحہ ۲۲۵
۹۲۔ ایضاً صفحہ ۲۳۲
۹۳۔ ایضاً صفحہ ۲۲۳
۹۴۔ضمیمہ میر صاحب کا خاندان
۹۵۔سخنوران گجرات صفحہ ۲۲۴، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۱۹۸۱ء
۹۶۔ ایضاً صفحہ ۲۲۷
۹۷۔ افسر مودودی - حیات و شاعری صفحہ ۱۹، سید اشرف کچھوچھوی، عثمانی پریس مدراس ۱۹۷۹ء
۹۸۔ ایضاً صفحہ ۲۰
۹۹۔ ایضاً صفحہ ۲۳
۱۰۰۔ ایضاً صفحہ ۲۴
۱۰۱۔ ایضاً صفحہ ۲۵
۱۰۲۔ ایضاً صفحہ ۲۶
۱۰۳۔ ایضاً صفحہ ۲۸
۱۰۴۔ ایضاً صفحہ ۲۹، ۳۰
۱۰۵۔ ایضاً صفحہ ۴۵، ۴۶
۱۰۶۔ ایضاً صفحہ ۵۱
۱۰۷۔ ایضاً صفحہ ۵۲
۱۰۸۔ ایضاً صفحہ ۵۲

۱۰۹۔ ભરૂચ શહેરનો ઈતિહાસ પૃ-૩ થી ૫, ગણપતરામ હિંમતરામ દેસાઇ, જ્ઞાનાદેય પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ ભરૂચ-૧૯૭૦

بھروچ شہرنو اِتہاس، صفحہ ۳ سے ۵ گنپت رام ہمت رام دیسائی، گیانودَے پرنٹنگ پریس بھروچ ۱۹۷۰ء

۱۱۰۔ ભાંગ્યું તોયે ભરૂચ પૃ-૨૨ પ્રશાંત દિલીપ પંજ્યા હિંમતલાલ ૧૯૭૦

بھانگیو توئے بھروچ صفحہ ۲۲، پرشانت دلیپ پنجیا ہمت لال ۱۹۷۰ء

۱۱۱۔ ભાંગ્યું તોયે ભરૂચ પૃ-૩૦ પ્રશાંત દિલીપ પંજ્યા હિંમતલાલ ૧૯૭૦

بھانگیو توئے بھروچ صفحہ ۳۰، پرشانت دلیپ پنجیا ہمت لال ۱۹۷۰ء

۱۱۲۔ ભરૂચ શહેરનો ઈતિહાસ પૃ-૨૭૬, ગણપતરામ હિંમતરામ દેસાઇ, જ્ઞાનાદેય પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ ભરૂચ-૧૯૭૦

بھروچ شہرنو اِتہاس، صفحہ ۲۷۶ گنپت رام ہمت رام دیسائی، گیانودَے پرنٹنگ پریس بھروچ ۱۹۷۰ء

۱۱۳۔ ગુજરાતની અસ્મિતા પૃ-૧૬ રજના વ્યાસ, અક્ષરા પ્રકાશન

گجرات نی اَسمِتا صفحہ ۱۶، رجنا ویاس، اکشرا پرکاشن

۱۱۴۔ ગુજરાતની અસ્મિતા પૃ-૧૬ રજની વ્યાસ, અક્ષરા પ્રકાશન

گجرات نی اَسمِتا صفحہ ۱۶، رجنا ویاس، اکشرا پرکاشن

۱۱۵۔ ગુજરાતની અસ્મિતા પૃ-૧૭-૧૮ રજની વ્યાસ, અક્ષરા પ્રકાશન

گجرات نی اَسمِتا صفحہ ۱۷، ۱۸، رجنا ویاس، اکشرا پرکاشن

۱۱۶۔ تاریخ اولیاء گجرات صفحہ ۲۳۳، ۲۳۴، مولوی سید ابو ظفر ندوی گجرات اردو اکادمی ۱۹۹۲ء

۱۱۷۔ ભાંગ્યું તોયે ભરૂચ પૃ-૬૨ પ્રશાંત દિલીપ પંજ્યા હિંમતલાલ ૧૯૭૦

بھانگیو توئے بھروچ صفحہ ۶۲، پرشانت دلیپ پنجیا ہمت لال ۱۹۷۰ء

۱۱۸۔ ભાંગ્યું તોયે ભરૂચ પૃ-૬૩ પ્રશાંત દિલીપ પંજ્યા હિંમતલાલ ૧૯૭૦

بھانگیو توئے بھروچ صفحہ ۶۳، پرشانت دلیپ پنجیا ہمت لال ۱۹۷۰ء

۱۱۹۔ سخنوران گجرات صفحہ ۱۱۸، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۱۹۸۱ء

۱۲۰۔ ایضاً صفحہ ۳۱۹

۱۲۱۔ گجرات کی مثنویاں صفحہ ۱۲۲، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، گجرات ساہتیہ اکادمی ۱۹۹۰ء

۱۲۲۔ مضامین مدنی صفحہ ۱۲۴، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، گجرات ساہتیہ اکادمی ۱۹۹۰

۱۲۳۔ سخنوران گجرات صفحہ ۲۱۵، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۱۹۸۱ء

۱۲۴۔ مخزن الشعراء مقدمہ نورالدین فائق، انجمن ترقی ہند

۱۲۵۔ سخنوران گجرات صفحہ ۲۱۶، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۱۹۸۱ء

۱۲۶۔ ایضاً صفحہ ۲۲۰

۱۲۷۔ شعرائے گجرات صفحہ ۹۵، اے۔ ایم۔ شعلہ امت پرکاشن، راجستھان ۱۹۸۳ء

۱۲۸۔ سخنوران گجرات صفحہ ۲۲۰، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۱۹۸۱ء

Gazetteers of Gujarat

Ahmedabad

1st Addition - 1984

- Printed in India by the Manager. Govt. Printing and Stationery, Ahmedabad.
- Published by the director, Govt.
- Printing, Stationery and Publications. Gujarat state Ahmedabad.

Vadodra

1st Addition - 1879

- Printed in India by the Manager. Govt. Printing and Stationery, Vadodra.
- Published by the director, Govt.
- Printing, Stationery and Publications. Gujarat state Ahmedabad.

Bharuch

1st Addition - 1975

- Printed in India by the Manager. Govt. Printing and Stationery, Bharuch.
- Published by the director, Govt.
- Printing, Stationery and Publications. Gujarat state Ahmedabad.

باب پنجم

انیسویں صدی میں کھمبایت، پالن پور، مانگرول
اور جوناگڑھ کی ریاستوں میں اردو زبان و ادب
کے ارتقاء میں رؤسا و امراء کا حصّہ

باب پنجم

انیسویں صدی میں کھمبایت، پالن پور، مانگرول اور جوناگڑھ کی ریاستوں میں اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں رؤسا و امراء کا حصّہ

کھمبایت

کھمبایت کی وجہ تسمیہ

لفظ کھمبایت کے معنی سمندر کے ساحل پر بسنے والا شہر۔ اسے کھمبایت (کھمبات) کھمبا اپچ وغیرہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ کھم کا مطلب کھمبا ویسے گجراتی زبان میں کھم کا مطلب کنارے پر کی زمین یا ساحل۔ کیونکہ کھمبایت سمندر کے ساحل پر بسا ہوا ہے۔[1]

خلیج کھبات بحیرۂ عرب کا حصّہ ہے۔ کھمبایت کی کل لمبائی ۸۰ مائل ہے۔ اس کی عرض ۳۰ مائل ہے۔ اس کا شمالی سرا بارہ مائل جتنا سکڑ جاتا ہے۔ اسی خلیج کے کنارے کھمبایت شہر بسا ہوا ہے۔ تاپی، کیم، نربدا، دھاڈر، اورنگا، پورڈا، مہی، سابرمتی، سکھ بھادو، اتاولی، کلویٹھ اور شیترنجی ندیاں خلیج کھمبایت میں گرتی ہیں۔ ان تمام ندیوں کا دہانہ اس خلیج میں ہے۔ خلیج کا یہ حصّہ بہت تنگ ہونے کی وجہ سے ہر مہینے کی پونم اور اماوس کے دن اک میں زبردست جوار بھاٹا ہوتا ہے۔ (مد و جذر) یہ خلیج انتہائی تنگ ہونے کی وجہ سے موجیں کافی اونچائی تک اچھلتی ہیں اور خشک زمین کے بہت بڑے حصّے تک سمندر کا پانی پھیل جاتا ہے۔ مدتوں سے خلیج کھمبایت میں مندرجہ بالا ندیاں سینکڑوں ٹن سیلابی مٹی لاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ خلیج آہستہ آہستہ اُتھلی ہوتی جا رہی

ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ ندی کے پانی میں تقریباً نصف حصّہ مٹی ملی ہوئی دیکھی جا سکتی ہے۔ سمندری علاقہ کی وجہ سے یہ جزیرۂ مالدیپ تک پھیل جاتا ہے جس کی وجہ سے ابھی تک یہ خلیج بھری نہیں ورنہ صدیوں سے آئی ہوئی مٹی کی وجہ سے خلیج کھمبایت اب تک میدانی علاقہ بن گیا ہوتا۔[۲]

شہر کھمبایت کی قدیم ساخت

کھمبایت ریاست گجرات کے قدیم شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دوسرے شہروں کی طرح اس کے اطراف بھی قلعہ بنا ہوا تھا۔ یہ قلعہ کب اور کس نے بنوایا تھا اس کے متعلق تاریخ داں صریح طور پر کچھ بتا نہیں پائے لیکن سولنکی اور واگھیلا کے زمانے میں بھی اس قلعہ کا ذکر ملتا ہے۔ کیونکہ وستوپال اور سنکھ کے درمیان جو جنگ ہوئی تھی وہ ساحل سمندر کے کنارے بتائی جاتی ہے۔[۳] ۱۲۹۷ء میں کرن واگھیلا پر سلطان دہلی نے حملہ کیا تھا۔ اور اس فوج کے سردار نے شہر کھمبایت میں لوٹ مار کی تھی۔ اس وقت وہاں اسی طرح قلعہ موجود تھا۔ مرأت سکندری کے مؤرخ نے ۱۶۱۱ء میں کھمبایت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس قلع میں دروازے موجود تھے۔ اور انھوں نے بھروچ کا دروازہ اور احمدآبادی دروازے کا ذکر اپنے بیان میں کیا ہے۔ اسی طرح مراتِ احمدی کے مصنف نے بھی گوارہ اور فرجا دروازوں کا ذکر کیا ہے۔ کھمبایت کی تاریخ میں مومن خان نے قلعہ درست کروایا اس کا ذکر موجود ہے۔[۴]

۱۶۳۸ء میں ایک جرمن سیاح کھمبایت آیا تھا اور اس نے اپنے سفرنامے میں کھمبایت کا بھی ذکر کیا ہے وہ کہتا ہے شہر کھمبایت کے اطراف ایک مضبوط قلعہ بنا ہوا ہے۔ جس کے بارہ دروازے ہیں۔ اس شہر میں کافی بڑی بڑی عمارتیں ہیں۔ راستے چوڑے اور سیدھے ہیں۔ بالکل شہر سورت کی طرح بڑے بڑے مرأت احمدی کے نقشے میں کھمبایت کا جو نقشہ بتایا گیا ہے۔ اس میں مشرق اور مغرب سمت میں چار چار اور شمال اور جنوب میں دو دو دروازے بنائے گئے ہیں۔ یعنی کل بارہ دروازے اور مکمل قلعہ ہے۔ وقت گزرنے پر ان دروازوں کی تعداد میں کمی ہوتی گئی اور تمام قلعہ میں ہر سمت دو دو

دروازے باقی رہ گئے۔ اس طرح آٹھ دروازے باقی بچے۔ یہ تمام دروازے اونچائی کے لحاظ سے ایک ہی ناپ کے تھے۔ ان کی اونچائی ۱۶ فٹ اور وسعت ساڑھے بار فٹ تھی۔ کھمبایت کے مشہور تین دروازے کے وسطی دروازے پر ۱۸۹۱ء میں ایک گھنٹہ گھر بنایا گیا جس کی اونچائی 50 فٹ تھی۔ اس کی گھڑیاں لندن سے منگوائی گئی تھیں۔ اس گھڑیال کے دروازے پر مختلف چار زبانوں میں عبارت لکھی گئی ہے۔ جس میں لکھا گیا ہے کہ اس ٹاور کو بنانے میں دس ہزار سات سو پچیس ۱۰۷۲۵ روپے خرچ ہوئے ہیں اور اس کا افتتاح جعفر علی خان نجم الدولہ ممتاز الملک نے پہلی نومبر ۱۸۹۱-۱۱-۱ کے دن کیا۔ ۵ے

(۱) گوارہ دروازہ

(۲) پنیاری دروازہ

(۳) بھوئے باری

(۴) ملی دروازہ

(۵) فرجا دروازہ

(۶) چوکو املی دروازہ

(۷) محمدی دروازہ

(۸) فتح دروازہ

(۹) لال دروازہ وغیرہ ۶ے

دیوی دیوتاؤں کے نام سے معروف کئی گلیاں اور کوچے ہیں۔ جیسے کویم پاڑہ، کھنڈائی مات کا بھاٹ وارڈ، بہوچر جی ماتا کی پول، دیوئی پول، آجنا ماتا کی پول، پرتگنیشور کی پول، چھتیسی پول، النگ کا قبیلہ، انبا ماتا کی باری، مہالکشمی کی پول، نارائن دیو کی پول، وڈاواسو دیو کی پول اسی طرح اس زمانے میں مختلف برادریوں کے نام سے بھی محلات کے نام رکھے جاتے تھے۔ جنھیں واڑیاں پول، راجپوت واڑہ، ستھارواڑہ، کندوئی واڑہ، کاچھیا پول، واڑندواڑہ، کنبھارواڑہ، موچی واڑہ، چنار واڑہ، وہراباڑہ، پارسی واڑہ، بھاری واڑہ، منیار واڑہ وغیرہ۔ ۷ے

(1) مسلم محلات

قاضی صاحب کا محلّہ، نایاب محلّہ، امام باڑہ، بڑا میاں کا محلّہ، صدر اول کا محلّہ، حاجی فجوں کا محلّہ، حسینی محلّہ، باواجی شاہ کا محلّہ، کئی محلّہ مشہور شخصیتوں کے نام سے بھی رکھے جاتے تھے۔ ابدال واڑہ، اولیاء باڑہ، آنند جی پاریکھ کی کھڑکی، کاما و پاس کی پول، قاضی باڑی۔ کیاچا کا محلّہ، غریباں کی کھڑکی، گانجا والے کی کھڑکی، جی بھائی کی کھڑکی، سوداگر کی پول وغیرہ وغیرہ محلات کے نام کھمبایت میں مشہور ہیں۔

اسی طرح سے کھمبایت کے پرگنوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) کھانیا پرگنا

یہ کھمبایت شہر کے مشرقی سمت میں قلعہ سے برابر لگ کر ہے۔ یہ گوارہ دروازے کے بہت قریب ہے۔ خان نام پر سے اس کا نام رکھا گیا ہے۔ فی الحال وہاں پر پٹیلوں کی بستی ہے۔ اور ایک کالی ماتا کا مندر بھی موجود ہے۔ مندر کے قدیم دستاویزوں میں اس پرگنے کا نام خانپور لکھا ہوا ہے۔ [۸]

(۲) موسم

اس پرگنے میں شاید ہری سبزیاں اگائی جاتی تھیں۔ جو کھمبایت شہر میں بیچی جاتی تھیں۔ گمان کیا جاتا ہے کہ موسم کے حساب سے جو سبزیاں پیدا ہوتی تھیں اور شہر میں پہنچائی جاتی تھی شاید اسی لیے اس کا نام موسم پرگنہ ہے۔

(۳) اکبر پورا

یہ کھمبایت شہر کے ریلوے اسٹیشن سے بہت قریب ہے۔ فی الحال وہاں کئی قومیں آباد ہیں۔ اس پرگنے کا نام شہنشاہ اکبر کے نام سے رکھا گیا ہے۔ [۹]

(۴) جہانگیر پور

مغل بادشاہ جہانگیر ۱۶۲۷ء میں کھمبایت آیا تھا۔ اور وہ یہاں کچھ دنوں ٹھہرا بھی تھا۔ احمد شاہ بادشاہ نے کچھ اشرفیوں پر جہانگیر کا نام بھی نقش کروایا تھا۔ اس لیے اس پرگنے کا نام جہانگیر پور مشہور ہے۔ [۱۰]

(۵) قطب پور

یہ پرگنہ تقریباً ۵۰۰ سال پرانا ہے۔ ایک کتبے پر وکرم سنوت ۱۵۲۶ء اساڑھ سدھ نو اتوار لکھا ہوا ہے۔

(۶) خانپور

اس پرگنے میں آج کل کسانوں کی بہت بڑی بستی آباد ہے۔ وہاں امناجی ماتا کی ایک قدیم مورتی موجود ہے۔ ہندو قوم یہاں زیارت کے لیے آتی ہے۔ [۱۱]

(۷) ماچھی پورا

یہ سمندری ساحل پر ایک ٹیلے پر آباد ہے۔ یہاں مچھیروں کی بستی ہونے کی وجہ سے اس کا نام ماچھی پور ہے۔ مچھیرے اور ناخدا وغیرہ سمندر سے تعلق رکھنے والی قومیں آباد ہیں۔ یہاں پر نمک بنانے کی سند بھی کافی ترقی کر چکی تھی۔ جہازرانی کا کام یہاں کے ناخداؤں کے ہاتھ میں تھا کہا جاتا ہے کہ جب پرتگال کا ملاح واسکوڈی گاما جنوبی افریقہ تک پہنچ چکا تھا اور پریشان تھا کہ وہ اب کیا کرے تب اسے وہاں کچھ ہندی ملاحوں سے ملاقات ہوئی جس میں چروتر کھمبایت کے بندر سے آئے ہوئے کان جی نامی ایک ملاح سے ملاقات ہوئی اور اسی کان جی بھائی نے واسکوڈی گاما کو کالی کٹ بندرگاہ تک پہنچایا۔

ماچھی پورا پرگنے میں Fishing صنعت ماہی گیری نے کافی ترقی کی ہے اور یہاں سے کافی مچھلیاں شمالی ہندوستان میں پہنچائی جاتی ہیں۔ اس طرح کھمبایت شہر میں اس کے پرگنوں میں مختلف اقوام اپنے اپنے کاروبار میں لگی ہوئی ہیں۔ [۱۲]

چھٹی صدی عیسوی میں مُل راج سولنکی نے گجرات کو فتح کیا۔ اور اسے اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اس وقت اس کا نام گرجر دیش تھا۔ [۱۳] اس نام کے تعلق سے گرجر وانڑیاں، گرجر ستھار، گرجر کمبھار وغیرہ قومیں کھمبایت میں بستی ہیں۔ ۸۰۵ء میں بلراج نامی ایک حکمران نے تقریباً ۶۰ برس تک یہاں حکومت کی۔ اور اس کے ورثہ نے تقریباً ۲۰۰ سال تک یہاں حکومت کی۔ ہندوستان میں خاص کر گجرات کے علاقے

میں سب سے پہلے عرب لوگ کھمبایت میں آئے کیونکہ کھمبایت بحیرۂ عرب کی ایک اہم بندرگاہ تھی۔ اسی لیے ۸ ویں صدی اور نویں صدی میں بغداد کے بحری بیڑہ یہاں لنگر انداز ہوتے تھے۔ ۱۳ ویں اور ۱۷ ویں صدی کے اواخر میں جب علاؤالدین کی حکومت کا زوال تھا۔ گجرات میں مسلمان تجار سپاہی پناہ گزین اور امان چاہنے والے اور غلام بحری اور برّی دونوں راستے سے گجرات میں آئے اور یہیں بس گئے۔ اس کے علاوہ گجرات کے سلاطین اور امراء کی طرف سے عرب، ایرانی، افغانی، حبشی، ترک وغیرہ کو لشکر میں ملازمت دی جاتی تھی۔ کھمبایت پر عربوں نے پہلا حملہ ۶۳۶ء میں کیا تھا۔ ۹۱۵ء میں یعنی کہ دسویں صدی کے دوسرے عشرے میں المسدّی نامی ایک سیاح کھمبایت میں آیا اس وقت یہاں ولبھ راجہ کی حکومت تھی۔ اس خاندان کے راجہ مسلمان تجار اور پردیسیوں کی کافی آؤ بھگت کرتے تھے۔ اسی لیے یہاں مسلمان بڑی تعداد میں بس گئے تھے۔[۱۴] سیاح المسدّی نے اپنے سفرنامے میں کھمبایت کی بڑی تعریف کی ہے۔ اور یہاں کے جوتے اور نیلم پتھر کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ یہاں کے نیلم پتھر کو مکی نیلم کہا جاتا ہے۔ کیونکہ کھمبایت کے عقیق پتھر پرانے زمانے ہی سے عربستان میں فروخت ہوتے تھے۔ خاص کر مکی نیلم شہر مکہ میں فروخت کے لیے لے جایا جاتا تھا۔[۱۵]

'جامع الحکایات' کے مصنف نے لکھا ہے کہ ۱۲ ویں صدی میں آتش پرست (پارسی) اور مسلمان بڑی تعداد میں کھمبایت میں موجود تھے۔ جہاں مسلمانوں کی ایک مسجد بھی تھی جس کا ایک منارہ تھا اس پر چڑھ کر مؤذن اذان دیتا تھا۔ پارسیوں نے غیر مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا اور ان سے لڑنے کی ترغیب دی۔ ان غیر مسلموں نے وہ منارہ توڑ دیا اور مسجد جلا دی۔ اس وقت تقریباً ۸۰ مسلمان شہید ہوئے۔ مسجد کے خطیب کا نام قطب علی تھا وہ بچ گئے۔ انھوں نے ان ہلواڑ جاکر حاکم وقت کو اس حقیقت سے واقف کیا۔ راجا کے درباریوں میں سے کسی نے بھی اس کی شکایت نہیں سنی۔ اور نہ ہی کسی نے اس کی بات پر غور کیا۔ اس وقت راجا شکار پر

جانے کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ قطب علی نے راستے میں راجا کو روک کر شکایت کی۔ راجہ نے قطب علی کی شکایت سن کر اسے اپنے درباریوں میں شامل کر لیا اور دربار کی بہت سی ذمہ داریاں قطب علی کے سپرد کیں۔ راجا بذات خود بھیس بدل کر کھمبایت پہنچا اور قطب علی کی شکایت کو سچ پایا۔ اس کے بعد اس نے حکومت کے خرچ سے وہ مسجد اور منارہ دوبارہ تعمیر کروا دیا۔ ۱۶؎

۱۳۲۰ء سے ۱۴۱۳ء تک دہلی میں غیاث الدین تغلق کی بادشاہت رہی۔ اس کے بعد محمد تغلق نے ۱۳۲۵ء میں عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ انھوں نے حکومت کا انتظام نہایت خوبی سے کیا۔ اس کے دورانِ حکومت میں ہندوستان کے بہت بڑے علاقے پر تغلق حکومت تھی۔ اور انھوں نے اپنی حکومت کو کئی ریاستوں میں تقسیم کر دیا اور اس پر ایک ایک امیر تعینات کر دیا۔ اس طرح امیروں کا ایک بہت بڑا گروہ بن گیا۔ گجرات میں بھی ملک مقبول یہاں کا صوبیدار تھا۔ جو محصول جمع کر کے دہلی وغیرہ لے جایا کرتا تھا۔ جسے ایک مرتبہ ان امیروں نے لوٹ لیا تھا۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں کھمبایت کی حکومت بڑے عروج پر تھی۔ ۱۷؎ محمد تغلق کے زمانے میں یہاں ایک بڑی مسجد تعمیر ہوئی یہ مسجد سمندر کے کنارے کھمبایت کے مسلمان تاجروں نے بنوائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس جامع مسجد کو محمد خوت ماری یا بت ماری نے اپنے خرچ سے بنائی تھی۔ ۱۸؎ ان دنوں ہندوستان میں ابن بطوطہ نامی ایک سیاح کی آمد ہوئی۔ یہ افریقہ کا ایک مسلمان سیاح تھا۔ ۱۳۳۴ء میں وہ سب سے پہلے سندھ میں آیا۔ ان کا نام ابو عبداللہ محمد تھا اور ابن بطوطہ ان کا خاندانی نام یا لقب ہے۔ ہندوستان میں ان کی آمد کے بعد محمد تغلق نے انہیں اپنے مہمان خانے میں رکھا۔ اور اپنے دربار میں ایک خاص مقام عطا فرمایا۔ ابن بطوطہ ہندوستان میں جہاں جہاں گئے وہاں کے حالات اپنے سفرنامے میں لکھے۔ دہلی سے سفر کرتے ہوئے وہ کھمبایت تک پہنچے کھمبایت سے متعلق انھوں نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ کھمبایت دوسرے شہروں کے مقابلہ میں بہت ہی خوبصورت شہر ہے۔ یہاں کی مسجدیں اور مکانات بہترین قسم کے ہیں۔ یہاں کے باشندے زیادہ تر پردیس سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ یہ عمارتیں بنانے کے بڑے

شوقین ہیں اور مسجد اور مکانات بنانے میں وہ ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں اور خوب سے خوبتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لکڑی پر نقاشی کا کام بڑی خوبصورتی سے کیا جاتا ہے۔ یہ لکڑی بہت ہی مضبوط ہوا کرتی ہے۔ ایک مسجد کا دروازہ بہت خوبصورت انداز میں بنایا گیا ہے۔ اس طرح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں کھمبایت کے مکانوں، میناروں اور مسجدوں کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ ۱۹؎ اس وقت کھمبایت کے صوبیدار مقبول اتل گھی نے ابن بطوطہ کو اپنے محل میں دعوت پر بلایا تھا اور ان کی بڑی توقیر کی تھی۔ حکومت تغلق کے زمانے میں گجرات اور خاص کر کھمبایت میں کئی بار حکومت کا تختہ پلٹا گیا۔ اور یہاں ایک سے ایک بہادر لوگوں نے اپنے قدم جمائے۔ خلیج کھمبایت میں کوہلی لوگوں کا بڑا زور تھا۔ وہ سمندر میں کچھ دور تک پہنچ جاتے اور قضاقی کرتے۔ جہازوں کو لوٹ لیتے اور لوگوں کی جان مال کو خطرہ پہنچاتے۔ محمد تغلق کے بعد دہلی کی حکومت فیروز شاہ تغلق کے ہاتھ میں آئی۔ انھوں نے بہت کم عرصہ حکومت کی۔ اسی طرح ایک کے بعد ایک مسلمان سلطان اور بادشاہ دہلی کے تخت پر آئے اور گئے اور ان کی حکومت میں گجرات بھی شامل تھا۔ ۲۰؎

۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما نامی پرتگیز جہازراں نے ہندوستان کا بحری راستہ تلاش کر لیا۔ اور اس کے بعد پرتگیز قوم ہندوستان کے مغربی کنارے پر لنگرانداز ہوئی۔ یہ لوگ ہندوستان میں بیوپار کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ لیکن یہاں کے حالات دیکھ کر انھوں نے حکومت کے کام کاج میں بھی ہاتھ بٹانے کی کوشش کی اور اس طرح کچھ دنوں بعد مسلم حکومت پرتگیزوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ جب پرتگیز گجرات کے کنارے اترے اور اپنے قدم جمانے کی کوشش کی اس وقت گجرات میں محمد بیگڑے کی حکومت تھی۔ اور اسے پرتگیزوں کی سرکوبی کے لیے بار بار کھمبایت آنا پڑتا تھا۔ آہستہ آہستہ جب مغل حکومت زوال پذیر ہوئی اور سلطان بہادر شاہ ظفر کے دوران حکومت میں پرتگیزوں نے دمن دیو اور گووا پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ پرتگیز کے افسر البقرق نے ۱۵۱۰ء میں گووا میں سلطان عادل خان کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر ہلّہ بول دیا۔ اور وہاں اپنے قدم جمائے۔ ۲۱؎

۱۵۳۸ء میں پرتگیزوں نے کھمبایت کو خوب لوٹا۔ انھوں نے دیو پر حملہ کیا اور اسے بھی اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اور مسلم حکمران کوکسی بھی قسم کا خراج دینے سے انکار کر دیا۔ پرتگیز بڑے ظالم قاتل اور انتہائی درجے کے قزاق تھے۔ ان کے حکمران جب سزائے موت سناتے تو مجرم کو زندہ جلا دیتے تھے۔ ۲۲

مغربی ممالک سے آنے والی تاجر قوموں میں انگریز بھی تجارت کی غرض سے ہندوستان میں آئے تھے۔ اور انھوں نے بھی یہاں کے سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے ہندوستان پر حکومت کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اور یہاں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔ جس وقت انگریزوں نے ہندوستان میں قدم رکھا اس وقت یہاں مغلوں کی حکومت تھی اور بادشاہ کے ہاتھ میں دہلی کی عنانِ حکومت تھی۔ اس وقت انگلینڈ کی ملکہ الیزا بیتھ نے جو خط لکھا تھا اس میں مغل بادشاہ اکبر کو کھمبایت کے شہنشاہ کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ اس واقعہ سے اس وقت کے کھمبایت کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ انگریز بڑے زیرک تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اگر ہندوستان میں تجارت کرنی ہو تو اس کے مغربی کنارے پر آئی ہوئی بندرگاہوں سے بڑا کام لیا جاسکتا ہے۔ ۲۳ اس لیے انھوں نے کھمبایت اور سورت کی بندرگاہوں کو اپنا نشانہ بنایا اور یہاں کوٹھیاں قائم کیں۔ کھمبایت کی کوٹھی میں انگلستان سے آنے والے تاجر ٹھہرتے تھے۔ اور یہیں سے وہ اپنا کاروبار کیا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ ان لوگوں نے تمام گجرات پر اور نہ صرف گجرات پر بلکہ تمام ہندوستان پر قبضہ جما لیا۔

ریاست کھمبایت میں بہت سے سیاحوں کی آمد ہوئی۔ اس کی شہرت سن کر مندرجہ ذیل سیاح کھمبایت میں مختلف اوقات میں آتے رہے۔

(۱) ٹال می : یہ دوسری صدی میں کھمبایت آیا تھا اور اپنی کتاب میں اس نے کھمبایت کا نام ٹامرنگر لکھا ہے۔ اور ایک جگہ اس نے کوپرسیٹی بھی کہا ہے۔ ۲۴

(۲) چینی سیاح ہویان سانگھ بھی ۱۶۴۰ء میں ہند میں آیا تھا۔ اور کھمبایت سے ولبھی پور پہنچا تھا۔ ۲۵

(۳) ابوالحسن مسودی ۹۱۵ء ۳۰۳ھ : اس نے اپنے سفرنامے میں کھمبایت سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ اس نے یہاں کے جوتے اور جواہرات پر اپنی رائے زنی کی ہے۔ اور دل کھول کر تعریف بھی کی ہے۔ ۲۶

(۴) ابوالاسحٰق ابراہیم استخری ۹۵۱ء : اس نے اپنے سفرنامے میں کھمبایت کی بہت تعریف کی ہے وہ لکھتا ہے کہ یہ شہر بڑا وسیع ہے جہاں ناریل، آم اور کیلے کے باغات ہیں۔ زراعت میں چاول کی پیداوار بہت زیادہ ہے لیکن یہاں کھجور نہیں ملتے۔ ۲۷

(۵) ابنِ ہاکیل بغدادی ۹۷۷ء ۲۸

(۶) ابو ریحان البیرونی ۱۰۲۷ء ۲۹

(۷) الصید روسی ۱۱۰۰ء ۳۰

(۸) نورالدین محمد عوفی ۱۲۲۷ء ۳۱

(۹) مارکو پولو ۱۲۹۵ء ۳۲

(۱۰) ابن بطوطہ ۱۳۴۲ء ۳۳

(۱۱) واسکوڈی گاما ۱۴۵۷ء ۳۴

وغیرہ وغیرہ سیاح کھمبایت میں آئے اور اپنے سفرنامے میں انھوں نے کھمبایت کا دل کھول کر ذکر کیا ہے اور اس کی بہت تعریف کی ہے۔

کھمبایت شروع ہی سے مسلمان حکمرانوں کے زیر دست رہا۔ دوسری ریاستوں کی طرح یہ بھی مغربی قوموں اور مراٹھا حاکموں کے دستِ نگر رہا۔ لیکن پھر بھی مسلمانوں کی تہذیب کا اس پر کافی اثر رہا کیونکہ اسلامی حکومت کے زمانے میں ریاست کھمبایت میں بہت سے نواب اور امراء ہوئے ہیں۔ کھمبایت کے مرحوم منشی کمال الدین صاحب نے نامدار نواب صاحب نُو پیڑھی ناموں (نواب صاحب کا شجرہ) نام کا ایک کتابچہ فارسی زبان میں لکھا تھا۔ جس کا اردو ترجمہ جناب گوہر علی صاحب نے کیا ہے۔ اور اس کا گجراتی ترجمہ مولوی مقصود میاں عبدالرزاق نے کیا ہے۔ اس کتابچہ کی وجہ سے نواب خاندان سے متعلق کافی معلومات حاصل ہوتی ہے۔ ۳۵

کھمبایت کا نواب خاندان مغل خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے بزرگ ایرانی تھے۔ اور وہ اعلیٰ خاندان کے تھے۔ یہ لوگ حویضی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اس وقت حویضی خاندان مومن خاندان بھی کہا جاتا تھا۔ امیر احمد صاحب کی اپنے والد سے ناچاکی رہا کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ باپ سے الگ ہوکر برقا خامی مقام پر پہنچے وہاں انھوں نے سیر و سیاحت کے بعد شکار بھی کھیلا۔ اور برقا کے حاکم کو جب اس بات کا پتہ چلا کہ امیر احمد نے ان کی جاگیر میں قدم رکھا ہے تو انھوں نے ان کی بڑی قدردانی کی۔ وہ انھیں شکار گاہ سے بادشاہ کے پاس لے گئے۔ بادشاہ نے ان کی علمیت کی بڑی قدر کی۔ اور امیر احمد کو خان کا خطاب عطا فرمایا۔ اور انھیں امراء میں شامل کیا۔ امیر احمد نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی اور ایران کے بادشاہ کے مصاحبوں میں جگہ پائی۔ ۳۶ جب مغل بادشاہ ہمایوں اپنی جان بچاکر ایران پہنچا تو انہیں امیر احمد خان کی کوشش و کاوش کی وجہ سے بادشاہ تک رسائی ہوئی اور انھوں نے ہمایوں کی مدد کی جس کی وجہ سے مغل بادشاہ ہمایوں نے ہندوستان پر دوبارہ فتح حاصل کی۔ امیر احمد خان ایک جنگ میں شہید ہوئے۔ اس کے بعد ان کے بیٹے امیر یار احمد خان وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوئے اس کے بعد ان کے بیٹے مرزا مومن نے باپ کا عہدہ سنبھالا۔ ۳۷

(1) مرزا جعفر نجم الدولہ عرف مومن خان اوّل ۱۷۳۰ء سے ۱۷۴۳ء

ہندوستان میں جب مغل بادشاہ محمد شاہ کی حکومت تھی ان دنوں مومن خان اوّل کی ہندوستان میں آمد ہوئی۔ گجرات میں اس وقت صوبیدار سربلند خان تھے۔ انھوں نے مرزا جعفر کو نظام الدولہ کا خطاب عطا فرمایا۔ اور انھیں پیٹلاد کا حاکم مقرر کیا۔ ۱۷۲۵ء میں مرزا جعفر مومن خان کی شادی کھمبایت اور سورت کے نواب مرزا عبدالحسین دہلامی کی بیٹی اولیاء حکیم کے ساتھ ہوئی۔ یہ عبدالحسین دہلامی بھی ایرانی خاندان سے تھے۔ اس شادی کی وجہ سے جعفر حسین مومن خان بہت معروف ہوئے اور مغل دربار میں ان کی بڑی عزت و توقیر ہوئی۔ (انھوں نے مغل دربار میں جاگیر حاصل کی۔) انھوں نے گجرات میں بڑا نام پایا یہ وہ زمانہ تھا جب مراٹھے گجرات پر بار بار حملہ کرتے تھے اور اپنی سیاسی چالیں آزماتے

تھے۔ مومن خان نے ایسے شورش کے زمانے میں حکومت کے دشمنوں کی سرکوبی کی اور وہ مغل حکومت کے بڑے مددگار اور معاون ثابت ہوئے۔ کئی بار انھیں بادشاہ کی طرف سے خدمت اور انعامات دیے جاتے۔ احمدآباد کی ٹکسال کا بھی انھوں نے معائنہ کیا اور اس میں ہونے والی لاپرواہی اور سونے چاندی کے سکوں میں ملاوٹ کی طرف خاص توجہ کی۔ کیونکہ اس وجہ سے احمدآباد کی ٹکسال کا درجہ گر چکا تھا اور عوام اس کے سکوں کی لاقدری کرتے تھے۔ مومن خان نے وہ تمام سکے پگھلا کر ازسرنو سونے چاندی کے خالص سکے بنوائے اور گجرات کی ٹکسال کا نام بلند کیا۔ ۳۸

نواب محمد قلی خان

یہ مفاخر خان کے پالک بیٹے تھے ان کی وفات کے بعد عنان حکومت ان کے ہاتھ آئی۔ نواب محمد قلی خان نے تقریباً ۶ سال تک حکومت کی۔ اور ۱۲۰۴ھ میں وفات پائی۔ ۳۹

نواب فتح علی خان مومن خان

محمد قلی خان کے تین بیٹے تھے۔ (۱) فتح علی خان (۲) بندے علی خان (۳) یاور علی خان۔ فتح علی خان تخت نشین ہوئے ان کے زمانۂ حکومت میں مراٹھوں کا بڑا شہرہ تھا۔ مراٹھوں نے فتح علی خان سے خراج وصول کرنا چاہا لیکن فتح علی خان نے انکار کر دیا۔

نواب فتح علی خان نے دہلی کے بادشاہ شاہ عالم کو بیش بہا تحائف بھیجے۔ اس کے جواب میں بادشاہ نے انھیں نظام الدولہ ممتاز الملک مومن خان بہادر دلاور جنگ کا خطاب عطا کیا۔ ساتھ ہی اپنے دربار کے چھ ہزار امرا میں انھیں شامل کیا۔ ۱۸۰۰ء میں مراٹھوں کے سردار باب جی، آپاجی نے خراج وصول کرنا چاہا اور کاٹھیاواڑ کا محاصرہ کر لیا۔ نواب سے انھوں نے ۵۰,۰۰۰ پچاس ہزار وصول کیے۔ ان دنوں کھمبایت کی اقتصادی حالت بہت کمزور ہو چکی تھی۔ ۱۸۰۲ء میں بمبئی کے گورنر اور مراٹھا حکومت گائیکواڑ کے دیوان راؤجی آپاجی نے آپس میں صلح کی۔ اور کھمبایت کے تمام حقوق انگریزوں کو دے دیے۔ اس وقت سے کھمبایت میں کلکٹر کا تعین ہوا۔ جسے

کھمبایت کا پالیٹکل ایجنٹ کہا جاتا تھا۔ ۱۸۲۳ء میں نواب صاحب انتقال کرگئے۔ ۴۰؎

نواب بندے علی خان صاحب (۱۸۲۳ء سے ۱۸۴۱ء)

فتح علی خان کے کوئی اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کے چھوٹے بھائی نواب بندے علی خان مومن خان چہارم کے لقب سے تخت نشین ہوئے۔ ان نواب صاحب کے دوران حکومت میں کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔ انھوں نے ۱۸ سال کھمبایت پر اپنا اقتدار جاری رکھا اور ۱۸۴۱ء میں فوت ہوئے۔ ان کے بعد ان کے بھائی یاور علی خان نے اپنے بڑے بیٹے حسین یاور خان کو گادی پر بٹھایا۔ ۴۱؎

مرزا علی یاور خان کے چار بیٹے اور ایک بیٹی کل پانچ اولادیں تھیں۔ ان کے دربار میں بھگوان داس نامی دیوان تھے۔ بھگوان داس کے فوت ہوجانے پر ان کے بیٹے بابوجی نے حکومت کے کاروبار میں حصّہ لینا شروع کیا۔ بیگمات کے اخراجات کے لیے دی گئی زمینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے اور ان کا حساب کتاب رکھتے تھے۔ نواب صاحب کے نجی معاملات کو پڑان لال سارا بھائی جو ناگر برہمن تھے سنبھال لیتے تھے۔

دیوانی کام کاج کے لیے سید محمد کاظم میاں اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ نواب صاحب نے اپنی حکومت کا انصرام نہایت خوبی سے کیا اور ان کے وزراء بھی اپنے فرائض کی انجام دہی نہایت ہی خوش اسلوبی سے کرتے تھے۔

نظامت علی منشی حکومت کے تمام خط و کتابت کا کام کرتے تھے اور یہ تمام مراسلات فارسی زبان میں ہوا کرتی تھیں۔ ۴۲؎

بادشاہ میاں سید میاں فخرالدین، میر غلام عباس، جناب آغا رضا خان، سید عباس وغیرہ امراء کی مدد سے انھوں نے اپنی حکومت کے کام میں چار چاند لگا دیے تھے۔ نواب صاحب نے اپنے دربار میں ایک تنظیم بنائی تھی۔ جس میں انھوں نے کھمبایت کے معتبر اور معزز لوگوں کو شامل کیا تھا۔ مثلاً برہمنوں میں سے نگر سیٹھ اور بنیوں میں سے سیٹھ شاہوکار، نیز بادبانی کام کاج کے لیے کہ جس میں غیر ممالک کے ساتھ کپڑے اور عقیق وغیرہ کے تاجر ہوں ایسے پانچ اشخاص کا تعین کیا جاتا تھا۔ یہ

لوگ آپس میں مل جل کر کسی بھی مسئلے کا حل طے کرتے۔ کبھی کوئی معاملہ پیچیدہ ہو جاتا تو شہر میں سے کسی مشہور اور معزز امیر کو بلایا جاتا اور ان کی زیر سرپرستی میں انصاف کیا جاتا۔ اسی طرح سے انھوں نے ایک عدالت بھی قائم کی تھی۔ منصف یہیں پر بیٹھ کر فیصلہ دیتے تھے ایک سادہ کاغذ پر عرضی لکھائی جاتی۔ اس وقت اس کی فیس ایک آنہ ہوا کرتی تھی۔ جو محکمۂ عدالت میں جمع کی جاتی تھی۔ عرضی پر نمبر ڈالے جاتے تھے اور وہ عدالت کی مختلف دفتروں (فائل) میں رکھی جاتی۔ اس عدالت کے سب سے پہلے منصف حاجی عباس میاں ان کے بعد محمد کاظم ہوئے اور بعد میں حسن علی صاحب نے انصاف دینے کا کام کیا۔ اس کے بعد عدالت کا کام سرکار انگریز کے ہاتھ میں پہنچا جس کے پہلے مجسٹریٹ قاضی محمد حسین محمد علی تھے۔ ۴۳

نواب صاحب نے اپنا ایک توپ خانہ بھی بنا رکھا تھا۔ ۱۸۷۵ء تک اس توپ خانے میں پانچ توپیں تھیں۔ انگریزی حکومت سے پہلے شہر کے دروازے اور برج پر یہ توپیں لگی ہوئی تھیں۔ جو شہر کی حفاظت کے لیے رکھی گئی تھیں۔ عیدین کے وقت یہ توپیں عیدگاہ میں لائی جاتی تھیں اور خطبہ ختم ہونے کے بعد داغی جاتی تھیں۔ شب برات پر بھی یہ پانچوں توپیں داغی جاتی تھیں۔ ۴۴

کھمبایت کے نوابوں نے حکومت انگلستان یا برٹش سرکار کے ساتھ بھی اپنی وفاداری نبھائی تھی۔ انھوں ے مختلف مواقع پر ان کی خوشی اور مجلسوں میں حصّہ لیا تھا۔ مثلاً انگلستان کے شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم اور شہنشاہ جیورج پنجم کا یوم پیدائش بڑے شان و شوکت سے منایا جاتا۔ ان دنوں کھمبایت کی اسکولوں اور مدارس میں مٹھائی تقسیم کی جاتی اور چھٹی کا دن ہوتا تھا۔ اس دن دربار میں امیر امراء کو بلایا جاتا اور شہنشاہ کے حق میں دعا کی جاتی اور پھر دربار برخاست ہوتا۔ ۴۵

جب ۱۹۰۰ء میں انگریز سرکار کو جنوبی افریقہ پر فتح حاصل ہوئی تب کھمبایت کے نواب کی طرف سے تہنیاتی خطوط بھیجے گئے اور اسکولوں میں چھٹی رکھی گئی اور ۳۱ توپیں داغی گئیں۔ اسی طرح دوسری جنگ عظیم کے وقت بھی فتح کی خوشی منائی گئی تھی۔ ہم کہہ

سکتے ہیں کہ کھمبایت کے نواب انگریز سرکار کی ہر موقع پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے چاہے شہنشاہ کو خطاب ملے ہوں یا کسی کی تخت نشینی ہو یا پھر کسی کی وفات ہوئی ہو۔ موقع کے لحاظ سے کھمبایت کے نواب اس میں شامل ہوتے تھے۔ ۴۶

کھمبایت کے ادیب و شعراء

منشی کمال الدین وکرم سنوت ۱۹۰۰ء

نواب جعفر علی خان صاحب کے وقت میں ان کے دربار میں بڑے منصب پر تھے۔ انھوں نے فارسی زبان میں کھمبایت کے حکمرانوں کا شجرۂ نامی ایک مختصر سی تاریخ لکھی ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا کتابچہ ہے۔ اس کے ہر صفحہ پر بیل بوٹوں سے پچی کاری کی گئی ہے اور درمیان میں مختصر سی عبارت لکھی گئی ہے۔ یہ کتابچہ نواب کے بزرگوں سے متعلق معلومات حاصل کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ۴۷

سید ابو لطیف خان ۱۹۴۳ء

یہ کھمبایت ہی کے باشندے تھے۔ ان کے والد کا نام سید عباس تھا۔ نواب جعفر علی خان صاحب کے دور میں سید عبداللطیف خان اندراج داروغہ تھے۔ اپنی قابلیت کی وجہ سے انھیں کھمبایت کے دیوان کا عہدہ ملا تھا۔ انھوں نے انگلو فارسی گرامر اور گجراتی گرامر کی کتاب لکھی تھی۔

(۱) انگلو فارسی ایڈیمس ۱۹۵۱ء سنوت سری

(۲) ذکالی سے سفر ۱۹۵۶ء سنوت سری ۴۸

غلامیؔ

ان کا نام غلام رسول تھا اور غلامیؔ تخلص کرتے تھے۔ یہ گجرات کے مشہور شعرا میں سے ایک تھے ان کا آبائی وطن تو سورت تھا لیکن انھوں نے کھمبایت میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ وہ تا حیات کھمبایت ہی میں رہے اس لیے ان کا شمار کھمبایت کے افراد میں ہوتا ہے۔ یہ پرگو شاعر تھے۔ انھوں نے نظم کی بہت سی اصناف میں اشعار کہے ہیں۔ مثنوی، مرثیہ، منقبت، غزل وغیرہ وغیرہ۔ کہا جاتا ہے کہ مختلف اصناف میں انھوں نے اپنا

تخلص بھی مختلف اختیار کیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے اردو شہ پارے میں غلامؔی کی مرثیہ گوئی کا ذکر کیا ہے۔ ۴۹؎ جس میں غلامؔی کے سترہ مرثیہ ایڈن برا میں محفوظ ہیں۔ انھوں نے ایک مرثیہ میں غلام رسول تخلص بھی کیا ہے۔ انھوں نے شہر کھمبایت میں مستقل اقامت اختیار کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھ جب آخری ناظم گجرات مومن خان بانی ریاست کھمبایت تھا۔ اور وہ خود شیعہ تھا۔ کھمبایت کے بیشتر خاندان مغلوں اور ایرانیوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ عہد قدیم میں بھی بہت سے ایرانی تاجروں نے کھمبایت کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ اور ویسے گجرات میں آج بھی شیعیت کا بڑا مرکز کھمبایت ہے۔ شاید اسی وجہ سے غلامی نے اپنی مثنویوں میں بھی کربلا سے متعلق اشعار لکھے ہیں اور ان کے مرثیے بھی مشہور ہیں۔

غلطاں ہونے میں سب احباب و اقربا
باندھے کمر بہرِ شہادت وہ مقتدا

......

قاسم نے اذنِ حرب طلب کرکے یوں کہا
عموں نہ جاؤ رن کو رضا دو ہمن کو آج
بدلے اگر تجھے یوں وصیت کیا پدر
حق میں تیرے مجھے بی جو کہ وہ نامور

......

لاؤں بجا میں حکم برادر توں کر صبر
یوں بات کر طلب کے سرور کہے بہن کو آج

......

غلامی نے ۱۹۱۴ء سنوت میں وفات پائی۔ ۵۰؎

مرزا محمد قاضی ۱۹۰۲ وکرم سنوت

یہ بھی کھمبایت ہی کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے گجراتی انگریزی لغت لکھنا شروع کی تھی۔ انھوں نے اس لغت میں ۱۵۰۰۰ الفاظ مرقوم کیے تھے۔ بعد ازاں انھوں نے نوروز جی،

فردون جی کی مدد سے کل آٹھ برس کی زحمت کے بعد ۱۸۴۶ء میں اس لغت کا اجراء کیا۔ ۵۱

پروفیسر آغا کوثر ۱۳۴۰ھ

یہ بمبئی میں سینٹ زیویئرس کالج میں پروفیسر رہے بعد میں احمدآباد کالج میں اردو کے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ اردو فارسی زبان میں اشعار کہتے تھے۔ ان کا تعلق کھمبایت کے نواب صاحب کے ساتھ تھا۔ اس لیے احمدآباد سے وہ کھمبایت آگئے تھے۔ انھوں نے اپنی صاحبزادی کا رشتہ کھمبایت کے نواب خاندان میں کیا تھا۔ اس لیے ان کا شمار ریاست کھمبایت کی معزز ہستیوں میں کیا جاتا تھا۔ برٹش سرکار کی طرف سے اُنھیں ۱۹۰۹ء میں شمس العلماء کا اعزازی خطاب ملا۔ ان کے مجموعۂ کلام کا نام دیوان کوثر ہے۔ ۱۳۴۰ھ میں انھوں نے وفات پائی۔ ۵۲

شیخ سلطان بھائی

کھمبایت کے شیخ سلطان نے تصوف پر نظمیں کہی ہیں۔

غلام عباس صادق علی اظہر سوڈان والا ۱۹۶۶ء

غلام عباس صادق علی کھمبایت کے داؤدی وہرا برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ عربی اردو اور گجراتی کے مشہور شاعر، ادیب اور مقرر تھے۔ ان کی تصانیف کا بہت بڑا خزانہ دستیاب ہوا ہے۔ وہرا برادری کے سیدنا برہان الدین صاحب نے انھیں اظہر تخلص رکھنے کا مشورہ دیا تھا اور عزیز القدر کا خطاب انجمن ترقی اردو نے ۱۹۸۱ء میں انھیں عنایت کیا تھا۔ انھیں گجراتی زبان پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔ گجراتی زبان کے وہ بہترین مقرر تھے۔ ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) امیرالمؤمنین (۲) علی زین العابدین (۳) سیرت خدیجۃ الکبریٰ (۴) سیرت زبیدہ خاتون (۵) سیدنا ابوذر (۶) سیدنا حماد (۷) سیدنا جابر (۸) ابی ایوب انصاری (۹) عدی بن حاتم (۱۰) حضرت ابوالاسود (۱۱) بہلول دانا (۱۲) معاشق اشتر (۱۳) سیرت غازی جوہر (۱۴) سیرت سیدنا سلمان (۱۵) قاضی نعمان (۱۶) الیعقوب الوزیر (۱۷) جامع اظہر (۱۸) دنیا میں مذہب کی اہمیت (۱۹) رسالۂ عالم (۲۰) قصیدہ

مدح (۲۱) سلام وغیرہ کا مجموعۂ کلام بیانیہ کلام ام عذیر (۲۲) مولود کعبہ (۲۳) فاطمہ زوجۂ اسد (۲۴) فضائل پنجتن (۲۵) حضرت زینب کا نوحہ وغیرہ وغیرہ

غلام عباس صادق علی اظہر اپنی برادری کی کئی کمیٹیوں میں شامل تھے۔ وہ کھمبایت کے داؤدی جماعت کے مشہور و معزز شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے ۶۶ سال کی عمر پائی اور ۱۳۷۹ھ میں وفات پائی۔ ۵۳

شعلہ ۱۸۶۳ء، ۱۲۸۰ھ

کھمبایت کے مشہور شعراء میں حسین یاور خان عرف بڑے آقا جو مرزا خان کے فرزند تھے مشہور شخصیتوں میں سے تھے۔

ریاست کھمبایت کے شعراء حضرات میں حسین یاورخا عرف بڑے آقا مشہور شاعر ہوگزرے ہیں۔ یہ مرزا خان کے بیٹے تھے۔ ان کا خاندان سورت کے معزز خاندانوں میں سے تھا لیکن شعلہ بہت بڑے عرصے تک کھمبایت میں رہے۔ ریاست کھمبایت میں وہ فوجدار کے عہدے پر متمکن تھے۔ یہ صاحب دیوان شاعر تھے۔ ۱۸۶۳ء میں ہیضہ کی وبا میں انتقال کیا۔ ۵۴

نمونۂ کلام

ڈھلکہ جو مرے شوخ کے سر پر سے دوشالہ
بالوں نے دیا چھوڑ تو شانوں سے سنبھالا

......

ہم نشیں وہ جو روانہ سوئے بستاں ہوئے
محو و لب گل ہوئے غش بلبل نالاں ہوئے

......

ہمیشہ کھا کے قسم تم نے حیلہ سازی کی
یہ میرے گھر پہ نہ اک بار سرفرازی کی

......

کہا جو شیخ کو یہ داغ کیوں جبیں پہ کھائے
تو بولا غصّے سے ہٹ تیرے بے نمازی کی
قرار دل کو نہ تھا اس کی ٹھوکروں کے آگے
سواری جب کہ کیے ہم نے اسپ نازی کی
کیا یہ جل کے کہ فی النار و والسقر ہو تو
کبھی جو شعلہ نے ان سے زباں درازی کی ۵۵؎

......

محمد عوفی ۱۲۲۷ء میں

سلاطین دہلی کے زمانے میں شمس الدین التمش کی حکومت کے درمیان نورالدین محمد عوفی ایک بہت بڑے عالم تھے۔ انھوں نے جامع الحکایات میں کھمبایت کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ناصرالدین قباچہ کی ایماء پر یہ کتاب تصنیف فرمائی۔ ان کی کتاب میں کھمبایت کا بھی ذکر ہے۔ کھمبایت سے متعلق وہ لکھتے ہیں۔ ایک بار میں کھمبایت گیا تھا۔ وہ شہر سمندر کے کنارے بسا ہوا ہے۔ وہاں بہت بڑی تعداد میں سنی مسلمان رہتے ہیں۔ وہ اپنے مذہب پر سختی سے عمل پیرا ہیں اور بڑے سخی ہیں۔ یہاں پر ایک مسجد بھی بنی ہوئی ہے جس کا ایک مینار ہے مؤذن اسی مینار سے اذان دیتا ہے۔ کھمبایت میں مسلمانوں کے علاوہ پارسی قوم بھی آباد ہے۔ ایک مرتبہ پارسی اور ہندوؤں نے مل کر وہ مسجد جلا دی اس وقت ۸۰ مسلمان شہید ہوئے۔ حکمران وقت جو ہندو راجا تھا۔ اس نے پارسیوں کو سخت سے سخت سزا دی اور اس مسجد کی مرمت بھی کروائی۔ اس طرح کھمبایت کے مؤرخین میں نورالدین محمد عوفی کا شمار بھی کیا جاتا ہے۔ ۵۶؎

حسام خان (۱۵۲۸ء)

یہ گجرات ہی کے رہنے والے تھے اور احمد آباد کے باشندے تھے۔ احمد آباد میں گھی کانٹہ علاقے میں آئی ہوئی محافظ خان کی خوبصورت مسجد انہیں نے بنوائی تھی۔ حسام خان محافظ خان کے پوتے تھے۔ یہ بڑے قابل شخص تھے۔ ۱۵۲۸ء میں جب بہادر شاہ

نے بڑودے پر چڑھائی کی اس وقت حسام خان بندرگاہ کھمبایت کے داروغہ تھے۔ یہ بڑے اچھے مؤرخ بھی تھے۔ ان کی کتاب طبقات حسام شاہی ایک مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ اور کھمبایت کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ بھی ہے۔ ۵۷

عبداللہ محمد بن عمر علی مکّی (۱۵۵۴ء)

عبداللہ بن عمر نے تاریخ گجرات عربی زبان میں لکھی ہے۔ یہ کھمبایت بندرگاہ پر محصول وصول کرنے والے افسر تھے۔ یہاں وصول کیا ہوا تمام پیسہ مکہ مدینہ کے اداروں میں پہنچایا جاتا اور وہاں پر گجرات کے ہی کس خاص آدمی کا تعین ہوتا تھا۔ اور وہ اعزاز انہیں حاصل تھا یہ حاجی کبیر کے نام سے بھی مشہور تھے انھوں نے اپنی تصنیف میں کھمبایت کا ذکر بڑی خوبی سے کیا ہے۔ ۵۸

سکندر محمود (۱۵۷۶ء)

یہ مِراتِ سکندری کے مصنف ہیں۔ انھوں نے جب تاریخ کی کتاب لکھی تب ان کی عمر ۵۸ سال کی تھی۔ ان کے والد صاحب کا نام محمد عرف منجھو تھا۔ ہمایوں کے لشکر کے ساتھ یہ گجرات میں آئے تھے۔ ان کے ذمہ کتب خانہ تھا۔ مرات سکندری کے مصنف سکندر بھی اپنے والد محترم کے ساتھ تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں چشم دید واقعات بیان کیے ہیں۔ جس میں جنگوں اور سیاسی حالات کا بخوبی ذکر کیا گیا ہے۔ ۵۹

مرزا محمد حسن (۱۶۶۹ء)

یہ مِراتِ احمدی کے مصنف ہیں۔ ان کی کتاب بھی تاریخ میں مشعل راہ کا کام کرتی ہے۔ انھوں نے کھمبایت میں ایک بڑا عرصہ گزارا تھا۔ اور یہاں رہ کر انھوں نے کھمبایت کے نوابوں سے متعلق اپنی تصنیف میں ذکر کیا ہے۔ جس میں انھوں نے ذکر کیا ہے کہ مرزا محمد حسن کا خاندان ایران سے آیا تھا ذکر کیا ہے۔ مِراتِ احمدی کے مصنف مرزا محمد حسن کے والد کا نام علی محمد خان تھا۔ ٦٠

☆

پالن پور

طالع محمد خان،
ان کے بیٹے اقبال محمد خان (بائیں) اور
عطا محمد خان (دائیں)

دیوان پالن پور

امام باڑہ

نواب کا روضہ

کِنگ جِیورج کلبِ

نواب کا باغیچہ

پالن پور

شاعر حکيم سيد لال ميان خان جي ميان

نواب پالن پور

بيگم کيپٽن عطا محمد خان جي

کيپٽن عطا محمد خان جي

پالن پور

تاریخی اعتبار سے اب ہم گجرات کے پالن پور کا ذکر کرتے ہیں۔ ۱۷ ویں صدی میں حکومت گجرات (ریاست گجرات) کئی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ اور یہاں نوابوں اور باپوؤں (ہندو نواب) یعنی ہندو مسلم امراؤں کے انصرام میں تھی اور ان امراؤں نے اپنی اپنی ریاستوں میں نمایاں طور پر اپنا فرض ادا کیا۔ انتشار و خلفشار کے زمانے میں بھی ان لوگوں نے رعایا پروری سے کبھی منہ نہ موڑا اور اپنی حکومت کو ہر لحاظ سے بنائے رکھا۔

ریاستِ پالن پور پر ایک طائرانہ نظر

ہندوستان کی ریاست راجستھان جو ایک بہت بڑا ریگستانی علاقہ ہے جہاں گجرات اور راجستھان کی سرحد واقع ہے اس جگہ پالن پور گجرات کا پہلا سرحدی شہر ہے۔ یہ شہر زمانۂ ماضی سے ہی اپنے مختلف خصوصیات کی بناء پر مشہور ہے۔ یہ پھولوں اور خوشبوؤں کا شہر مانا جاتا تھا۔ لیکن بعد میں یہ ہیروں کے شہر سے بھی منسوب ہوا۔ یعنی اسے لوگ ڈائمنڈ سِٹی بھی کہتے تھے۔ ۶۱؎

مناسب ہے کہ پالن پور کی وجۂ تسمیہ پر طائرانہ نظر ڈالتے چلیں۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو پرانے زمانے میں حکومت گجرات کا دارالحکومت مختلف شہروں میں تبدیل ہوتا رہا ہے۔ جس راجا یا نواب نے مناسب سمجھا اس شہر کو اپنی سہولت کے مطابق دارالحکومت بنا دیا۔ مثلاً بھینمال، ولبھی پور، پنچاسر وغیرہ وغیرہ۔ جب چاوڑا راجاؤں کی حکومت وجود میں آئی تو انھوں نے پنچاسر کی جگہ انہل پور پٹن کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اسی طرح مختلف خاندانوں نے گجرات پر حکومت کی۔ چالوکیہ خاندان سولنکی خاندان۔ ان میں مشہور ہیں۔ اور یہ خاندان اپنی مرضی کے مطابق اپنا دارالخلافہ بدلتے رہتے تھے۔

پالن پور ضلع بناس کانٹھا میں واقع ہے۔ بناس کانٹھا دریائے بناس کے کنارے پر آباد ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام بناس کانٹھا رکھا گیا۔ پالن پور کسی زمانے میں مراٹھا راجاؤں کے زیر حکومت تھا۔ اس وقت یہ شہر بہت ہی معمولی آبادی رکھتا تھا۔ راجا پرہالادن شاعر تھا اور اس کا تخلص پالن تھا۔ اسی مناسبت سے اس شہر کا نام پالن پور رکھا گیا۔ راجا پرہلادن نے اس شہر میں مندر تعمیر کروائے خاص کر جین مندروں کی تعمیرات کی طرف خاص دھیان دیا گیا۔ راجا کو فنون لطیفہ سے بڑا شغف تھا۔ اس کے دربار میں پنڈتوں اور آچاریوں کی بڑی قدر ہوا کرتی تھی۔ انھیں ہر طرح کی سہولتیں دی جاتی تھیں۔ راجا نے ان سے بہت سی مذہبی کتابیں تحریر کروائی تھیں۔ ۶۲

شہر پالن پور وادی میں بسا ہوا شہر ہے۔ بہت سی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ پالن پور چوٹیلا، دیوانیہ، گھانکھو، شور بکھیری، لوکھا، اشبونی، گروکا پہاڑ، رانی ٹوگ، سرجنا، گاجنا، لوچڑی، ہوہونیا، سابر میٹھا مشہور پہاڑیوں کے دامن میں ہے۔ ان پہاڑیوں میں ریچھ، سانبر اور نیل گائے وغیرہ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ امراء اور یوروپین لوگ شکار کی غرض سے یہاں آیا کرتے تھے۔ پہاڑی علاقے میں ہونے کی وجہ سے یہاں بہت قسم کے درخت پائے جاتے ہیں۔ یہاں عمارتی لکڑی خوب دستیاب ہوتی ہے۔ بالا رام، مہادیو لگنار یا مہادیو اور جاسور کی پہاڑی پر کیدارناتھ مہادیو وغیرہ بہترین سیر گاہ ہیں۔ قدرتی مناظر کے لیے یہ جگہ بہت ہی مشہور و مخصوص ہیں۔ ہر وقت آبشار جاری رہتے ہیں۔ اور ان سے بننے والے چشموں کی وجہ سے اطراف کی زمینیں شادابی و تراوت میں سدا بہار رہتی ہیں۔ جہاں کی آب و ہوا معتدل اور خوشگوار ہے۔ اناجوں میں ہر قسم کے اناج کی کاشت ہوتی ہے۔ پہاڑی جنگلات ہونے کی وجہ سے مختلف قسم کی ادویات بھی میسر ہوتی ہیں۔ میوہ جات میں یہاں آم، مہوا، امرود، شریفہ، سیب، نارنگی، انار، شہتوت، خربوزہ، تربوز، کیلا، جامن، گوندنی، خرنی، فالسہ، انجیر وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ پھولوں میں چمپا، کیوڑا، کیتکی، موتیا، گلاب، چمیلی، گھرہل، مولسری، نیلوفر، گل داؤدی، گیندا، ہزارا، سدا بہار، شبو اور کرنی وغیرہ مشہور ہیں۔ ۶۳

سبزی ترکاریوں میں دراز گھیا، میٹھا گھیا، ککڑی، آلو، شکرقند، مولی گاجر، کھیرا، گوبھی، مٹر، شلجم، بیگن، ترئی، بھنڈی، کریلا، بنڈا، کرم کلا وغیرہ پیدا ہوتا ہے۔ ہرے پتوں کی سبزیوں میں پالک، میتھی، بتھوا، چولائی وغیرہ ہوتی ہے۔ ۶۴ے

اس علاقے میں زراعت بھی اچھی ہوتی ہے۔ یہاں دوقسم کے کاشتکار زیادہ تر آباد ہیں۔ آنجھنا اور کروڑوا قوم کے کاشتکار ہیں۔ ان کے علاوہ سیوا لیویا اور مسلمان کسانوں میں مومن قوم کے کاشتکار بھی موجود ہیں۔ ان کے علاوہ مسلمانوں میں جالوری سپاہی ہندوؤں میں راجپوت اور برہمن بھی زراعت پیشہ لوگ ہیں۔ جن کی قوموں میں کوئی بھیل بنجارے، گراسئے، باگری وغیرہ کاشت کاری کرتے ہیں۔ تجارت پیشہ لوگوں میں خاص کر بنیئے مہاجن ہیں۔ جن کا مذہب جین ہے۔ یہ بڑے دولتمند ہوتے ہیں۔ اُشوال اور پردار یہ دوقسم کے ہیں۔ مسلمان بیوپاری میں شیعہ بوہروں نے تجارت میں کافی ترقی کی ہے۔ یہ سدھ پور کے داؤدی بوہروں کے لقب سے پہچانے جاتے ہیں۔ بمبئی، بڑودہ، گجرات کے کئی علاقے مالوہ اور ہندوستان کے مختلف ریاستوں میں ان کی تجارت جاری ہے۔ یہاں بوہروں کی ایک شاخ اور بھی بستی ہے۔ بیس نگری بوہروں کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ لوگ چمڑہ، چربی، سینگھ، ہڈی، موم اور ریشم وغیرہ کی تجارت کرتے ہیں۔ ان میں سے کئی لوگ بساط خانہ کی دکانیں بھی کرتے ہیں۔ ان حسنی بہروں کی طرح یہاں میمن لوگ بھی آباد ہیں۔ ۶۵ے

وقت گزرتا گیا اور حالات تبدیل ہوتے رہے۔ رفتہ رفتہ راجاؤں کی حکومتوں کو زوال آتا گیا۔ اور ایک وقت ایسا آیا کہ اسی پالن پور شہر پرمسلم نواب حکمران ہوئے شہر میں نئے نئے محلات تعمیر ہوتے گئے۔ نوابی محلات، راج گڑھی ہوا محل، رانی باغ اسی دور کی یادگاریں ہیں۔ کرتی استمبھ بھی اسی نوابی زمانے کی یادگار ہے۔ یہ مینار آج بھی پالن پور کی آن بان شان کی گواہی دیتا ہے۔ محل ذورآور جس میں آج کل سرکاری دفاتر قائم ہیں پالن پور کی شان و شوکت کا گواہ ہے۔ اس نوابی حکومت کے دوران شہر پالن پور نے بہت ترقی کی اس کے آخری حکمران نواب طالع محمد خان

تھے۔ ان کی وفات ۱۹۵۷ء میں ہوئی کہا جاتا ہے کہ پالن پور کے نوابوں کا سلسلۂ نسب خالد بن ولیدؓ کے خاندان سے ملتا ہے۔ نواب طالع محمد خان کے آبا و اجداد افغانستان کے لوہانی پٹھانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان لوہانی خاندان کے لوگوں نے بہار کی ریاست پٹنہ میں بغرض تجارت کے بود و باش اختیار کی تھی۔ حکومت مغلیہ میں اسی خاندان کو راجستھان کے جالور کا فرما رواں بنایا گیا۔ جہاں مرحوم نواب طالع محمد خان صاحب کے جد امجد خرم خان لوہانی کی حکومت رہی۔ ۱۸۴۸ء میں مجاہد خان نے اپنے والد فیروز خان کی وفات کے بعد جالور کی بجائے پالن پور کو اپنا دار الریاست بنایا۔ تاریخ پالن پور میں یہ نوابی دور حکومت مساوات، قومی یکجہتی و امن پسندی میں مشہور تھا۔ یہاں ہندو مسلم بھائی چارہ تھا۔ اس دورِ حکومت میں کوئی ہندو تہوار ایسا نہ تھا جو کسی خاص قوم یا فرقے تک محدود سمجھا جاتا ہو۔ کیونکہ دسہرہ ہو یا عید، دیوالی ہو یا محرم تمام تہوار ہندو مسلم اپنا خود کا تہوار سمجھ کر جشن مناتے اور باہمی خلوص اور بھائی چارگی کے ساتھ انجام دیا کرتے تھے۔ عید اور دسہرے جیسے تہواروں کے جلوس میں نواب صاحب بذات خود اپنی سواری پر ہجوم میں شامل رہتے اور یہ تہوار خلوص و محبت کے ساتھ منائے جاتے۔ اس دور حکومت میں نواب صاحب مرحوم ے مشیران خاص میں غیر مسلم جین برہمن خصوص عہدوں پر فائض تھے۔ مدارالمہام رنچھوڑ لال پٹواری منصف اپیل، ادھی جی گھیلا جی منصرم، شوبھاگ چند کوٹھاری، فرسٹ کلاس مجسٹریٹ مدن لال کوٹھاری اور سہراب جی پستم جی اعلیٰ افسر تھے۔ ٦٦

جنگ آزادی کی کوششوں و کاوش میں دیگر والیان ریاست فرنگیوں کے حامی تھے۔ جب کہ نواب طالع محمد خان بابائے قوم مہاتما گاندھی جی کی تحریک آزادی میں معاون خاص تھے۔ اور ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ نواب صاحب انسان دوست شخصیت کے مالک تھے۔ جہاں تک جنگ آزادی میں فرنگیوں سے دشمنی مول لینا از حد خطرناک امر تھا۔ باوجود اس کے انھوں نے آخر مغل سلطنت کے چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر کے شہزادے جو حکومت انگریز کے ظلم و ستم سے بچنے کی خاطر روپوشانہ زندگی گزار رہے

تھے اور صوفی صاحب کے نام سے مشہور تھے انھیں نواب صاحب مرحوم نے اپنے یہاں پناہ دے رکھی تھی۔ شہزادہ موصوف کا مزار شہر ڈیسا میں موجود ہے۔ ۶۷

پالن پور پھولوں اور خوشبوؤں کے نام سے بھی بہت مشہور ہے۔ کیونکہ یہاں کے گلاب، چمپا اور کیوڑا کے پھول پودے تمام ملک میں شہرت رکھتے ہیں۔ یہ پالن پور کی سرزمین کو خدا کا عطیہ ہے کہ یہاں کے پھولوں کے اقسام اعلیٰ قسم کی ہیں۔ کہا جاتا ہے کئی راجاؤں نے یہاں سے چمپا کے پودے لے جا کر اپنی ریاستوں میں لگوائے لیکن وہ بارآور ثابت نہ ہوسکے یہاں کا عطر دور دراز کے علاقوں تک اپنی مثال رکھتا ہے۔ گجرات میں کھمبایت عقیق کا شہر شمار کیا جاتا ہے۔ راجستھان کی راجدھانی جے پور بھی مصنوعی ہیروں کا مرکز مانا گیا ہے۔ اسی طرح پالن پور بھی غیر ملکوں میں ہیرے اور جواہرات کی باعث عالمی شہرت حاصل کیے ہوئے ہے۔ خصوصاً اسرائیل، بیلجیم اور جرمنی میں، جہاں عالمی شہرت یافتہ بازار ہیں وہاں پالن پور کے ہیرے برآمد کیے جاتے ہیں۔ اس صنعت و حرفت میں پالن پور کے جین تاجروں کا اپنا مقام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بمبئی کے جوہری بازار میں پالن پور کے ۹۰ فیصد تجارت پیشہ جین تاجروں کا حصّہ ہے۔ ۶۸

تقسیم ملک کے بعد پالن پور بھی اقتصادی بحران سے گزرنے لگا اور اس کا اثر صنعت و حرفت پر بھی ہوا۔ پالن پور کے مفلوک الحال عوام بیڑی سازی کو اپنا ذریعۂ معاش بنا چکے تھے۔ اور بہت سے لوگ اسی پر اپنا دار و مدار رکھتے تھے۔ لیکن جیسے ہی حالات بدلے اور ہیرے کی صنعت کو فروغ حاصل ہوا لوگوں نے اس کاریگری کو اپنا لیا اور ایک خوشحال زندگی بسر کرنے لگے۔ یہاں ہیروں کے سینکڑوں کارخانے ہیں جن میں ہزارہا کاریگر برسرِ روزگار ہیں۔ ہیرے کی درآمد اور برآمد سے ملک کو کروڑوں روپیہ غیر ملکی زرِ مبادلہ (Foreign Exchange) حاصل ہوتا ہے۔ دراصل یہ صنعت عالمی مارکیٹ تک پالن پور کے جین تاجروں کے ہاتھوں میں ہے۔ ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۶ء وشو گجری ایوارڈ پالن پور کے ہیروں کے تاجر اور صنعت کار مفت لال مہتا کو عنایت کیا

گیا تھا۔ ۶۹؎

پالن پور اور اس کے مضافات کے آثار قدیمہ

پالن پور کی تاریخی شہر ہونے کی وجہ سے یہاں بھی آثار قدیمہ پائے جاتے ہیں۔ ہندو مسلم دونوں قوموں کے قدیم آثار آج بھی موجود ہیں۔ مثلاً

پاتالیشور مہادیو

پاتالیشور مہادیو کا مندر پالن پور کے دہلی دروازے کے باہر واقع ہے۔ یہ مندر زمین میں تہہ خانے کی طرز پر باؤلی نما بنا ہے۔ اس کی سیڑھیاں سنگِ مرمر کی ہے۔ ۱۰۹۱ء میں گجرات کا مشہور راجہ سدھ راج جئے سنگھ اسی مقام پر پیدا ہوا تھا۔ جس کی ماں مینل دیوی گجرات کے سولنکی راجا کرم سنگھ کی مہارانی تھی۔ یہ مندر نہایت مقدس مانا جاتا ہے۔ ۷۰؎

جامع مسجد

۱۸۴۷ء میں دیوان فتح خان ثانی نے کئی پرانے آثار پر اس مسجد کو وسعت دے کر بنایا۔ بعدازاں ۱۸۹۳ء میں ہز ہائنیس سر شیر محمد خان بہادر نے اس مسجد کو اور زیادہ وسعت دی۔ جس کی وجہ سے یہ کافی کشادہ ہوگئی۔ ۷۱؎

مسجد موضع پالن

علاقۂ پالن پور میں ایک جامع مسجد سنگِ سفید سے بنی ہوئی ہے۔ یہ کہنہ حال عمارت اسلامی شان و شوکت کی یاد دلاتی ہے۔ کیونکہ اب وہ بڑی خستہ حالات میں ہے۔ بہرہ قوم نے اس مسجد کی تعمیر نو کی۔ مسجد کے کتبے کی عبارت میں لکھا ہوا ہے کہ یہ عمارت اس زمانے کی بنی ہوئی ہے جب کعبہ کی طرف سجدہ کرنے والے خدا پرستوں نے ملک گجرات میں اسلامی پرچم لہرایا تھا۔ اور ناقوس کی جگہ اللہ اکبر کی صداؤں سے پہاڑ گونج اٹھے تھے۔ اس مسجد کو خان اعظم الغ خان نے ۱۳۲۵ء میں تعمیر کروایا تھا۔ اس کتبے کی زبان عربی ہے۔ اس کتبے کی طرزِ تحریر اور رنگ و عبارت بالکل غیر مانوس اور بے ربط ہے۔ کیونکہ یہ انشاء پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ ۷۲؎

سلوترا کا مندر

پالن پور کے موضع سلوترا میں بہت سے پرانے کھنڈرات اور جینوں کا پرانا مندر ہے۔ یہ عمارت سنگ مرمر سے بنائی گئی ہے۔ اس مندر کے تھوڑے فاصلے پر ایک باؤلی ہے۔ مندر سے باؤلی تک جانے کے لیے زمین دوز راستہ بھی بنا ہوا ہے۔ اسی طرح بھیکڑی کا مندر سودھا ماقا دیول وغیرہ آثار قدیمہ آج بھی موجود ہیں۔ ۳ے

ڈیسا کے آثار

یہ قصبہ پالن پور سے تقریباً ۲۴ کلومیٹر کے فاصلے پر بناس ندی کے کنارے بسا ہوا ہے۔ کسی زمانے میں یہ ایک بڑا شہر تھا اور اس کا نام فرید آباد تھا۔ جب یہ ویران ہوگیا اور وہاں بہت کم آبادی رہ گئی جن میں خاص کر دیسے اور بیشے مہاجن اور چند برہمنوں کے گھر باقی رہ گئے تھے۔ چونکہ آبادی کا بڑا حصّہ دیسے مہاجنوں کا تھا۔ اس لیے اس ویران شہر کو دیسا کہا جانے لگا اور یہ وقت گزرنے پر یہ ڈیسا ہو گیا۔ ۱۷۵۶ء میں دیوان بہادر خان نے ڈیسا کی شہر پناہ تعمیر کروائی تھی۔ جو اب کھنڈر میں تبدیل ہوئی۔ اس شکستہ فصل میں چار دروازے تھے۔ جن میں سے اس وقت تین دروازے موجود ہیں۔ لیکن یہ بھی حد درجہ شکستہ ہو گئے ہیں۔

پالن پور کے موضع سلوترہ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر شمال کے جانب ٹھاکروں کی جاگیریں ہیں۔ یہاں اسی شہر میں سلوترہ کی شکستہ عمارات اور کھنڈرات ہیں اور ایک جین مندر بھی ہے۔ اس کھنڈرات کو دیکھنے سے شہر کی گذشتہ عظمت و جلال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ۴ے

مختلف قوموں کے مقدس مقامات

نوشہید

عیدگاہِ پالن پور کے متصل نوشہیدوں کی قبریں بنی ہوئی ہیں۔ میراثیوں (بھاٹ) کی بہی میں ان کی کیفیت بیان کی گئی ہیں۔ کہ ۱۲۸۰ء مطابق ۱۲۲۶ء ھ ۶۲۳ پھاگن سودی دو (۲) جمعہ کو شمس الدین کے زمانے میں مالدیو پور شہر پالن پور اور بھولا بھیم

پٹن کے راجہ کے درمیان لڑائی ہوئی تھی۔ بھیم کی فوج میں چونکہ بھیل اور کوہلی وغیرہ لٹیرے بھی شریک تھے۔ اس لیے انھوں نے موقع پا کر پالن پور کے مویشیوں پر قبضہ کیا اور ان کو لے کر اپنے گھروں کی طرف جانے لگے یہ نو حضرات جو حج بیت اللہ کو جاتے ہوئے ایک رات کے لیے پالن پور ٹھہر گئے تھے۔ لوگوں کے شور و غل اور اس چاند ماری کی آواز سن کر ان لٹیروں کے تعاقب میں گئے اور نوبت مقابلے تک پہنچ گئی لیکن چونکہ لٹیروں کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لیے یہ سب کے سب ان ظالموں کے ہاتھوں سے درجۂ شہادت کو پہنچے ان شہداء کے نام یہ ہیں۔ حاتم شاہ، سید مطلب شاہ، سید مراد شاہ، سید مبارک شاہ، سید حسین شاہ، سید اول شاہ، سید محمد شاہ، سید بڑا میاں اور سید محمد شاہ ان نو شہدا حضرات کی قبریں ہیں۔ اور اس سے متصل ایک بہت بڑا قبرستان بھی ہے۔ ۷۵

ناگورنی بائی

دہلی دروازے کے باہر جانب شمال نورنگی پیر کی درگاہ کے قریب کا چھیوں کی باڑی میں ناگورنی بائی کی قبر ہے۔ ان کا نام معلوم نہیں ہو سکا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ ایک مسلمان ناگور کی لڑکی تھی۔ اسی مناسبت سے ان کا لقب ناگورنی بائی مشہور ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ ناگورنی بائی ۱۲ سال کی عمر میں ایک روز حسب معمول اپنی سہیلیوں کے ساتھ لکڑیاں چننے کے لیے آئی تھیں۔ اتفاقاً چند بدمعاش لٹیرے بھی اس طرف آ نکلے کیونکہ وہ زمانہ بدامنی کا تھا۔ ان جرائم پیشہ ظالموں نے ان بے کس لڑکیوں کے زیورات چھین کر ان کی عصمت بھی لوٹنا چاہی۔ ان ظالموں کو دیکھ کر وہیں کھڑے کھڑے ناگورنی بائی نے بارگاہ ایزدی میں دعا کی اور نہایت عاجزی کے ساتھ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے ایسے الفاظ استعمال کیے ’’کچھ نہیں تو میں جس جگہ کھڑی ہوں وہ زمین پھٹ جائے اور میں سما جاؤں تا کہ میری پاک دامنی پر دھبہ نہ آئے۔‘‘ اور خدا کے رحم و کرم سے اسی وقت زمینن شک ہو گئی۔ ناگوری بائی اس میں سما گئی وہیں پر ان کی قبر ہے اور فی الحال ان کی قبر پر منتیں چڑھتی ہیں اور سیکڑوں لوگ ان کے معتقد ہیں۔ ۷۶

سید اشرفؒ

حضرت بندگی میاں سید اشرف عرف اچھو بی میاں صاحب کا گنبد دار مقبرہ سلیم پورہ دروازے کے باہر بنا ہو ہے۔ اس مقبرے کو دیوان مجاہد خان ثانی نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ حضرت سید وہیں راجپوتوں میں پیدا ہوئے تھے۔ اس زمانے میں مرشدا نے گروہے مہد یا جالودر اور دیگر مقامات کے علاوہ میروہی میں بھی دائرے گزیں تھے۔ چونکہ سید اشرف کو ان کے والد بزرگوار کی وصیت تھی کہ اپنے چچا سید نور محمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی حمیت و ہدایت سے فیض باطنی حاصل کرے اس لیے سید اشرف جالودر سے اپنے چچا کی خدمت میں دھاواسن (دکن) شریف لے گئے اور آپ کے فیض صحبت سے بہت سے مراتب دینی حاصل کیے اس طرح سید اشرف کئی بار اپنے چچا کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔

سید اشرف صاحب بڑے مرشد کامل اور خداداد رسیدہ بزرگ ہوگزرے ہیں۔ خاندانی ہتانی کے رؤسا آپ کے نہایت عقیدت مند تھے اور اسی لیے سید اشرف بھی جالودر سے پالن پور میں آکر بس گئے تھے۔ یہاں آنے کے بعد آپ نے اپنا ایک دائرہ قائم کیا جو اب تک سید اشرف کے دائرے کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کو اکثر سوز جسم کی شکایت رہا کرتی تھی۔ اس لیے آپ نے اپنے مکان کے ضمن میں حوض بنا رکھا تھا جب سوز جسم زیادہ تکلیف دیتی تو آپ اس حوض میں بیٹھ جایا کرتے۔ یہ حوض آج بھی موجود ہے کہا جاتا ہے کہ سید اشرف کو پٹن کے ملایان گروہ نے زہر دلوا دیا۔ اور اسی زہر کی اثر سے انہوں نے رحلت فرمائی۔ آپ کے خاندان میں رہبری مریدی کا سلسلہ جاری ہے۔ اس وقت سید دادجی میاں اور سید عالم صاحب سجادہ نشین ہیں ہز ہائی نیس اور ہز ہائی نیس کے تمام اہالیان خاندان کے، ہز ہائی نیس پالن پور کے تمام اولیاء مہدوی مذہب کے لوگ یہیں دفن کیے جاتے ہیں۔ یہ قبرستان پالن پور کے دوسرے قبرستانوں سے کافی بڑا ہے۔

اسی طرح اور دوسرے صاحبان میں سید مرتضٰی صاحب کا مزار بھی ہے۔ سید

مرتضیٰ ولی کامل اور بڑے بزرگ مانے جاتے ہیں۔ پالن پور اور علاقۂ پالن پور میں کثرت سے ان کے مرید ہیں۔ ان کے مقبرے میں سات قبریں ہیں۔

سید انوار صاحب کی قبر پر بھی ایک چھوٹا سا گنبد بنا ہوا ہے۔ جس میں تین قبریں ہیں۔ ایک اور صاحب نورنگی ہیں جن کا اصلی نام نوروز بیگ تھا جو فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ یہ عربوں کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔ آج کل لوگ ان کی قبر پر بھی چڑھاوے لاتے ہیں۔ ۷۷؎

میرا داتار کا چلّہ

میرا سید علی عرف میرا داتار کا ایک مزار ہے جو اوناوا میں ہے یہاں بہت بڑا قبرستان بنا ہوا ہے۔

نعمت علی

نعمت علی کا مقبرہ سپرنٹینڈنسی کی کوٹھی کے قریب ہے۔ ان خدا رسیدہ بزرگ نے کسی شخص کے خواب میں آکر اپنی ولایت کی بشارت دی تھی۔ اسی بناء پر وہاں ایک چھتری بنا دی گئی جس میں علی کا چلہ کہا جاتا ہے۔ عقیدت مند لوگ وہاں بھی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔

فضل معصوم

یہ حضرت کابل کے مشائخین میں سے تھے ان کے خاندان میں پیری مریدی کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ کابل میں سلطنت کے اُتھل پتھل کے وقت ان کا خاندان اور بہت سے لوگ سے افغانستان سے جلاوطنی کی حالت میں علاقۂ حیدرآباد سے سندھ پہنچے تھے اور وہیں اپنا مسکن بنا لیا۔ فضل معصوم سیاحت کی غرض سے اتفاقاً پالن پور چلے آئے اور یہاں سناریا کے ایک بنگلے میں فروکش ہوئے۔ اچانک جان لیوا بیماری میں گرفتار ہوئے اور وہیں انتقال ہوا۔ موضوع پالن پور کے راستے پر مدفون ہیں ان کی قبر پر نواب صاحب نے ایک چھوٹی سی چھتری تعمیر کروائی ہے۔

فضل معصوم صاحب جامع علوم اور مشاق مقرر تھے۔ ان کا واعظ اور پند نصیحت

کا طریقہ نہایت ہی موثر تھا۔ بہت سے لوگ ان کے حلقۂ مرید بن چکے تھے۔ ۷۸

عید گاہ پالن پور

پالن پور کی عید گاہ بھی دیگر عید گاہوں کی طرح اپنا مقام رکھتی ہے۔ گھٹامن دروازے کے باہر ریاستی جیل کے قریب واقع ہے اس عیدگاہ کو دیوان مجاہد خان ثانی نے ۱۶۴۹ء میں تعمیر کروایا تھا۔

مساجد

شہر پالن پور میں جامع مسجد کے علاوہ سولہ(۱۶) چھوٹی بوہروں کی اور نو مسجدیں سنی عقائد کے لوگوں کی ہیں۔

راج بائی کا تکیہ

دہلی دروازے کے باہر راج بائی کا تکیہ ہے دراصل یہ ایک قبرستان ہے۔ راج مین جمعدار کا گنبد دار روزہ بھی اسی قبرستان میں بنا ہوا ہے۔

شیعہ بوہروں کا قبرستان

یہ سورج پال دروازے کے قریب ہے اس میں ایک چھوٹی سی چھتری اور خوش قطع مسجد بنی ہوئی ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی بنا ہوا ہے۔ اس کی آبیاری کے لیے کنواں اور حوض بھی تعمیر کیا گیا ہے۔

میمنوں اور بکر قصابوں کا قبرستان

پالن پور میں میمن قوم کے لوگوں اور بکر قصابوں کا بھی ایک قبرستان ہے۔

جینوں کے مندر

جین مذاہب کئی منادر جنھیں دیسرا کہا جاتا ہے پالن پور میں بھی کئی موجود ہیں۔ پارس ناتھ جی، شانتی ناتھ جی وغیرہ مندر نہایت ہی عالیشان اور قابل دید ہیں۔ ان مندروں پر لاکھوں روپیہ صرف ہو چکا ہے۔ یہ مندر پالن پور کے جینوں کے مستعمل ہونے کا ثبوت ہے۔ ۷۹

ہندوؤں کے مندر

ہندوؤں کے بھی یہاں تقریباً ۴۵ مندر ہیں۔ شنکر، وشنو، پنچ دیوی، ہنومان

پاتالیشور مہادیو وغیرہ کے مندر موجود ہیں۔ ان مناظر کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہاں اہل ہنود نے اپنے مذہبی، رنگ کو سرگرم رکھا تھا۔ اور دوسرے فرقوں کے مقابلے میں ان کا اعلیٰ درجہ تھا۔ ۸۰؎

مندرجۂ بالا پالن پور ے حدود و اربع اس میں بسنے والی اقوام کی مذہبی عمارتوں پر اچٹتی نظر ڈالنے کے بعد پالن پور کی سماجی و معاشرتی حالت کا ذکر کریں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی دیگر ریاستوں کا رواج جاری تھا۔ انسانی ضرورتوں اور تبادلۂ خیالات اور مبادلۂ اشیاء کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے یہ میلے ٹھیلے شروع ہوئے تھے۔ کیونکہ مذہبی پیشواؤں تمدنی دفاتروں یا تقاضائے وقت نے ہر شخص کو ایک سے دوسرے مقامات پر جانے اور ہر قسم کے لوگوں سے ملنے کے لیے مجبور کیا ہوگا۔ تبھی اس قسم کی روایات قائم ہوئی ہوں گی۔ ہر شہر اور ہر قصبے میں ایک خاص دن مقرر ہوا۔ کہیں ہفتہ میں اور کہیں مہینے میں اور کہیں ہر سال اچھا خاصہ مجمع ہونے لگا۔ اور آخر کار اس نے میلے کی صورت اختیار کر لی۔ ریاست پالن پور میں بھی جابجا میلے ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً دیوان زور آورخان صاحب کا میلہ فضل معصوم صاحب کا میلہ، میرا داتار کا پاتالیشور کا اسی طرح اور بہت سے میلے پالن پور میں ہوتے رہتے ہیں۔ میلوں کا منعقد ہونا ریاست میں میلے اور عرس کا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ریاست میں امن و امان قائم ہے اور اس بات کا دار و مدار قائد وقت کی رواداری پر ہوتا ہے۔ پالن پور کے رؤسا اور نوابوں نے اپنے زمانۂ اقتدار میں جہاں تک ہو سکا رعایا پروری کا خیال رکھا۔ ہر شعبہ کی طرح انھوں نے ادبی شعبے کی بھی خدمات انجام دی۔ ۸۱؎

پالن پور کے شعراء حضرات

اوجسؔ پالن پوری

پالن پور غزل گو شعراء کے لیے گجرات اور بیرون گجرات میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ پالن پور کے غزل گو شعراء میں 'شنیہ' پالن پوری سیف پالن پوری امر پالن پوری اور رجنی پالن پوری جیسے مشہور شعراء کی ادبی خدمات کی وجہ سے مشہور ہے۔ ان

حضرات کی فہرست میں ایک دمکتا نام اوجسؔ پالن پوری فروغ کا بھی ہے۔ جو شنیہؔ پالن پوری کے شاگرد رشید تھے۔ ان کی غزلوں میں جو سوز و گداز پایا جاتا ہے وہ پالن پور کے دوسرے شعراء حضرات کے کلام میں بہت کم نظر آتا ہے۔ ان کی سخن طرازی دوسرے شعراء حضرات سے بالکل جداگانہ ہے۔

خاندانی حالات

علی میاں سید کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا جن کا نام موٹا میاں سید تھا۔ موٹا میاں سید ہی اوجسؔ پالن پوری ہیں۔ ان کے استاد گرامی نے موٹا میاں کا تخلص 'اوجس' پسند کیا اور اسی تخلص کو انھوں نے اپنایا۔ اوجس پالن پوری نے کسی مدرسے میں اعلیٰ تعلیم پائی اسکول میں انہوں نے صرف ۶ جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن اردو اور گجراتی ادب کا انھوں نے وسیع مطالعہ کیا تھا۔ پالن پور کے قریب ان کے والد صاحب کے چیکو کے باغات تھے۔ ان باغات کی دیکھ بھال کا کام اوجس کیا کرتے تھے۔ اور یہی وہ جگہ تھی جہاں مکمل سکوت انہیں میسّر تھا۔ یہی پر بیٹھ کر انھوں نے اپنی غزلوں کی تخلیق کی۔ اوجس نفسیاتی طور پر تنہائی کو پسند کرتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں یاس، افسردگی صاف نظر آتی ہے۔

اوجس کے جد امجد سید لال میاں اردو زبان کے مشہور شاعر تھے۔ کلیات لال ان کا مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے۔ اوجسؔ کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ اوجسؔ گجراتی میں بھی شعر کہتے تھے۔ اور اردو میں بھی۔ اردو میں وہ اپنا تخلص فروغؔ کرتے تھے۔ اردو زبان میں بھی ان کا کلام بہت خوب تھا۔[۸۲]

نمونۂ کلام

جس سفینہ کے ناخدا ہوں بہت
اس کا کوئی خدا نہیں ہوتا

......

لحد کو آخری منزل سمجھنا عین غفلت ہے
جہاں کشتی ٹھہر جائے اسے ساحل نہیں کہتے

......

اسی طرح ان کا ایک شعر قابل داد ہے۔

شیخ جی آپ تو فرشتہ ہیں
مجھ کو سجدہ کرو میں آدم ہوں

......

فروغؔ کے نام سے کہی ہوئی ان کی اردو کی تمام تخلیقات گجرات اردو ساہتیہ اکادمی کے سالانہ رسالے میں شائع کی گئی ہے۔

فروغؔ پالن پوری کا گجراتی کلام جس طرح مشہور ہوا اسی طرح ان کا اردو کلام بھی اپنی نظیر آپ ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام پیامِ فروغ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ فروغ کے دادا محترم لال میاں سید بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کا مجموعۂ کلام کلیات لال کے نام سے مشہور ہے۔ فروغ کو علم و فضل سے بہت کم واقفیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اردو کلام بہت کم لکھا ہے۔ فروغ کی موت بھی ایک سانحہ تھی۔[1] مسافرؔ پالن پوری نے ایک مضمون میں فروغ کی وفات سے متعلق ایک واقعہ درج کیا ہے۔ 1968ء کی بات ہے کہ فروغ صاحب پالن پور کے چھوٹی بازار کے علاقے میں جہاں ان کا مکان واقع تھا ایک چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اتفاق کی بات ہے مسافر پالن پوری کا وہاں سے گزر ہوا۔ فروغ صاحب نے مسافر کو آواز دی مسافر نے کچھ دیر بعد آنے کا وعدہ کیا اور چلے گئے۔ جب وہ اپنے وعدے کے مطابق ان سے ملنے واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ فروغ صاحب وہاں موجود نہیں تھے لوگوں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ ہسپتال میں ہیں کیونکہ انہیں سانپ نے ڈس لیا تھا۔ دوڑتے دوڑتے ہسپتال پہنچے زہر اپنا کام کر چکا تھا۔ صرف دو روز میں ۴/اکتوبر ۱۹۶۸ء صبح فروغ نے رحلت فرمائی۔[۸۳]

نمونۂ کلام

مجھے محسوس ہوتا ہے وہ جنت ہی کا نقشہ تھا
تصور میں مرے جس دم محمدؐ کا مدینہ تھا
تم ہی تم تھے شب معراج میں بس دوسرا کیا تھا
نہ پردہ تھا نہ جلوہ تھا نہ بندہ تھا نہ آقا تھا
فروغ ایک خواب میں دیکھی تھی میں نے دھوپ محشر کی
مگر میں بچ رہا تھا مجھ پہ اک کملی کا سایہ تھا

......

محبت میں دل ناکام اپنا
کبھی سمجھا نہیں انجام اپنا
کیا مشہور ہم نے نام ان کا
ہوا بدنام ان سے نام اپنا
غزل کے بندۂ بے دام ہیں ہم
یہ فن ہے بندۂ بے دام اپنا

......

پالن پور کے دو شاعر شونؔیہ اور سیفؔ پالن پوری دونوں بمبئی میں جا بسے تھے۔ اس لیے اوجسؔ پالن پور میں تنہا رہ گئے۔ یہاں انہیں شاعرانہ ماحول نہیں مل پایا۔ ویسے اوجس کی غزلیں ہی کچھ اس انداز کی ہوا کرتی تھیں کہ وہ زبان زد عام نہ ہو سکی۔ لالا واڑ کے چیکو کے باغات قدرتی ماحول ان کے لیے بڑا ہی مفید ثابت ہوا اور جس کا ایک شعر بہت ہی مشہور ہوا جس کی تعریف میں گجراتی کے مشہور شاعر مریض نے بمبئی میں ایک مشاعرہ میں کہا تھا کہ گجراتی زبان کا ایک بہت ہی قوی شاعر پالن پور کے مضافات میں آئے ہوئے ایک چھوٹے سے گاؤں میں تیار ہوا ہے۔

نمونۂ کلام

عرش علیٰ پر دھوم مچی تھی الحمدللہ نور کی مسند بچھی تھی
عرش علیٰ پر دھوم مچی تھی
توحید کے رنگ کے سے زمزمے درود شریف کی پچکاری

بسنت

رت آئی بسنت کھل رہی بہار
کرت ھلاس سبھی نر نار
رت آئی بسنت کھل رہی بہار
سیوبھی پھلیں سرسوں پھولیں
اموار کھلیں ڈار ڈار
گوپی ناتھ ناچت سکھشن سنگ گل بہار ڈار ڈار
رت آئی بسنت کھل رہی ہے بہار
آؤ یمنہ بیٹھ مورے انگنا نیک شگون بچار لال ملن کے
شگن بچارو دونگی گلے کو ہار ہے رت آئی بسنت کھل رہی بہار[۸۴]

حکیم سید لال میاں خانجی میاں

حکیم سید لال میاں پالن پور کے مشہور شعراء حضرات میں سے ایک ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کہیں ۱۸۵۱ء تو کہیں ۵۶-۱۸۵۵ء بتایا گیا ہے۔ لیکن ان کے خاندان کے کچھ بزرگوں سے اور ان کے پوتوں اور پرپوتوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حکیم صاحب نے ۸۵ سال کی عمر پائی تھی اور وہ ۱۹۳۶ء میں فوت ہوئے۔ اس حساب سے ان کی سالِ پیدائش ۱۸۵۱ء ثابت ہوتی ہے۔ جو معتبر معلوم ہوتی ہے۔ حکیم لال میاں سید کے والدِ بزرگوار کا نام خانجی میاں تھا۔ اور والدہ کا نام ماحسا بی بی تھا۔ وہ ڈھبوئی کے یدولاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ سید صاحب پالن پور کے نواب ہز ہائنیس شیر محمد خانجی کے دربار سے منسلک تھے۔ اور نواب صاحب

کے دربار میں انہیں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ وہ ادب کے ساتھ ساتھ حکمت بھی کرتے تھے۔ اور ایک مشاق حکیم مانے جاتے تھے۔ وہ انتہائی مذہبی غور وفکر کرنے والے صوفی منش انسان تھے۔ اسی لیے اس زمانے کے پالن پور کے مشہور صوفی مرشد بابا سے ان کے خاص مراسم تھے۔ مرشد بابا بھی لال میاں صاحب سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کا مقبرہ پالن پور کے میراں دروازے کے باہر بنا ہوا ہے۔ اب لوگ ہر سال یہاں عرس مناتے ہیں۔ اپنے استاد محترم سے بہت عقیدت تھی۔ اس بات کا اظہار ان کی غزل کے ایک مقطع سے ہوتا ہے۔

بہر اصلاح غزل خدمت استاد میں چل
لال کیا خوب تخلص بھی ہے گلشن ان کا

......

لال کیا خوف ہے استاد ہے تیرا گلشن
نکتہ چیں لاکھ سخن ور ہوں جو دشمن بن کے

سید لال میاں نے کئی غزلیں داغ دہلوی اور بہادر شاہ ظفر کی غزلوں کی زمینوں میں بھی اپنے اشعار کہے ہیں۔ اور ان کی بحروں اور ردیف قافیہ کا استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر

کوئی کیسی ہی کرے تدبیر کچھ ہوتا نہیں
کچھ بھی انسان کو مقدر کے سوا ملتا نہیں

......

بادل کی گرج سے ہیں کہیں رقص کناں مور
کیا خوش نما برسات کے قطرے ہیں گھر سے

......

جائے قیام کوچۂ جاناں میں پائیں ہم
بھولے سے بھی نہ جانب فردوس جائیں ہم

غزلوں کے علاوہ لال محمد نے حمد، نعت شریف، قصیدہ بھی لکھے ہیں۔ انگریز حکومت نے ضلع ڈھیسا نواب صاحب کو واپس دے دیا تھا۔ تب حکومت نے بہت بڑا جشن منایا تھا۔ اس تاریخی واقعہ کا اظہار لال میاں صاحب نے اپنے قطع میں اس طرح کیا ہے۔

حق نے جب طالع محمد کو بندھایا سہرہ
ہوکے خوش حوروں نے فردوس میں گایا سہرہ
دھوم ہے صلے علیٰ صلے علیٰ کی ہر سو
جب کہ دولھا کو عزیزوں نے بندھایا سہرہ
اک جھلک چاند سی اے لال نظر آنے لگی
رخ انور سے جو نوشہ نے ہٹایا سہرہ

لال میاں کے فرزند عابد میاں اس زمانے کے مشہور فوٹوگرافر تھے۔ یہ وہی لال میاں ہیں جن کے بیٹے علی میاں کے صاحبزادے موٹا میاں جو اوجس پالن پوری کے نام سے مشہور ہوئے اور جنھوں نے گجراتی غزل گو شعراء میں اپنا مقام بنایا۔ سید لال میاں کا مجموعۂ کلام کلیات لال کے نام سے شائع ہوا۔ چند غزلوں کے اشعار ملاحظہ ہوں۔ ۸۵؎

نمونۂ کلام

یوں تو آساں ہے بہت دل کا لگانا جاناں
سخت مشکل ہے مگر اس کو نبھانا جاناں
جلوہ اپنے رخ زیبا کا دکھانا جاناں
مثلِ موسیٰ مجھے دیوانہ بنانا جاناں
تیرے عاشق کا نہیں اور ٹھکانہ جاناں
توہی اپنا مجھے دیوانہ بنانا جاناں
کشتۂ چشم ادا ہوں یہ وصیت ہے مری
گل نرگس مری تربت پہ چڑھانا جاناں

لال سے تیری طرح ترک محبت کیوں ہو
قہر و آفت ہے لگے دل کا چھڑانا جاناں
......
نہ یہ بت تعشق بتانے کے قابل
نہ ہی رازِ الفت چھپانے کے قابل
تصور ترا اس میں رہتا ہے ہر دم
میرا دل نہیں دُکھانے کے قابل
لحد میری ٹھکرا کے بولا وہ ظالم
نہیں حشر تک یہ اٹھانے کے قابل
جتائی تپش دل کی ان کو تو بولے
یہ شکوہ نہیں لب پہ لانے کے قابل
حسینانِ دنیا ہوئے بے وفا سب
نہیں کوئی اب دل لگانے کے قابل
عبث لال ہو منتظر اس صنم کے
کہاں ہے وہ تشریف لانے کے قابل ۸۶؎

مولانا گلشنؔ پالن پوری

سید رحمت اللہ ۱۸۴۴ء میں پالن پور میں پیدا ہوئے۔ وہ رحمت میاں کے نام سے مشہور تھے۔ اور گلشن تخلص کرتے تھے۔ مولانا رحمت اللہ کو اردو اور گجراتی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اردو ادب میں وہ گلشن کے نام سے مشہور ہوئے جبکہ گجراتی زبان میں انہیں رحمت میاں کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ پالن پور کے رؤسا اور امراء حضرات نے اپنی تحریروں میں انہیں شمس العلما کے خطاب سے نوازا ہے۔ ان کے تمام شاگرد اور عمائدین شہر انھیں مولانا کے نام سے پکارتے تھے۔

مولانا سید رحمت اللہ کے والد خوب میاں راجستھان مارواڑ کے راجہ تخت سنگھ جی کے دربار میں ملازم تھے۔ جودھ پور میں انھوں نے تقریباً ۱۰ سال تک ملازمت کی۔

جب مولانا کی عمر بہت چھوٹی تھی ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور پرورش ان کی دادی امّاں نے کی۔ مولانا کی بسم اللہ کے بعد ان کی دادی امّی نے انہیں قرآن شریف کی تعلیم کے لیے قاضی حسن علی کے مکتب بھیجا جہاں ان کی خاطرخواہ تعلیم نہ ہو سکی۔ جب ان کے والد کو یہ معلوم ہوا تو وہ نہایت غم زدہ ہوئے اور محمد صدیق نامی ایک مولوی صاحب کے پاس پڑھنے بھیج دیا۔ جہاں مولانا نے پندنامہ عطار اور ترتیب الصلوٰۃ وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد مولوی کرامت علی سے فارسی پڑھی۔ مولوی راحت علی آزاد منش انسان تھے۔ جنگلوں اور فطرت کی سیرگاہ انہیں بہت پسند تھی۔ اس لیے طالب علموں کی طرف وہ زیادہ دھیان نہیں دے سکتے تھے۔ ان کا مزاج بڑا ہی شوقیانہ اور سیر و تفریح کی طرف زیادہ مائل رہتا تھا۔ جب وہ مدرسہ چھوڑ کر جنگلات کی طرف نکل جاتے تو گلشن بھی ان کے ساتھ ساتھ سائے کی طرح رہتے اور اپنی پڑھائی جاری رکھتے۔ مولانا صاحب کو مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ لیکن اقتصادی حالت کمزور ہونے کی وجہ سے کتابیں خرید نہیں سکتے تھے۔ اور جہاں تہاں سے مانگ کر اپنا کام نکال لیتے تھے۔ ایک مرتبہ 'بہار دانش' کی ضرورت ہوئی تو وہ کہیں بھی دستیاب نہیں ہوئی۔ مولانا کو مجبوراً اپنا مدرسہ چھوڑنا پڑا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد مولانا نے عربی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں رہ کر مولانا نے عربی زبان پر مکمل عبور حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مولانا رحمت اللہ دانش کے استاد کرامت اللہ علوم قدیم مشرقیہ کے عالم کامل تھے۔ لیکن علم انشاء اور علوم جدید مغربیہ سے واقفیت بہت کم تھی۔ پھر بھی گلشن نے علوم جدید میں اقلیدس اور جغرافیہ میں کافی مہارت حاصل کی تھی۔ یہاں تک کے یونیورسٹی کے پروفیسر حضرات کی قطار میں شامل ہونے کی حیثیت رکھتے تھے۔ مولانا گلشن پالن پوری نے ۱۸۶۱ء میں پالن پور کے پالٹیکل ایجنٹ صاحب بہادر کی آفس میں بھی ملازمت کی۔ خداداد ذہنیت کے مالک ہونے کی وجہ سے ایک بہت بڑے مقدمے کا فیصلہ اس طرح لکھا کہ عدالت کے لوگ حیرت و استعجاب میں رہ گئے؟

عربی اور فارسی کی مکمل تعلیم حاسل کرنے کے بعد مولانا نے گجراتی زبان پر بھی

کافی عبور حاصل کیا۔ گجراتی ادب میں ان کا بڑا مقام ہے۔ وہ ایک کامل استاد بھی تھے۔ انھیں علم عروض میں اچھی خاصی مہارت تھی۔

نثر کے ساتھ ساتھ مولانا نے نظموں میں بھی اعلیٰ مقام پایا ہے۔ انھوں نے قصۂ اولیاء حضور زبیدۃ الملک میں شیر محمد خان بابی بہادر پر شعر کہے ہیں۔ جو مسدس کے انداز میں ہیں۔ یہ قصیدہ انہوں نے ۱۸۲۸ء میں تخلیق کیا تھا۔

۱۸۶۵ء میں ان کے استاد مولوی کرامت علی نے اس جہاں سے کوچ کیا۔ تب ان کی جگہ پر گلشن کا تعین کیا گیا۔ دنیوی کسی بھی لالچ کے بغیر انھوں نے اس عہدے کو قبول کیا۔ پھر مولانا محکمۂ تعلیم سے منسلک ہوئے اور جہاں انھوں نے زیادہ ترقی حاصل کی۔ وہ لڑکے اور لڑکیوں دونوں کی تعلیم کے حامی تھے۔ اور بچوں کو اور غریب طلباء کو اپنے گھر میں مفت تعلیم دیا کرتے تھے۔ مولانا نے اپنے علم کو لوگوں میں خوب پھیلایا اور ایک اچھے استاد کی عمدہ مثال قائم کی۔ ان کی شخصیت رنگا رنگ تھی۔ ان کا رہن سہن امراء اور رؤساء جیسا تھا۔ کیونکہ اٹھنا بیٹھنا اکثر رؤسا اور امراء حضرات میں تھا۔ جس کی وجہ سے وہ عمدہ لباس پہننے کے بڑے شوقین تھے۔ دوسرے مولویوں کی طرح وہ خشک مزاج نہیں تھے۔ بلکہ انہیں فنون لطیفہ سے بھی لگاؤ تھا خاص کر وہ موسیقی کے دلدادہ تھے اور اس میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ ان کی تخلیق کیے ہوئے سوز و نوحہ اور برج بھاشا میں کہی ہوئی ٹھمریاں آج تک پالن پور کے لوگوں کی زبان زد عام ہیں۔ آج بھی کئی محفلوں میں ان کے انداز میں گائی ہوئی یہ ٹھمریاں یا سوز نوحہ گائے جاتے ہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مولانا کو موسیقی میں بھی کامل عمل دخل تھا۔ اپنی وفات کے دن بھی انھوں نے اپنے ایک شاگرد شرف الدین کو قافیہ سے متعلق معلومات دی۔ ان کی صحت گر رہی تھی وہ سخت بیمار تھے باوجود اس کے انھوں نے اپنا فرض نبھایا اور اپنے شاگرد کو ردیف قافیہ کی معلومات دی۔ ۵/نومبر ۱۸۹۸ء سنیچر کے دن مولانا نے وفات پائی۔ مولوی غلام محمد تپش نے تاریخ مرگ کہی۔ ۸۷

نمونۂ کلام

چوں رحمت میاں عالم تامور
بہ پیوست یا رحمت داد گر
ملائک بگفتند اغفر لۂ ۱۳۱۶ھ

تصنیفات

(۱) رسالۂ فلسفہ حُجت
(۲) انتخاب نوادر البیان فی علم القرأۃ القرآن
(۳) تسلیل احزان
(۴) رسالۂ علم بدیعہ
(۵) براہین رحمت
(۶) مسلہان علم مناظرہ
(۷) رسالۂ علم العروض
(۸) رسالۂ علم الابدان فی ماہیات جسم الانسان
(۹) شہرستان انگلینڈ (گجراتی کا اردو میں ترجمہ)

ان کے علاوہ مولانا نے کئی اور تصانیف کی ہیں۔ لیکن ان کے مسودہ ادھر ادھر بکھرے ہونے کی وجہ سے کتابی شکل میں ان کی جلد نہ بن سکی۔

سید رحمت میاں گلشن کی ایک نظم جو آمین کے نام سے مشہور ہے۔ خاص کر جب بچوں کی بسم اللہ پڑھائی جاتی ہے یا شادی بیاہ کے موقع پر ہدیہ کی رسم ادا کی جاتی ہے تب بطور دعا کے یہ آمین آج بھی کئی خاندانوں میں پڑھی جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل یہ آمین لکھی جا رہی ہے۔ جس میں نعت اور دعا کے اشعار موجود ہیں۔ جو یہاں مختصر طور پر تحریر کی جاتی ہے۔ ۸۸؎

نمونۂ کلام

حمد خدائے اکبر، صلوٰۃ مصطفیٰؐ پر، کہہ دل سے اے برادر
آمین الٰہی آمین
وہ پاک ہے صمد ہے، بے شبہہ شک احد ہے، قیوم ہے ابد ہے
آمین الٰہی آمین
مالک ہے کل جہاں کا، رازق ہے انس و جاں کا، بخشدہ آشیاں کا
آمین الٰہی آمین
اولادِ مصطفیٰؐ پر، اصحاب باوفا پر، صلوٰۃ تو پڑھا کر
آمین الٰہی آمین
دن حق نے یہ دکھایا، ارمان اب بر آیا، ہر ایک زباں پر لایا
آمین الٰہی آمین
بچے نے پہنا سہرا، اُوگ اٹھا جس سے چہرہ، ہیں شاد سب احبّا
آمین الٰہی آمین
گلشن بنی ہے محفل، ہے باغ باغ ہر دل، رحمت ہے حق کی نازل
آمین الٰہی آمین
محفلِ موموناں ہیں، نور جہاں عیاں ہے، ہر شخص شادماں ہے
آمین الٰہی آمین
لڑکے کو رب عزت، کر علم اب عنایت، دے فہم و فراست
آمین الٰہی آمین
فرزند کی زیادہ، ہو عمر اے خجستہ، پورا ہو ہر ارادہ
آمین الٰہی آمین
اللہ رکھے سلامت، بچے کو دے ہدایت، حاصل کرے سعادت
آمین الٰہی آمین

یارب حق احمد، از بہر آل امجد، فرزند کو کر ارشد
آمین الٰہی آمین
اے باوفا دعا گو، اب دل سے تم دعا دو، اے بچو! تم بھی کہہ دو
آمین الٰہی آمین ۸۹؎

......

یہ عشرت و عیش و کامرانی کب تک
عشرت بھی ہوئی نوجوانی کب تک
ہو یہ بھی اگر قیام دولت ہے محال
دولت بھی ہوئی تو زندگانی کب تک

......

گو حسین عمل ہمارے دم سے نہ ہوا
غافل وہ کسی طرح کرم سے نہ ہوا
جو ہم نے طلب کیا وہ بخشا اس نے
جو اس نے کہا وہ ایک ہم سے نہ ہوا ۹۰؎

......

حضرت شعریؔ پالن پوری

حضرت سید اشرف علی نام تھا اور اچھا میاں ان کا عرف تھا۔ وہ شعریؔ تخلص کرتے تھے۔ پالن پور کے ہونے کی وجہ سے انہیں شعریؔ پالن پوری کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ان کی پیدائش ۱۸۴۷ء میں ریاست پالن پور شہر میں ہوئی تھی۔

انھوں نے بچپن ہی میں قرآن شریف کی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ کلام مجید کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم اپنے والد بزرگوار سید راجِ محمد جو راجو میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ حاصل کیا تھا۔ انہوں نے قرآن شریف کا ترجمہ اور تفسیر کی تعلیم مصری خان صاحب سے حاصل کی تھی۔ مصری خان جے پور راجستھان سے پالن پور آئے ہوئے

تھے اور یہیں بس گئے تھے۔ شعریؔ نے انگریزی، گجراتی کی تعلیم اس وقت کے رواج کے مطابق اسکول میں پائی۔ بچپن میں ہی ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ بڑے بھائی انگریزی لشکر میں نوکر تھے اور تمام گھر کی ذمہ داری ان کے سر تھی۔ وہ بھی اس فانی دنیا سے چل بسے۔ گھر کی مالی حالت انتہائی کمزور تھی۔ لہٰذا شعری نے پولیٹیکل ایجنٹ میں سِکیورِٹی گارڈ کی ملازمت اختیار کر لی۔ اور ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی جس کا انھیں بہت افسوس تھا۔ قسمت کی خوبی تھی کہ ایک مرتبہ کسی انگریز افسر نے انھیں دیکھا اور اس کی دوررس نظروں نے پہچان لیا کہ یہ کوئی بڑی شخصیت کا مالک بنے گا اور اس کی ایماء پر انھوں نے دوبارہ اپنی تعلیم جاری کی۔ یہ جس اسکول میں پڑھ رہے تھے وہیں ان کے استاد کی وفات کے بعد ان کو ملازمت مل گئی۔ مولانا رحمت میاں گلشن کے شاگرد تھے۔ اچھا میاں نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے اپنی ذاتی قابلیت کی بناء پر انگریزی زبان میں بھی دسترس حاصل کی۔ تعلیم مکمل ہو جانے سے انھوں نے سکندر خان صاحب کے یہاں ملازمت اختیار کی۔ یہاں اچھا میاں کو ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ دیوان نواب شیر محمد خان بہادر جو پالن پور ریاست کے نواب صاحب کے چچا تھے۔ انھوں نے دربار میں ایک قطب خانہ (لائبریری) بنایا تھا جس میں ہر قسم کے علوم کی کتابیں موجود تھیں۔ ان کے مطالعے سے اچھا میاں نے کافی افادہ حاصل کیا۔

اچھا میاں شعری نے صرف ادبی کتابوں پر عبور حاصل کیا بلکہ انھوں نے علمِ طب میں بھی اپنا مقام بنایا۔ یونانی طب میں انھوں نے اعلیٰ مقام پایا اور کافی شہرت پائی۔ سکندر خان کو علم طب میں خاص لگاؤ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی سرپرستی میں اچھا میاں نے اس علم پر بھی عبور حاصل کر لیا۔

اچھا میاں کی شخصیت پُر اثر تھی۔ لباس ہمیشہ سادگی سے پہنتے تھے نواب کے دربار سے منسلک ہونے کے باوجود انھوں نے کبھی نوابی ٹھاٹ اختیار نہیں کیے۔ وہ بڑے ہی بااخلاق اور صوفی قسم کے آدمی تھے۔ اپنا زیادہ تر وقت درس و تدریس اور مطالعہ کتب میں بتاتے۔ اگر چہ وہ تنہائی پسند تھے لیکن خوش مزاج اور مزاحیہ انداز کے

مالک بھی تھے۔ ان کے چہرے پر ایک خاص قسم کی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ عمر کے ساتھ ساتھ وہ عبادت گزار ہوتے گئے۔ اور انھوں نے ملازمت چھوڑ دی۔ علم تصوف اور مہدوی علم کے بہت بڑے عالم سید روشن میاں صاحب سے دوستانہ تعلقات ہونے کی وجہ سے زیادہ تر وقت ان کے ساتھ گزارتے اور یادِ خدا میں مشغول رہتے۔ 91

تصنیفات

مہدویا مذہب کا زیادہ تر اساسہ عربی اور فارسی زبان میں تھا۔ رفتہ رفتہ فارسی کا رواج کم ہوتا جا رہا تھا۔ فارسی یا اردو زبان مقامی لوگوں کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس لیے اچھا میاں شعری نے عوام آسانی سے ان کتب کا مطالعہ کر سکے اور اردو میں مہدویا خیالات کی کتابیں نظم و نثر میں تصنیف کی۔

نثری تخلیقات

(۱) شمش الیان

یہ مہدویا مسلک پر لکھی گئی ہے جس میں انھوں نے مہدوی مسلک کے اصولوں کو قرآن اور احادیث اور اسلامی فقہ کے زیر اثر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب ۹۱-۱۸۹۲ء میں لکھی گئی۔

(۲) غنچۂ مہدی فی اثبات مہدوی

اس کتاب میں انھوں نے حضرت سید محمد جونپوری سچے امام مہدی ہیں اس بات کو اسلامی پیشین گوئیوں اور اپنے عقیدے کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب بھی اردو نثر میں ۹۶-۱۹۹۵ء میں لکھی گئی ہے۔

(۳) سیارۂ معبود

حضرت امام مہدی موعود کی زندگی کے حالات پر مبنی یہ سب سے پہلی کتاب اردو زبان میں شائع ہوئی تھی جس کے کل ۱۴۴ صفحات ہیں۔

(۴) ضیاء العین

اس کتاب میں شعری نے مہدوی فرقے کی نماز کے طریقے بتائے ہیں۔ خاص

کر انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ دعا مخفی انداز سے مانگی جائے ہاتھ اٹھا کر نہیں کیونکہ یہ عجز و انکساری کا ایک طریقہ ہے۔ اس بات کو انھوں نے اپنی تحریر میں احادیث کی رو سے ثبوت کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۵) ترجمہ سنت الصالحین

یہ ایک فارسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جس میں بزرگان مہدوی کی حیات اور طرز زندگی بیان کی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس بات کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے ان کے اطوار پیغمبر اسلام صلی اللہ وسلم کی سنن کے مطابق ہیں۔

(٦) ترجمہ سراج الابشار

یہ عربی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ جس میں سید محمد جونپوری کو صحیح امام مہدی ثابت کیا گیا ہے۔

(۷) یازدہ سوالات

یہ فارسی کتاب کا ترجمہ ہے مہدوی عقائد پر پوچھے گئے سوالات گیارہ سوالات کے جوابات پر مبنی قلمی رسالہ ہے۔

منظومات

حضرت اچھا میاں شعری نے نثر کے علاوہ اردو شاعری میں بھی اپنا مقام بنایا ہے وہ شعرؔی اور اشرفؔ دونوں تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے مولانا رحمت میاں گلشن اور جناب مصری خان صاحب جیسے شعراء حضرات سے شعر لکھنے کی ترغیب پائی کبھی کبھی اپنا کلام گلشن صاحب کو بھی بتلاتے تھے۔ شعری نواب سکندر خان کے دربار سے منسلک تھے اور اس کا ایک بڑا فائدہ انہیں یہ بھی ہوا کہ دربار نے بڑے بڑے شعراء، ادیب، فلاسفر وغیرہ لوگوں کا مجمع لگا دیا تھا۔ مشاعرے اور عالموں کے اجتماع ہوا کرتے تھے۔ ان سب باتوں کا اثر شعری کے ذہن و قلب پر بھی ہوا اور وہ بھی شعر کہنے لگے۔ انھوں نے فارسی، اردو، کھڑی ہندی اور گجراتی زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ کھڑی ہندی میں تو انھوں نے دوہے رباعیاں وغیرہ خوب کہے۔ اردو اور گجراتی میں بھی ان کا اچھا

خاصہ کلام ہے۔ گجراتی میں جہاں خاص قسم کی نظم گروی بھی لکھی ہے۔

تصانیف کلام

(۱) مسدس مہدی علیہ السلام

حضرت سید محمد جونپوری کے کرشموں سے متعلق ایک مسدس لکھا۔ اس کی تخلیق ۸۴-۱۸۸۳ء، ہجری سن ۱۳۰۱ اس مسدس میں شعریؔ نے فرقے کے بانی سید محمد جونپوری کی زندگی کے حالات اور کرشمے بیان کیے ہیں۔

(۲) ترکیب بند

۱۳۰۲ھ، ۸۵-۱۳۸۴ء اس ترکیب بند میں امام مہدی کے کرشمات اور ان کی کوشش اور کاوش کا بیان کیا ہے۔

(۳) مسدس

شعری نے ایک اور مسدس امام مہدی علیہ السلام کی شان میں لکھی ہے۔ اس کی زبان بہت مسجع اور مرصع ہے۔ اس نظم میں انھوں نے امام مہدی کا سراپا بیان کیا ہے۔ 33 بندوں پر یہ نظم مشتمل ہے۔ اسی طرح انھوں نے دو اور مسدسِ امام مہدی کی تعریف میں لکھی ہیں۔

(۴) اس کے علاوہ شعری نے مرثیہ بھی کہے ہیں۔ ان مراثی میں حضرت مہدی معود سے متعلق بہترین نوحہ لکھے ہیں۔ امام مہدی کے دوسرے خلیفہ بندگی میاں سید پر بھی ۱۱۹ بند کے مرثیہ لکھے ہیں۔

قصائد

قصیدۂ حضرت بندگی میاں سید محمود سید ن جی ختم المرشدین کی شان میں لکھا ہے۔ اس قصیدے میں انھوں نے اپنے فن کو کمال کی حد تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ شعری نے اس قصیدے میں پہلے تین مصرعے اردو میں اور چوتھا مصرع فارسی میں کہا ہے۔ اس طرح انھوں نے قصیدے کے تمام بند کی ترکیب قائم رکھی ہے۔ ساتھ ہی ان تمام مصرعوں کے ذیل میں ایک ایک دوہا یا گجراتی جسے سورتھا کہتے ہیں، لکھا ہے۔

اسی طرح آخر میں انھوں نے رباعیات کے طرز پر اپنا کلام کہا ہے۔ اس قصیدے میں بھی انھوں نے حضرت امام مہدی کی تعلیمات اور اصول بیان کیے ہیں۔

قصیدے حضرت بندگی میاں سید اشرف صاحب جالور قصیدے حضرت بندگی میاں مرتضٰی صاحب۔

اس طرح اچھا میاں شعری نے منظومات میں بھی رباعی، مثنوی، مسدس اور قصیدہ میں کافی ذخیرہ چھوڑا ہے اور اردو ادب کی خدمت انجام دی ہے۔ ۹۲؎

☆

مانگرول

شیخ حسین میاں، جہانگیر میاں، باپو میاں اپنے والد کے ساتھ

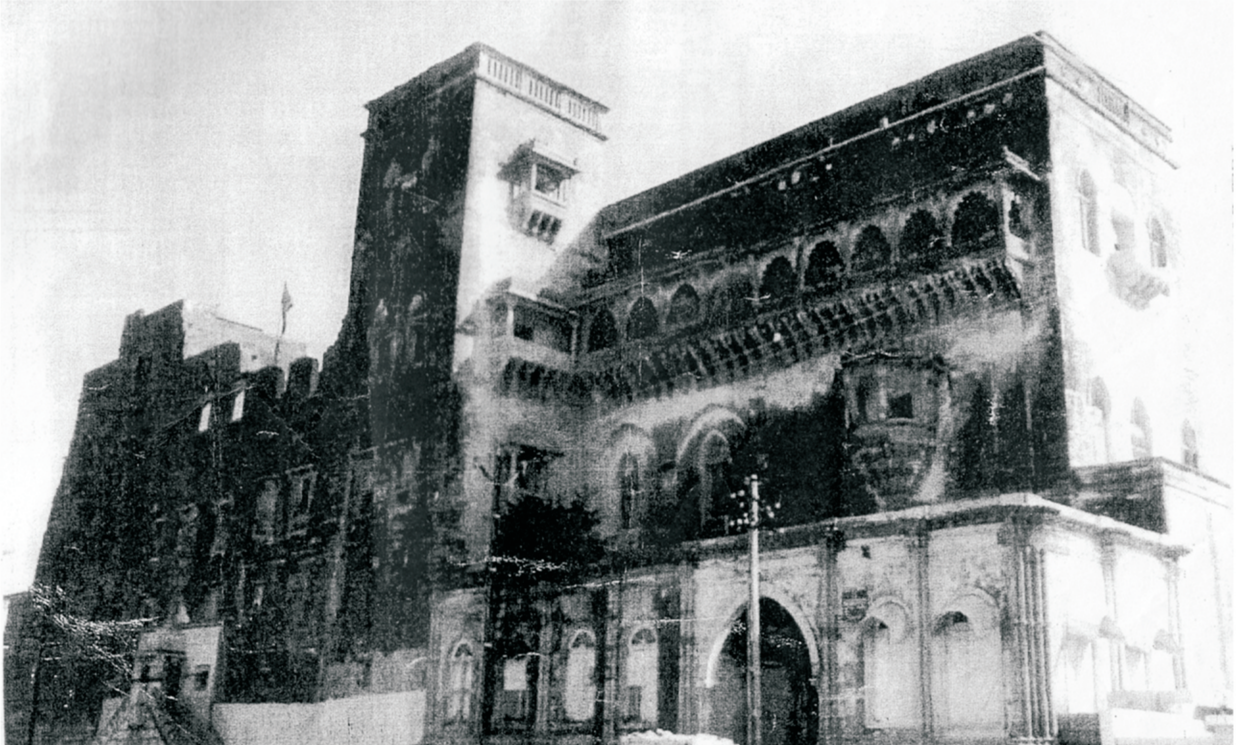

مانگرول کا قلعہ

مانگرول

مانگرول سے متعلق لکھنے سے پہلے ہم اس کی مختصر جغرافیائی اور تاریخی حیثیت پر ایک مختصر نظر ڈالتے ہیں۔

مانگرول کاٹھیاواڑ کا ایک مشہور تعلقہ ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے یہ ایک بہت خوبصورت مقام ہے۔ کیونکہ اس کے چاروں طرف سرسبز وادیاں ہیں اور ساتھ ہی ناریل کے خوبصورت درخت بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اس کی ہریالی و شادابی کی وجہ سے مغل شہنشاہ شاہ جہاں بھی متاثر ہوا تھا اور اس نے اسے اپنی زبان میں کشمیر کا متبادل کہا تھا۔ ۱۶۱-۱۵۰ء قبل مسیح میں ایک یونانی سیاح ٹولے میو مانگرول آیا تھا۔ جو مؤرخ بھی تھا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں مانگرول کو مونگوبس کہا ہے۔ ٹولے میو نے مانگرول کی دل کھول کر تعریف لکھی ہے۔ [۹۳]

مانگرول کی تاریخ میں بھی کئی اتار چڑھاؤ آئے اور اس پر آنے والے حکمرانوں نے مانگرول کو کسی نہ کسی طرح سجانے کی کوشش کی۔ باوجود دست درازی دنیا کے مانگرول کا ماضی مستقبل اور حال آج تک تابناک ہے اور اب بھی وہ ایک مثالی شہر مانا جاتا ہے۔ [۹۴]

تقسیم ہند کے بعد سوراشٹر کئی چھوٹی چھوٹی ڈسٹرکٹ میں بٹ گیا۔ اس لیے مانگرول بھی جونا گڑھ کا ایک تعلقہ بنا۔ اس تعلقہ میں تقریباً ۶۰ گاؤں شامل کیے گئے۔ آبادی کے لحاظ سے مانگرول میں ہندو مسلم برابری کا درجہ رکھتے ہیں۔ ۵۰ فیصد مسلمان ہیں تو دوسرے ۵۰ فیصد میں ہندو قوم شامل ہیں۔ ہندو قوموں میں آہر، کریڈیا، راجپوت، کھولی، کنسارا (ظروف گر-برتن بنانے والے)، کھڈایتا، کھائی۔ کھاروا، گولا رانا، تنبولی، درجی، دھوبی، ناگر، باروٹ، بھوئی، مہرس، سوتھار، رباری، برہمن، لوہار، شری مالی، ونیک، بُن کر، لویانہ، ربمانندی، سادھو، سلاٹ، ہریجن، واگھیر، ویشنو، جین وغیرہ قومیں بستی ہیں۔ [۹۵] اور

مسلمانوں میں شیخ، عرب، سید، چشتی، میمن، قاضی، میر، ترک، گھانچی، مٹوا وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں مچھیروں کی بھی قوم آباد ہے۔ سندھی، سنگوا، وہرا، مانگرول میں ۸۰ فیصد پچھڑی ہوئی قومیں آباد ہیں۔ جو زیادہ تر زراعت پر دار و مدار رکھتے ہیں۔ مانگرول اپنی قدرتی ہریالی اور خوبصورتی کی وجہ سے سوراشٹر کا کاشمیر مانا جاتا ہے۔ ۹۶

مانگرول بھی جوناگڑھ کی طرح کاٹھیاواڑ سوراشٹر میں اپنا مقام رکھتا ہے۔ یہ بھی گجرات کے مشہور ضلعوں میں سے ایک ہے۔ کسی زمانے میں مانگرول کی بندرگاہ بھی بڑی شہرت رکھتی تھی۔ جب مسلمانوں نے گجرات فتح کیا تو مانگرول بھی ان کی حکومت میں شامل ہوگیا۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں یہاں صدر بیدار عزیزالدین آرام شاہ ہوا کرتا تھا۔ یہ بڑا ہی زیرک اور بہادر صوبیدار تھا۔ اس نے ۱۳۷۳ء میں یہاں ایک جامع مسجد تعمیر کروائی تھی۔ اب تک یہ مسجد اپنی شان و شوکت کے ساتھ مانگرول میں موجود ہے۔ صوفی سید سکندر ترمذی اور مشہور صوفی مخدوم جہانیان جہاں گشت کی مزارات مانگرول میں موجود ہے۔ ۹۷ اس طرح دو بڑے صوفیوں کی آرام گاہ کا بھی ہونا مانگرول کا وصف ہے۔ (ناچیز نے بذات خود ان مزارات کی زیارت کی ہے۔) ۹۸

مسلمانوں سے پہلے مانگرول مراٹھا پیشوا کے قبضے میں تھا۔ ۱۷۴۸ء میں شہاب الدین اور فخرالدین قاضی نامی دو مسلم فوجی افسروں نے مراٹھوں کو نکال باہر کیا تھا۔ اس طرح دوبارہ یہاں مسلم حکومت کا دور شروع ہوا۔ مانگرول سے متعلق ایک قصّہ مشہور ہے کہ مراٹھا سردار سال میں ایک بار پوجا کے لیے مانگرول میں کامناتھ مندر پر جایا کرتا تھا۔ شہاب الدین اور فخرالدین دونوں مراٹھا لشکر میں مسلم افسر تھے۔ کہتے ہیں اس وقت شہر پناہ کے دروازے کے قریب ایک صوفی بابا رہتے تھے۔ ایک بار انھوں نے ایک بڑا کیل لے کر زمین میں دفن کیا اور کہا کہ آج میں نے شیخ کی میخ گاڑ دی ۹۹ اور مراٹھا کی نکال پھینکی کچھ عرصے بعد جب مراٹھا سردار شہر میں کامناتھ کے مندر پر گیا تو مسلم افسروں نے شہر کے دروازے بند کردیے جب مراٹھا سردار واپس لوٹا تو اس کی مسلمانوں کے ساتھ جنگ ہوئی۔ جس میں مراٹھا سردار مارا گیا شہاب الدین اور

فخرالدین بھی شہید ہوئے ان کے بعد فخرالدین کے بیٹے شیخ میاں کو گدی پر بٹھا دیا گیا اور انھوں نے اپنی خود مختار حکومت کا اعلان کر دیا۔ ۱۷۶۴ء میں جوناگڑھ کے نواب مہابت خان نے بھی مانگرول پر دھاوا بول دیا۔ لیکن انھیں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ نواب بدرالدین بہت قدآور شخص تھے۔ انھوں نے ایک بار جوناگڑھ کے ایک سرحدی مقام ونتھلی پر حملہ کیا اور اسے اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ نواب بدرالدین کی شادی سومناتھ پٹن کے قاضی خاندان میں ہوئی تھی۔ شیخ محمد بن قاضی جو بدرالدین کے سسر تھے بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ وہ ایک اچھے مثنوی نگار شاعر مانے جاتے ہیں۔ ان کی مثنویوں میں مانگرولی شاہ کا قصہ کالی گوری وغیرہ مشہور مثنویاں ہیں۔ ۱۰۰

شیخ بدرالدین نواب کے بعد ان کے فرزند باپو میاں مانگرول کے جانشین ہوئے اور ۱۸۷۵ء کے آس پاس نواب حسین میاں نے مانگرول کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ حسین میاں صاحب نے اپنے عہد میں علوم و فنون، ادیب و شاعری وغیرہ کی بڑی سرپرستی کی۔ خود بھی فنون لطیفہ میں بڑا ادراک رکھتے تھے۔ علم موسیقی میں انھیں کافی مہارت تھی۔ بڑے بڑے فنکار ان کے سامنے تھرّا جاتے تھے۔ ساز طبلہ میں انھیں اس قدر مہارت تھی کہ چار الگ الگ تال دونوں پاؤں اور دونوں ہاتھوں سے دیتے تھے۔ لیکن ذرا بھی غلطی نہ ہوتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سورت کی مشہور گلوکار طوائف عیدن بائی نے انھیں کی سرپرستی میں علم موسیقی میں کمال حاصل کیا تھا۔ شاعروں کی سرپرستی میں بھی نواب موصوف نے اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ گرچہ مانگرول جوناگڑھ کے مقابل ایک چھوٹی ریاست تھی مگر وہاں اہل کمال کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ داغ دہلوی، جلالؔ لکھنوی، مشتاقؔ رامپوری وغیرہ نے مانگرول کو اپنی صحبتوں سے نوازا ہے۔ مشتاقؔ رامپوری حسین میاں صاحب کی داد و دہش کی تعریف سن کر رام پور سے مانگرول آ گئے تھے۔ اور یہاں کافی داد وصول کی۔ نواب صاحب نے انھیں اپنے یہاں تنخواہ پر رکھ لیا تھا۔ ۱۰۱

مانگرول پر مدتوں مراٹھا اور راجپوت حکمران رہے۔ جب شیخ میاں اور جہانگیر

میاں کے ہاتھ عنان حکومت آئی تو کچھ ہندو لوگوں نے مانگرول کے بڑے مندر کو وہاں سے باہر لے جانے کی کوشش کی لیکن شیخ میاں نے ایسا نہیں ہونے دیا اور ساتھ ہی یہ وعدہ کیا جب تک مانگرول موجود ہے اس مندر کا تمام خرچ حکومت کی طرف سے ادا ہوگا۔ اسے یہاں سے ہٹانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس واقعہ سے مسلمان حکمرانوں کی وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔١٠٢

مانگرول پر اسلامی حکومت کی بنیاد کا تاریخی واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ مانگرول میں راجپوت اور مراٹھا دو الگ الگ حکومتیں ہوا کرتی تھیں اور وہ اپنے اپنے علاقے پر حکومت کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے ہ شیخ میاں جی اپنے والد بڑے بھائی اور کچھ سپاہیوں کے ساتھ جہاز پر سفر کر رہے تھے اور اچانک ایک حادثہ پیش آیا اور جہاز ٹوٹ گیا۔ اس میں کچھ یونانی بھی شامل تھے۔ جو جہازرانی کے مشاق تھے۔ ان کی مدد سے شیخ میاں جی اور ان کے ساتھی سادھوپور کے ساحل پر اترے۔

شیخ میاں جی کے اجداد مراٹھا حکومت میں فوج میں اصلاح دار تھے اور مراٹھا حاکموں کی ملازمت کرتے تھے۔ مراٹھا حاکم بہت ظالم تھے اور رعایا پر بہت سختی کرتے تھے۔ ایک بار ایک فقیر منش شخص سراج علی بابا اس طرف آ نکلے۔ اور وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھے بار بار گشت لگا رہے تھے۔ اور کوئی ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں وہ گھوڑے کو میخ گاڑ کر باندھ سکیں۔ میاں جی نے جب انھیں دیکھا تو احتراماً ان سے پوچھا کہ آپ کون ہیں اور کیوں اس طرح گھوڑے پر گشت لگا رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ مراٹھے مجھے دربار گڑھ میں گھوڑا باندھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ یہ سن کر شیخ میان انھیں اپنے گھر لے گئے وہ دربار گڑھ سے قریب تھا۔ سراج علی بابا نے میاں جی سے کہا مجھے پناہ دینے سے تمھاری ملازمت نہ چلی جائے؟ یہ سن کر بھی میاں جی انھیں اپنے گھر لے گئے۔ اور انھیں وہاں میخ گاڑ کر گھوڑے کو باندھنے کو کہا۔ بزرگ نے شیخ میاں کو دعائیں دیتے ہوئے کہا یہ تمھاری سات پشتوں تک گڑی رہے گی۔ اور تمھاری سات پشتیں یہاں حکمران رہیں گی۔١٠٣ وہاں ایک مسجد بنوائی گئی تھی

جو اب تک موجود ہے اور روائی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۰۴؎

اس واقعہ کے کچھ عرصے بعد وہاں انقلاب آیا رعایا مراٹھوں کے خلاف ہوگئی۔ شیخ میاں بھی (اس وقت ان کی عمر نو سال تھی) مراٹھوں کی مخالفت میں شامل تھے۔ انہیں کامیابی حاصل ہوئی اور وہاں کی عنان حکومت شیخ میاں کے ہاتھ آئی۔ شیخ میاں کے دو بھائی تھے۔ لیکن ان کے والد کی وفات کے بعد شیخ تخت نشین ہوگئے۔ ۱۸۷۹ء میں رعایا نے خود انھیں اپنا حاکم انتخاب کیا۔ وہ بہادر سپاہی اور ہشیار حکمران تھے۔ انھوں نے بڑی ہشیاری سے حکومت کی وہ ایک بہترین سیاستدان تھے ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے تخت نشین ہوئے اور ان کی وفات کے وقت ان کے بیٹے کی عمر تقریباً نو سال تھی ان کا نام نورالدین تھا۔ انھوں نے اپنی ماں کی مدد سے کم سنی کے زمانے میں عنان حکومت کو سنبھالا۔ اس کے بعد شیخ باوا میاں مانگرول کی حکومت کے سربراہ بنے۔ اس وقت ہندوستان میں انگریز حکمران اپنے قدم جما چکے تھے۔ انھوں نے تقریباً ۵۰ سال حکومت کا کاروبار سنبھالا۔ یہ لاولد ہونے کی وجہ سے ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی بڑے میاں تخت نشین ہوئے اور مانگرول کے حاکم بنے۔ بڑا میاں کی وفات کے بعد باپومیاں نے حکومت کا کاروبار سنھبالا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے حسین میاں تخت نشین ہوئے۔ اس وقت شیخ تارک چند میگھ جی بھائی حکومت کے انتظامات سنبھالتے تھے۔ حیسن میاں نے راج کمار کالج راجکوٹ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ یہاں زیادہ تر برٹش ٹیوٹر ہی ہوتے تھے۔ حسین میاں بہت سمجھدار اور فنون لطیفہ کے دلدادہ تھے۔ ان کے دربار میں آرٹ، میوزک، ڈانس اور شاعری وغیرہ فنون کو اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ دربار میں ہر وقت فنکاروں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ حسین میاں کے وزیر داخلہ چھوٹا لال شیوجی بھائی تھے۔ وہ مغلوں جیسا لباس پہنتے تھے۔ ان کی وجہ سے حکومت میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ۱۸۸۸ء میں مانگرول حکومت میں ایک اسکول قائم کیا۔ اور مسٹر ہنٹر نامی ایک مغربی شخص سے مدد لی۔ ۱۰۵؎

حسین میاں کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی جہانگیر میاں مانگرول پر

تخت نشین ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۰۷ء سے ۱۹۵۱ء تک حکومت کی۔ جہانگیر میاں برٹش انڈیا کمپنی میں کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کا تقرر احمدآباد میں ہوا تھا۔ اس لیے انھیں حکومت کا کافی تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب حکومت کا خزانہ خالی ہونے لگا تو انھوں نے اقتصادی اصلاحیں کی اور اس طرح اپنی مالی حالت کو سدھارنے اور سنوارنے میں وہ کامیاب رہے۔ انھوں نے مختلف افسروں کو ان کے محکمے بانٹ دیے۔ جیسے کہ محکمۂ ریونیو، محکمۂ بندرگاہ، زراعت، اور اشیاء کی درآمد اور برآمد جیسے محکمات مقرر کیے اور مانگرول کی پیداوار کو بندرگاہ سے باہر بھیجنے کا انتظام کیا۔ ساتھ ہی انھوں نے اسکولیں، ہائی اسکولیں، ہاسپٹل اور دیگر سہولیات اپنے خاص فنڈ سے اور ''شیخ جہانگیر میاں وقف اور ہاسپٹل'' بنایا۔ جس میں بڑھئی کا کام اور ٹیلرنگ کے کلاس موجود تھے۔ ۱۰۶

شیخ جہانگیر میاں انتہائی نیک حکمراں تھے۔ انھوں نے ہمیشہ رعایا کی بھلائی کا خیال رکھا۔ ان کی شادی بیگم آئشہ سے ہوئی تھی۔

درازئ عمر کی وجہ سے حکومت کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے لیے انھوں نے مختلف عہدوں پر تجربہ کار افسروں کا تعین کیا۔ مثلاً شاکرلال ہرجیون مہتا کو افسر اعلیٰ کا عہدہ دیا۔ بھیم جی بائم کو وزیر خزانہ بنایا۔ وجئے لال شیولال کو ڈسٹرکٹ منیجر بنایا۔ مول شنکر واسودیو کو محکمہ انجینئرنگ سپرد کیا۔ ہرشد رائے دیسائی کو پراؤیٹ ٹرانسفر آفیسر بنایا۔

انھوں نے سماجی فلاح کے بھی بہت سے کام کیے۔ مثلاً لائبریری قائم کرنا، اسکولیں بنانا، ہاسپٹل بنانا وغیرہ انھوں نے ایک اسٹیٹ پبلک لائبریری کی بنیاد رکھی۔ جس میں اردو، عربی، فارسی ادب کی بھی بہت ساری کتابیں تھیں۔ بارہ درجے تک کی اسکول، مڈل اسکول اور کارنیشن ہائی اسکول بھی قائم کیا۔ ۱۹۰۹ء میں شیخ بڑا میاں کے نام سے ایک ہاسپٹل قائم کیا اس کے پہلے ڈاکٹر کیشو لال وی ٹھکر تھے۔ ساتھ ہی انھوں نے راجکوٹ میں ایک مسافر خانہ بنوایا جہاں پر شیخ فیملی کے ورثہ راجکمار کالج میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور وہ مانگرول ہاؤس کے نام سے بھی مشہور تھا۔ ۱۰۷

ان کی بنائی ہوئی اور بھی بہت سی عمارتیں مشہور ہیں۔ مثلاً رانی باغ پیلیس امیر منزل داتار منزل، بشیر ہاؤس، خلیق ہاؤس، بدر منزل۔ ۱۰۸

مانگرول کے شعراء

نظام الحق عباسؔی

عباسؔی نے پچاس سال کی عمر میں ۱۵ ستمبر ۱۹۲۶ء کو مانگرول میں انتقال کیا۔ یہ احمد آباد کے رہنے والے تھے۔ لیکن زندگی کا ایک بڑا حصّہ مانگرول میں گزارا۔ یہاں ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اور دورِ ملازمت میں بھی برابر ملک و قوم کی خدمت میں لگے رہے۔ انھیں مانگرول اور اہل مانگرول سے دلی انسیت تھی۔ وہ مانگرول والوں کی بہبودی و بہتری کے دل سے خواہاں رہتے تھے۔ عباسی صاحب منکسرالمزاج اور نیک طبع انسان تھے۔ انجمن خدام کعبہ، خلافت اور ارتعداد کے سیکریٹری تھے اور ایسے قومی کاموں میں نہایت سرگرمی سے حصّہ لیتے اہل مانگرول میں قومی جذبہ انھیں کا پیدا کیا ہوا ہے۔

مرحوم کو علم و ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ اردو اور گجراتی کے اچھے مضمون نگار تھے۔ سینکڑوں کی تعداد میں آپ کے مضامین اخبارات میں چھپ چکے ہیں۔ ان کی طبیعت کا میلان شعر گوئی کی طرف تھا۔ شاعری میں وہ عبرت تخلص کرتے تھے۔ اور شعر خوب کہتے تھے۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے انجمن اسلام مانگرول کی بھی بنیاد رکھی۔ ۱۰۹

☆

جونا گڑھ

بہاؤالدین مکربا / مہابت مکربا

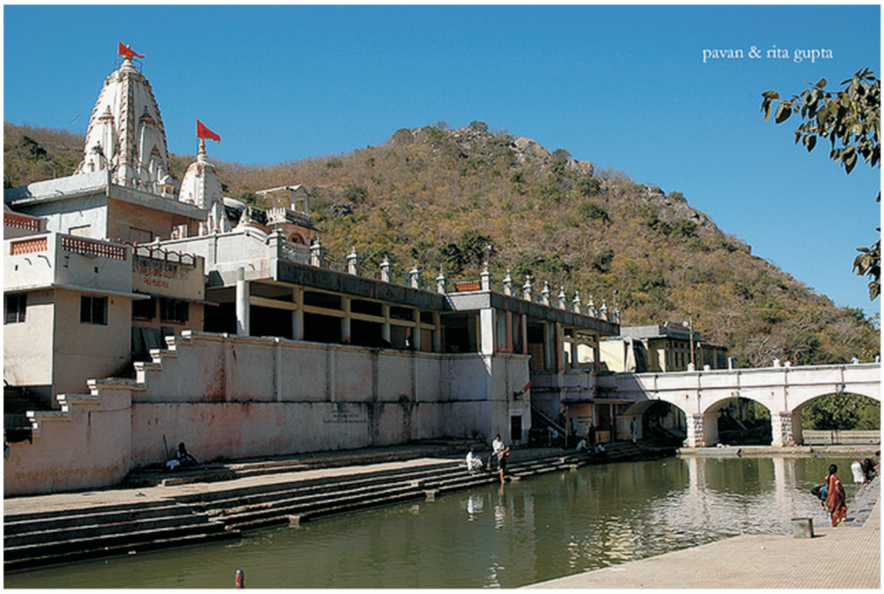

دامودر کنڈ

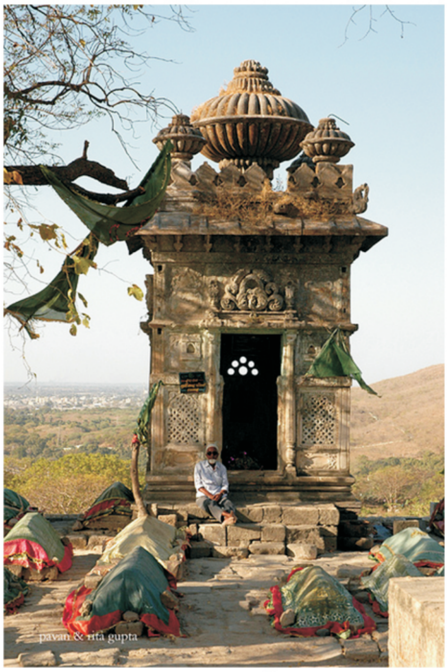

جامع مسجد

جامع مسجد اپرکوٹ

جوناگڑھ قلعہ

بہادر خانجی

بہادر خانجی

جونا گڑھ

جوناگڑھ عہد قدیم ہی سے گجرات کے سوراشٹر میں اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ یہ مشہور و معروف شہر گرنار وادی میں بسا ہوا ہے۔

جوناگڑھ ریاست گجرات کے ضلع جوناگڑھ کا مرکز ہے۔ اسی وجہ سے وہاں ضلع کی کئی کچہری (آفس) ہیں۔ یہاں تعلیمی نقطۂ نظر سے آرٹس، سائنس، کامرس، انگریزی کلچر، آیورویدا وغیرہ کی کئی کالجیں ہیں۔ انتظامیہ کی آفیسروں کا اوریئنشن(Oriention) کالج بھی یہاں موجود ہے۔ پولیس آفیسروں کا ایک ٹریننگ کالج بھی یہاں بنایا گیا ہے۔ ۱۱۰

شہر جوناگڑھ کی مشرق کی جانب مشہور مندر دامودر کُنڈ ہے۔ اور گرنار پہاڑ کی چوٹیوں کے سلسلہ کے مغرب کی جانب ایک بہت بڑا تالاب، سردار باغ نامی باغ ہے۔ شمال کی سمت کے مضافات میں کچھ چھوٹے چھوٹے گاؤں اور جنوب کی طرف پادرڈی پلاسوا وغیرہ دیہات آئے ہوئے ہیں۔ جوناگڑھ کا رقبہ ۳۷۷۰ ایکڑ اور ۳۲ گھیٹھا یعنی ۳۲ کلومیٹر اور چودھا ایکڑ ہے۔ اس کی لمبائی تقریباً ۲ میل اور عرض بھی تقریباً ۲ میل جتنا ہے۔ شہر کے چاروں طرف فصیل بنی ہوئی ہے۔ اور اس میں اوپر کوٹ کا قلعہ بنا ہوا ہے۔ زمانۂ قدیم میں جوناگڑھ کے کئی نام تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا پرانا نام کرن کنج تھا۔ اس پر سے کیررکوج بنا پھر کرن کوئیر اس طرح زمانۂ قدیم میں پرانی قدیم تاریخی کتبوں پر جوناگڑھ کے اور بھی کئی نام جانے جاسکتے ہیں۔ موریہ خاندان کے زمانے میں یہاں موریہ حکومت تھی۔ ۱۱۱

جوناگڑھ کے متعلق چینی سیاح ہوئے ین سانگ نے اپنے سفرنامے میں اس کا ذکر کیا ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ جب مسلمانوں نے پرانے جوناگڑھ کے قلعہ کو فتح کیا تو

اس کا نام جوناگڑھ رکھ دیا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ محمد تغلق کا نام جونا خان تھا اور شاید اسی کے نام پر اس شہر کا نام جوناگڑھ رکھا گیا۔ محمد تغلق کے ساتھ آئے ہوئے اس کے مورخ ضیاء الدین نے سلطان کی فوج کا مختلف جگہوں پر ٹھہرنے کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح لوگوں نے اس کی وجہ تسمیہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مغربی مؤرخ ریمن کے منطق ہے کہ دیوتا جوپیٹر کی بیوی کا نام جونا تھا اور شاید اسی پر سے اس شہر کا نام جونا گڑھ ہوا۔ جوناگڑھ کی تاریخ میں ایک یہ بات بھی مشہور ہے کہ جب سلطان محمود بیگڑہ نے جوناگڑھ کا قلعہ سر کیا تو اس کا نام بدل کر مصطفیٰ آباد رکھ دیا تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے بعد وہ دوبارہ جوناگڑھ کے نام سے پکارا جانے لگا اور حکومت نے اسے جوناگڑھ کے نام سے ہی تسلیم کیا۔ ۱۱۲

سلطان محمد محمود بیگڑا کے نام سے گجرات میں مشہور ہوا۔ گجراتی میں دو کو بے کہا جاتا ہے۔ ۱۱۳ قلعہ کو گڈھ سلطان محمود نے جوناگڑھ اور پاواگڑھ دونوں قلعوں کو فتح کر لیا تھا۔ اسی لیے انہیں محمود بیگڑا کہا جاتا تھا۔ ۱۱۳

گجرات میں جب سلطانوں کی حکومت تھی اس وقت جوناگڑھ میں سلطان نے شہر جوناگڑھ کو وسیع کرنے کا اعلان کیا۔ ۱۸۶۰ء میں نواب مہابت خان جی دوم کے وقت میں شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کو مد نظر رکھتے ہوئے شمال مغرب کی طرف کی قلع کی دیواروں کو گرا دیا گیا او شہر کو بڑا کرنے کے بعد قلعہ کی دیوار بنائی گئی اس طرح شہر جوناگڑھ کی دوبارہ تعمیر ہوئی۔ ۱۱۴

جوناگڑھ میں منڈلک خاندان نے طویل عرصے تک حکومت کی۔ اس خاندان کے آخری راجہ نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اسے خانجہان کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔ اسی عہد میں صوفی شاعر نرسینھ مہتا بھی ہو گزرا ہے۔ وہ جوناگڑھ میں بہت ہی معزز شخصیت کے مالک تھے۔ نہ جانے کیوں راجہ مانڈلک نے نرسینھ مہتا کو گرفتار کر لیا اور قید با مشقت کی سزا دی۔ بعد ازاں وہ قید سے رہا ہوکر جوناگڑھ سے مانگرول چلے گئے۔ نرسینھ مہتا گجرات کے قدیم شعراء میں سے ایک ہیں۔ ان کی نظمیں اصلاحی اور عبادت کی طرف

راغب کرنے والی ہیں۔ اپنی نظموں میں انھوں نے اخلاق کا درس دیا، انھوں نے کہا کہ سچا انسان وہ ہے جو کسی کی برائی نہیں کرتا۔ اور اپنی زندگی انسانیت کی خدمت میں گزار دیتا ہے جو دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھے اور احسان کرکے بھی نہ گنائے۔ نرسینھ مہتا کی شہرت ان کی زندگی میں سوراشٹر، گجرات، مارواڑ اور شمالی ہندوستان میں پھیل گئی تھی۔ میرا بائی، سورداس اور امیردھن وغیرہ نے ان کا لوہا مانا ہے۔ کبیر داس اور گرونانک جیسی عظیم شخصیتوں نے جوناگڑھ کی تعریف کی۔ ۱۵۸۰ء میں نرسینھ مہتا نے وفات پائی۔ نرسینھ مہتا وفات کے بعد پورے ہندوستان میں مشہور ہوئے۔ ۱۱۵

جوناگڑھ میں بورواڑ میں ایک مسجد ہے وہاں کے کتبے پر جو فارسی زبان میں کندہ ہے اس میں لکھا ہے کہ اس جگہ کھانٹ کے شہر کو زمین میں دفن کیا گیا۔ تب ابوالفتح نے یہاں جامع مسجد بنائی۔ اب یہاں تبلیغ دین ہوگا اور بہت ہی کم وقفہ میں یہاں کفر نابود ہو جائے گا۔ ۱۱٦

سلطان محمد نے ۱۹ سال تک جوناگڑھ پر حکومت کی ۱۵۱۱ء میں وہ احمدآباد میں فوت ہوگئے۔ سلطان کی وفات کے بعد ان کے شہزادے خلیل خان نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور مظفر کا خطاب اختیار کیا۔ اس طرح گجرات میں ایک کے بعد ایک سلطان حکومت کرتے رہے۔ ۱۵۰۳ء میں مغل بادشاہ اکبر نے گجرات پر چڑھائی کی اور گجرات فتح کر کے اسے مغل حکومت میں شامل کر لیا۔ یہاں کے سلطان مظفر سوم کو قید کر لیا۔ کچھ دنوں قید میں رہنے کے بعد سلطان قید خانے سے فرار ہو گیا۔ کئی روز گجرات کے مختلف صوبوں میں بھٹکتے رہنے کے بعد سلطان مظفر سوم کی بھی وفات ہوگئی۔ گجرات پر مغلوں کی حکومت اور مستحکم ہو گئی۔ اور یکے بعد دیگر شہنشاہ بدلتے تھے۔ حکومت دہلی سے گجرات میں شہزادوں کا تقرر ہوتا رہا اور انھوں نے گجرات میں اپنی عقل و سمجھ بوجھ سے کام لیا۔ جہانگیر نے اپنے بیٹے خرم کو احمدآباد میں گجرات کا منصرم بناکر بھیجا۔ کچھ دنوں بعد خرم نے بغاوت کی اور دہلی کا بادشاہ بن بیٹھا۔ اس کے بعد ۱٦٦۴ء میں سردار خان نامی ایک فوجدار نے جوناگڑھ پر قبضہ کیا۔ ۱۱۷ یہ اورنگ زیب عالم

گیر کا عہد حکومت تھا۔ اورنگ زیب نے ۱۷۰۷ء میں وفات پائی اورنگ زیب کی وفات کے بعد دہلی دربار میں امراء کی طاقت بڑھتی گئی اور ہندوستان میں مغل حکومت کمزور ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ صوبیدار اپنی اپنی ریاستوں میں آزاد ہوتے گئے۔ اور نئی نئی حکومتوں کی بنیادیں پڑتی رہی تب جوناگڑھ میں بھی اسی طرح یکے بعد دیگرے فوجداروں کی حکومتیں بدلتی رہیں۔

دیوان جی رنچھوڑ جی نامی ایک مؤرخ نے تاریخی سورٹھ میں لکھا ہے کہ ۱۷۲۲ء میں اسد علی خان جوناگڑ آیا اور اس نے یہاں کافی لوٹ مار کی۔ اس کے بعد سلابت محمد خان بابی نامی ایک شخص کو اپنا نائب مقیم کرکے وہ جوناگڑھ سے احمدآباد چلا گیا۔ بحرحال جوناگڑھ پر اسی طرح فوجدار اور صوبیدار بدلتے رہے۔ آخر میں ۱۷۴۸ء میں شیر خان بابی نے بہادر خان کا لقب اختیار کیا اور اپنی آزاد حکومت قائم کی۔ ۱۱۸

جوناگڑھ کا نواب خاندان

جوناگڑھ کے نواب بابی کہلاتے ہیں۔ یہ نسلاً افغانی ہیں۔ اس خاندان کے بزرگ عہد ہمایوں میں ہندوستان آئے تھے۔ افغانستان سے ہندوستان میں درۂ خیبر کے راستے سے آمد و رفت ہوا کرتی تھی۔ یہ ایک ایسا راستہ تھا جہاں سے کئی حملہ آور ہندوستان میں داخل ہوئے۔ جو ہندوستانی شہنشاہوں اور راجاؤں پر آئے دن حملہ کرتے رہتے تھے۔ اسی درّہ میں ہمیشہ کے لیے ایک فوج متعین رہتی تھی۔ درّہ خیبر گویا ہندوستان میں داخل ہونے والا ایک دروازہ تھا جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ دروازے کو باب کہا جاتا ہے۔ یہاں رہنے والے فوجی افسر کو باب کی نسبت سے بابی کہا جاتا تھا۔ بابی خاندان کی تین ریاستیں جوناگڑھ، رادھنپور اور بالاسینور قائم تھیں۔ ان ریاستوں کے علاوہ کاٹھیاواڑ میں بھی بابیوں کی کئی زمینداریاں قائم تھیں۔ ۱۱۹

۱۷۲۵ء میں سر بلند خان گجرات میں صوبیدار کے عہدے پر فائز ہوا۔ یہ بابی تھا۔ ۱۷۲۵ء سے ۱۷۳۰ء کے درمیان صفدر خان (محمد مظفر) بابی بن شیر خان بن بہادر خان بن عثمان خان بن عادل خان کا بیٹا جوانمرد خان جو پیٹلاد کا فوجدار تھا وفات

پا گیا۔ سربلند خان نے صفدر خان کے دوسرے بیٹے صلابت خان کو پرسا دیا اور جوانمرد خان مرحوم کے بیٹے کمال الدین خان کو جوانمرد کا خطاب اور منصب عطا کیا۔ احمدآباد کے سیاسی اتھل پتھل میں جوانمرد خان پیش پیش نظر آتا ہے۔ یہ ۱۷۴۴ء سے ۱۷۵۳ء تک گجرات کے صوبیدار کے عہدے پر بھی فائز رہا۔ جوانمرد خان نے مرہٹوں کا کئی بار مقابلہ کیا لیکن آخر کار جب مرہٹے ۱۷۵۳ء میں احمدآباد پر غالب آگئے تو جوانمرد خان نے ایک لاکھ روپیہ وظیفہ اور رادھن پور کی خودمختار ریاست پر اکتفا کیا اور سیاسی میدان سے ہٹ گیا اسی نواب سے ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۲۰

صفدر خان کا دوسرا بیٹا سلابت خان ویرم گاؤں کا متصدی تھا۔ اس نے کسی موقع پر جام نگر کے مہاراجہ کو مدد پہنچائی تھی۔ اس کے صلے میں اس کو سوراشٹر کے تین گاؤں دیے گئے تھے۔ سلابت خان نے ۱۷۳۰ء میں انتقال کیا تو اس کی جگہ بالا سینور کے نواب کے بیٹے محمد بہادر (شیر خان) کے نام منتقل کر دی گئی۔ شیر خان نے ۲۰ سال کی مدت میں یہاں اپنے قدم جمائے اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس طرح شیر خان جی بن سلابت خان جوناگڑھ کی ریاست کا پہلا نواب قرار پایا۔ ۱۷۵۸ء میں شیر خان کی وفات ہوئی۔ اس کا مزار جوناگڑھ میں چیتا خان کی مسجد میں ہے۔ شیر خان کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا مہابت خان شیر خان کے بعد جانشین ہوا۔ اس نے ۱۶ سال حکومت کی اور دو دسمبر ۱۷۷۵ء میں انتقال کیا۔ نواب مہابت خان کے بھائی سردار محمد خان کو بالا سینور کی جاگیر دی گئی تھی۔ اس نے ۱۷۶۰ء میں بالا سینور کو خود مختار ریاست بنا دیا۔ اس طرح سردار محمد خان بالاسینور کا پہلا نواب قرار پایا۔ ۱۲۱

نواب مہابت خان کا جانشین ابر محمد حامد ہوا۔ نواب حامد خان جی ۳۷ سال برسر اقتدار رہے۔ ۱۸۱۱ء میں انھوں نے وفات پائی۔ نواب موصوف صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ نذر نیاز بھی بہت اہتمام سے کیا کرتے تھے۔ انھوں نے ریاست کے معاملات میں بڑی دانشمندی کے ثبوت دیے ہیں۔ وہ انتہائی مخلص تھے اور ریاکاری سے دور تھے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے محمد بہادر ثانی جانشین ہوئے۔ ۲۹ سال حکومت

کرنے کے بعد 45 سال کی عمر میں محمد بہادر کا ۱۸۴۰ء میں انتقال ہوا۔ یہ بھی بڑے بہادر فیاض اور رحمدل نواب تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ ان کے فرزند اکبر حامد خان ۱۸۴۰ء میں جانشین ہوئے اور ۱۱ سال برسر اقتدار رہے۔ حامد خان کو موسیقی، شطرنج، پتنگ بازی، نشانہ بازی سے بہت شغف تھا۔ یہ علمی ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ کہتے ہیں نواب صاحب خوب حسین و جمیل تھے۔ حامد خان ثانی کے بعد ان کے فرزند محمد مہابت خان ثانی ۱۴ سال کی عمر میں جانشین ہوئے۔ انھوں نے ریاست میں تعلیم و تربیت کی طرف خاص طور سے توجہ دی۔ ۱۸۶۷ء میں ایک کتب خانہ بہادر خان جی لائبریری کے نام سے قائم کیا۔ ریاست گیزیٹ قسم کا ایک رسالہ دستورالعمل بھی جاری کیا تھا۔ ایک انگریزی ثانوی اسکول بھی قائم کیا تھا۔ انھوں نے ۴۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کے بعد ۱۸۸۲ء میں محمد بہادر سالیس ساتویں نواب ہوئے۔ محمد بہادر نے ۳۶ سال کی عمر میں ۱۸۹۲ء میں وفات پائی۔ ان کے دو بیٹے عادل خان اور رسول خان تھے۔ بعض وجوہات کی بنا پر چھوٹے بیٹے رسول خان کو نواب مقرر کیا گیا۔ اس عہد میں نواب کے ماموں بہاؤالدین وزیر تھے۔ بہاؤالدین بہت سیاستداں وزیر تھے۔ جوناگڑھ کا بہاؤالدین کالج ان کی یادگار ہے۔ انھوں نے ۵۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ۱۹۱۱ء میں ولی عہد مہابت خان نے جب حکومت کا کاروبار سنبھالا تب ان کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی۔ ۱۹۲۰ء میں انھیں دربار کے اختیارات دیے گئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد نواب صاحب پاکستان چلے گئے۔ وہاں ان کا انتقال ہو گیا۔ [۱۲۲]

جوناگڑھ کے شعراء

جوناگڑھ کے شعراء حضرات میں قاضی احمد میاں اختؔر جو اختر جوناگڑی کے نام سے معروف ہیں۔ ان کا نام سرفہرست آتا ہے۔ اخترؔ صاحب ۱۸۹۷ء میں جوناگڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جوناگڑھ میں حاصل کی۔ عربی اور فارسی زبانوں میں بھی کافی مہارت پیدا کی۔ اردو اور گجراتی دونوں زبانیں ان کے لیے مادری زبان کا درجہ رکھتی تھیں۔ [۱۲۳]

اختر جوناگڑھی کا خاندان سندھ سے آیا تھا۔ سندھ کچھ اور سوراشٹر کے مغربی علاقے

تہذیب و روایات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ تقسیم ہند سے پہلے یہ تمام علاقہ ایک ہی تھا۔ آمد و رفت کے ذرائع میں اونٹوں سے کام لیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تلاش معاش کی خاطر قاضی صاحب کا خاندان سندھ سے منتقل ہوکر کاٹھیاواڑ میں آیا اور ریاست جوناگڑھ میں مقیم ہوگیا۔ قاضی صاحب کے خاندان نے ہر طرح گجرات اور گجراتی تہذیب کو اپنا لیا۔ ان کی شادی بھی احمدآباد کے ایک اعلیٰ خاندان میں ہوئی اس لیے اختر جوناگڑھی کا احمدآباد بھی آنا جانا ہوتا رہتا تھا۔ قاضی صاحب خود بھی جاگیردار تھے اور اپنی علمی صلاحیتوں کی بنا پر جوناگڑھ کے نواب صاحب سے آپ کے بڑے تعلقات تھے۔ انھوں نے قاضی صاحب کو اپنی ریاست میں اعلیٰ عہدے پر معمور کیا تھا۔ ۲۰ ویں صدی کے نصف اول میں گجرات علم و ادب کا مرکز تھا۔ جوناگڑھ کے علاوہ مانگرول کتیانہ مانودار، بالوا، سچین، کھمبایت وغیرہ کی چھوٹی بڑی ریاستوں میں عربی اور اردو کے لیے بڑا خوشگوار ماحول تھا۔ جوناگڑھ اور مانگرول کی ادبی خدمات خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۲۴

اختر جوناگڑھی اور مولانا ابو ظفر ندوی کی زیر قیادت ۱۹۳۴ء میں شہاب نامی پرچہ جاری ہوا۔ یہ پرچہ پہلے راجکوٹ سے جاری ہوا اور چند مہینوں کے بعد جوناگڑھ سے جاری کیا گیا۔ شہاب تقریباً ۲ سال سے کچھ کم عرصے تک جاری رہا۔ اس رسالے کا معیار بہت بلند تھا۔ رسالہ خالص ادبی، علمی اور تحقیقی تھا۔ ۱۲۵

قاضی صاحب نے کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ آپ کے کئی مقالات، رسالہ، مصنف علی گڑھ میں بھی شائع ہوئی تھیں۔ یہ مقالات خصوصی طور پر توجہ طلب ہیں۔ احمدآباد کے حضرت حسینی پیر اور سید بڑا میاں صاحب کے خاندانوں سے چند بیاضیں حاصل کی گئیں ہیں اور چند نجی تحریروں اور دستاویزوں کی مدد سے قاضی صاحب کے عالمانہ اور محققانہ نظریات کا پتہ چلتا ہے۔ قاضی صاحب کی عمر تقریباً ۵۲ سال کی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد ناخوش گوار حالات سے تنگ آکر مجبوراً قاضی صاحب نے ۱۹۴۹ء میں کاٹھیاواڑ کے سے پاکستان کی طرف کوچ کی اور جتنا ممکن ہو سکا اپنی کتابوں کا ذخیرہ بھی وہ ساتھ لیتے گئے۔ پاکستان پہنچنے کے بعد رہائش اور روزگار کے مسائل نے انھیں خوب پریشان کیا۔

وہاں مولوی عبدالحق اور چند دیگر احباب نے قاضی صاحب کو بڑا سہارا دیا۔ ۱۹۵۵ء میں انھوں نے وفات پائی۔ انھوں نے پاکستان میں بمشکل تمام پانچ یا چھ سال کا عرصہ گزارا ہوگا۔ رہائش پاکستان کے دوران ان کے چند مضامین شائع ہوئے تھے۔

قاضی صاحب نہایت وسیع المطالعہ، محتاط مؤرخ اور بہت اچھے ادیب تھے۔ عربی، فارسی، اردو اور اسلامیات کے ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ شاعری میں وہ اختر تخلص کرتے تھے۔ 'سی پارۂ دل' ان کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔ جیسا کہ ہم مندرجۂ بالا بتا چکے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد قاضی صاحب جوناگڑ سے کراچی منتقل ہوگئے تھے۔ جہاں مولوی عبدالحق مرحوم نے ان کی ادبی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے انھیں انجمن ترقی اردو پاکستان کا نائب معتمد مقرر کیا تھا۔ 'رسالۂ اردو اور قومی زبان' اور کئی دوسرے رسائل میں ان کے علمی و ادبی مضامین برابر شائع ہوتے رہے۔ اسی انجمن کے دو نئے رسالے تاریخ اور سیاسیات کی ادارت بھی انھوں نے کی۔ جوناگڑھ کے قیام ہی کے دوران ان کی تحریریں 'معارف' اور 'مصنف' میں شائع ہوتی رہی تھیں۔ یکم دسمبر ۱۹۵۳ء کو انھوں نے انجمن کی ملازمت ترک کر دی۔ اور سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ اسلام کے صدر مقرر ہو کر حیدرآباد چلے گئے۔ ۲ اگست ۱۹۵۵ء کے درمیانی رات کو قاضی صاحب انتقال کر گئے۔ ۱۲۶

قاضی احمد جوناگڑھی کی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

(۱) حیات نظامی گنجوی (ان ناظر پریس لکھنؤ ۱۹۱۴ء)

(۲) اسلام کا اثر یوروپ پر (دائرہ ادبیہ لکھنؤ ۱۹۲۰ء)

(۳) زادِ گل (ادبی مقالات) (آگرہ اخبار پریس ۱۹۲۱ء)

(۴) مترجمات عربی اور انگریزی سے علمی مضامین کے ترجمہ (آگرہ اخبار ۱۹۲۸ء)

(۵) طبقات الامم (اردو ترجمہ) (معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء)

(۶) علم اور اسلام فرنچ پروفیسر ارنیسٹ اے کا ترجمہ) معارف پریس ۱۹۳۴ء)

(۷) لمیات اختر انگریزی شعرا کی نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ

(معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۸۰ء)

(۸) اسلامی کتب خانہ (اطالوی مصنف میں اولگاینڈ کے مضامین کا ترجمہ ۱۹۳۰ء)

(۹) سی پارۂ دل مجموعۂ غزل ۱۹۴۵ء

(۱۰) اسٹیڈیز ان اسلامک اورینٹل (اسلامی کلچر میں شائع شدہ مضامین)

(۱۱) اقبالیات کا تنقیدی جائزہ

(۱۲) تذکرۂ اہل دہلی۔ آثار الصنادید کے ایک باب کا ترجمہ ۱۲۷

نمونۂ کلام (شہرِ خموشاں-سونیٹ)

کیا ہی یہ شہرِ خموشاں دل شکن نظارہ ہے
کیسی عبرت خیز ہے یہ اس کی پرغم خامشی

......

حیرت و بیچارگی ہے ہر طرف چھائی ہوئی
دیکھ کر جس کو دل مضطر بھی پارہ پارہ ہے

......

خاک کے تودے پڑے ہیں جابجا کس شان سے
قبر ہے کوئی شکستہ اور کوئی اجڑی ہوئی

......

ہے پڑے سنگ لحد بھی قالب بے جان سے
چھوٹ کر قید مصیبت سے ہر اک آ کر یہاں
سو رہا ہے فکر عیش و جاودانی چھوڑ کر

......

ان کی تربت پر فقط سبزہ ہے تنہا سوگوار
صرف ایک شبنم ہے ان کے حال پر گریہ کناں
بے کسی چھائی ہوئی ہے خفتگان خاک پر
آہ یہ شہر خموشاں بھی ہے کیا اجڑا دیار ۱۲۸

☆

حواشی

ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૫ નર્મદા શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦ ۱

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۵ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

ગુજરાતની અસ્મિતા પૃ-૨૭ રજની વ્યાસ, અક્ષરા પ્રકાશન ۲

گجرات نی اَسمِتا صفحہ ۲۷، رجنی ویاس اکشرا پرکاشن

۳ تاریخ اولیاء گجرات صفحہ ۱۴۲ مولوی سید ابوظفر ندوی صاحب

ગુજરાતની અસ્મિતા પૃ-૨૭ રજની વ્યાસ, અક્ષરા પ્રકાશન

گجرات نی اَسمِتا صفحہ ۲۷، رجنی ویاس اکشرا پرکاشن

ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૧૨૧ નર્મદા શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦ ۴

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۱۲۱ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

۵ میدان سکندری صفحہ ۴۵۵ دیوان جی آتما رام موتی رام سورت ۲۰۰۶ء

۶ مرات احمدی جلد دوم حصّہ سوم صفحہ ۵۲۲ (گجراتی ترجمہ)

ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૧૨૮ નર્મદા શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦ ۷

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۱۲۸ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૧૨૮ નર્મદા શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦ ۸

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۱۲۸ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

۹ مرات سکندری جلد اول صفحہ ۱۰۶ دیوان آتما رام موتی رام سورت ۲۰۰۶ء

۱۰ مراتِ احمدی صفحہ ۱۹۷ حصّہ اول

ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૧૩૬ નર્મદા શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦ ۱۱

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۱۳۶ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

ચરોત્તર સર્વસંગ્રહ ભાગ - ૨ પૃ-૭૮૨ ۱۲

چروتر سرُوَ سنگرہ حصہ ۲ صفحہ ۷۸۲

ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૨૯ નર્મદા શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦ ۱۳

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۲۹ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

મુસુદિનો ઇતિહાસ - મરૂજીઝ ઝહબમાંથી ગુજરાતનો ઇતિહાસ ભાગ-૧-અબુઝફર નદવી પૃ-૨૦૬ ۱۴

مسودی نو اِتہاس - مروج الذہب ماتھی گجرات نو اِتہاس-۱ ابوظفر ندوی صفحہ ۲۰۶

ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૩૫ થી ૩૯ ખટવાલા મિરાતે અહેમદી ۱۵

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۳۵ سے ۳۹ کھٹوالا مرأت احمدی

ગુજરાતનો અરબી ઈતિહાસ પૃ-૩૧ ۱۶

گجرات نو عربی اِتہاس

ગુજરાતીની સલ્તનત પૃ-૩૧ શંભુ પ્રસાદ હરપ્રસાદ દેસાઇ-ગાયત્રી પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ ૧૯૯૧ ۱۷

گجرات نی سلطنت صفحہ ۳۱ شنبھو پرساد ہر پرساد دیسائی، گایتری پرنٹگ پریس ۱۹۹۱ء

ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૬૮ નર્મદા શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦ ۱۸

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ٦٨ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

પ્રો. કોમીસે રિયેટે પોતાનાં(અંગ્રેજી) ગુજરાતમાં ઈતિહાસમાં ગ્રીબ્સનાં તરજુમા ઉપરથી ઈબને બતુતા માટે આખું પ્રકરણ ۱۹

લખેલું છે. અહિનું વર્ણન ગુજરાત સાહિત્યનું ઈતિહાસ ખંડ ૧ પૃ-૧૮૪ પરથી લીધું છે.

ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૭૦ નર્મદા શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦ ۲۰

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۷۰ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૭૨ ۲۱

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۷۲

નુતન ગુજરાત તા. ૧૦-૧૨-૧૯૬૧ પૃ-૫ ۲۲

نوتن گجرات ۱۹٦۱-۱۲-۱۰ صفحہ ۵

ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૭૫ ۲۳

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۷۵

Asiatic Research Volume - 9 1809 ۲۴

ચરોત્તર સર્વસંગ્રહ ભાગ-૧ પૃ-૮૭૩ ۲۵

چروتر سرُوَ سنگرہ حصہ ۲ صفحہ ۸۷۳

۲٦ تاریخ گجرات صفحہ ۲۰۹ سے ۲۱۱ حصّہ اول ابوظفر ندوی

۲۷ تاریخ گجرات صفحہ ۱۹۹-۱۲۰ جلد اول سفرنامے کا خلاصہ

۲۸ تاریخ گجرات صفحہ ۱۹۹-۱۲۰ جلد اول سفرنامے کا خلاصہ

۲۹ البیرونی (ہندی) حصّہ دوم صفحہ ۱۳٦

ખંભાતનો ઈતિહાસ (૨ મી) પૃ-૩૬ ۳۰

کھمبایت نو اِتہاس صفحہ ۳٦

۳۱ تاریخ گجرات صفحہ ۲۹۸-۳۰۱ ابوظفر ندوی

માર્કોપોલો (રમણલાલ સોની) ۳۲

مارکوپولو (رنم لال سونی)

۳۳ ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૭૯ નર્મદા શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۷۹ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

۳۴ રવિવાર દીપોત્સવી અંક સ. ૨૦૦૫ પૃ-૧૬૯ یہ سارے حوالے (ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન) سے دیے گئے ہیں۔

۳۵ ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૮૮ શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۸۸ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

۳۶ ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૮૮ શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۸۸ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

۳۷ ગુજરાતની સલ્તનત પૃ-૧૪૨

گجرات نی سلطنت صفحہ ۱۴۲

۳۸ ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૮૮-૯૦ શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۸۸، ۹۰ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

۳۹ ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૮૮-૯૦ શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۸۸، ۹۰ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

۴۰ ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૧૦૦ નર્મદા શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۱۰۰ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

۴۱ ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૧૦૧ નર્મદા શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۱۰۱ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

۴۲ ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૧૦૨ નર્મદા શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۱۰۲ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

۴۳ ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૧૦૩ નર્મદા શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۱۰۳ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

۴۴ ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૧૦૪ નર્મદા શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۱۰۴ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

۴۵ ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૧૦૫ નર્મદા શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۱۰۵ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

۴۶ ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૧૦૭ નર્મદા શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۱۰۷ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

۴۷ ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૧૦૮ નર્મદા શંકર ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۱۰۸ نرمدا شنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

۴۸ ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૨૪૯ ત્રયમ્બક ભટ્ટ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ-૧૯૭૦

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۲۴۹ نرمداشنکر تریمبک بھٹ، چروتر پرنٹنگ پریس ۱۹۷۰ء

۴۹ اردو مرثیہ ڈاکٹر زو صفحہ ۷۰

۵۰ ایضاً

۵۱ ગુજરાતનું અર્વાચીન રેખાદર્શન ભાગ ૧લો અને ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૨૫૦

گجرات نو ارواچین ریکھا درشن حصہ ا اَنے کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۲۵۰

۵۲ આગા કૌસર વિશે જાગૃતિ દી.અં. સ. ૨૦૧૮ પૃ-૫૯ થી ૭૨, શ્રી જમિઅત પંડ્યાનો લેખ અને ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૨૫૦

۵۳ ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૨૫૧-૫૨

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۲۵۱

۵۴ سخنوران گجرات صفحہ ۱۶۶ سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان دہلی

۵۵ ایضاً صفحہ ۱۶۶

۵۶ ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૨૭૩ جامع الحکایات صفحہ ۲ گجرات کی تاریخ حصّہ اول ۳۰۱ ابوظفر ندوی اور

۵۷ مراتِ سکندری صفحہ 244، دیوان جی آتما رام موتی رام سورت ۲۰۰۶ء

۵۸ ખંભાતનું સાંસ્કૃતિક દર્શન પૃ-૨૭૩

کھمبایت نو سانسکرتِک درشن صفحہ ۲۷۳

۵۹ مراتِ سکندری (گجراتی) صفحہ ۴۵۵، دیوان جی آتمارام موتی رام سورت ۲۰۰۶ء

۶۰ મિરાતે અહમદીનાં લેખકનું જીવનચરિત્ર મિરાતે અહેમદી વોલ્યુમ-૨ ખંડ ૪ માં પ્રસ્તાવનામાં આપવામાં આવ્યું છે.

۶۱ سابرنامہ ۱۹۸۸ء پالن پور ایک تاریخی شہر، شکور احمد قریشی پالن پور صفحہ ۱۲۴

۶۲ ایضاً

۶۳ تاریخ پالن پور صفحہ ۵۷۹ جلد سوم، حصّہ دوم، سید گلاب میاں صاحب میر منشی ریاست پالن پور ۱۹۱۴ء

۶۴ ایضاً صفحہ ۵۷۹

۶۵ ایضاً صفحہ ۵۸۲

۶۶ سابرنامہ ۱۹۸۸ء پالن پور ایک تاریخی شہر، شکور احمد قریشی پالن پور صفحہ ۱۲۴، مشکور احمد قریشی پالن پور، ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر

۶۷ ایضاً صفحہ ۱۲۴

۶۸ تاریخ پالن پور صفحہ ۵۸۲ سید گلاب میاں صاحب ۱۹۱۴ء

۶۹ سابرنامہ ۱۹۸۸ء پالن پور ایک تاریخی شہر صفحہ ۱۲۶

۷۰ تاریخ پالن پور صفحہ ۵۸۴، جلد سوم حصّہ دوم سید گلاب میاں صاحب میر منشی ۱۹۱۴ء جنان پریس دہلی

۷۱ ایضاً صفحہ ۵۸۴

۷۲ سابرنامہ ۱۹۸۸ء پالن پور ایک تاریخی شہر، صفحہ ۱۲۸، مشکور احمد قریشی

۷۳ تاریخ پالن پور صفحہ ۵۸۸، ۵۸۹، جلد سوم حصّہ دوم سید گلاب میاں ریاست پالن پور ۱۹۱۴ء جنان پریس دہلی

۷۴ ایضاً صفحہ ۵۸۹

۷۵ ایضاً صفحہ ۵۹۰، ۵۹۱

۷۶ ایضاً صفحہ ۵۹۰، ۵۹۱

۷۷ ایضاً صفحہ ۵۹۲، ۵۹۳، جلد سوم حصّہ دوم سید گلاب میاں میر منشی ۱۹۱۴ء جنان پریس دہلی

۷۸ ایضاً صفحہ ۵۹۵

۷۹ ایضاً صفحہ ۵۹۶، ۵۹۷

۸۰ ایضاً صفحہ ۵۹۶، ۵۹۷

۸۱ سابرنامہ ۱۹۸۸ء پالن پور ایک تاریخی شہر صفحہ ۱۲۸، ۱۲۹

۸۲ પાલનપુર ધરતીના કવિરત્નો લેખાંકન (એક સંક્ષિપ્ત ઇતિહાસ) ૮૦ પ્રેરણા અને પ્રકાશન - ડૉ. સત્યવતીબેન ઝવેરી

સંશોધન-સંકલન-લેખન-મુસાફિર પાલનપુરી

پالن پور دھرتی نا کوی رتنو لیکھانکن (ایک سنکشِپت اِتہاس) ۸۰ پریرنا انے پرکاشن ڈاکٹر ستیہ وتی بہن زویری

سنشودھن-سنکلن-لیکھن مسافر پالن پوری

۸۳ مسافر پالن پوری ۲ جنوری ۱۹۹۹ سابرنامہ صفحہ ۲۱۰ سے ماخوذ

۸۴ غیر مطبوعہ بیاض مسافر پالن پوری

۸۵ પાલનપુર ધરતીના કવિરત્નો લેખાંકન-૧૩ (એક સંક્ષિપ્ત ઇતિહાસ) પ્રેરણા અને પ્રકાશન - ડૉ. સત્યવતીબેન ઝવેરી

સંશોધન-સંકલન-લેખન-મુસાફિર પાલનપુરી

پالن پور دھرتی نا کوی رتنو لیکھانکن ۱۳ (ایک سنکشِپت اِتہاس) پریرنا انے پرکاشن - ڈاکٹر ستیہ وتی بہن زویری

سنشودھن-سنکلن-لیکھن مسافر پالن پوری

۸۶ کلیات لال سید لال میاں خانجی میاں

۸۷ مولانا گلشن پالن پوری (حالات زندگی جناب منشی سید گلاب میاں صاحب میر منشی پالن پوری، ترجمہ نوراللہ میاں عنایت اللہ میاں پالن پور ۹۶-۵-۲۵

۸۸ غیر مطبوعہ بیاض مسافر پالن پوری

۸۹ حضرت مولانا سید رحمت میاں صاحب المتخلص بہ گلشن اہل پالن پور (نقل از بیاض حضرت غازی میاں صاحب اہل پالن پور (ناقل) سید نوراللہ میاں ۱۹۴۶ء

۹۰ غیر مطبوعہ بیاض مسافر پالن پوری

۹۱ حضرت شعری پالن پوری (حالات زندگی) سید نوراللہ میاں عنایت اللہ میاں جونا دائرہ چوک ۱۹۹۶ء

۹۲ (اردو مخطوطہ - حضرت سید نظام الدین نجو میاں صاحب تخلیق ۱۱ جمادی الآخر ۱۳۳۵، ۱۴ اپریل ۱۹۱۷ء

۹۳ મંગલપુરી માંગરોલ પૃ-૧ શંભુ પ્રસાદ હરપ્રસાદ દેસાઇ પ્રભાસ પ્રકાશન જુનાગઢ ૧૯૯૦

منگل پوری مانگرول صفحہ ا شنبھو پرساد ہر پرساد دیسائی پربھاس پرکاش جوناگڑھ ۱۹۹۰ء

۹۴ હિસ્ટ્રી ઓફ મિડિવલ ઇન્ડિયા

ہسٹری آف مڈیول انڈیا

۹۵ મંગલપુરી માંગરોલ પૃ-૧૮ શંભુ પ્રસાદ હરપ્રસાદ દેસાઇ પ્રભાસ પ્રકાશન જુનાગઢ ૧૯૯૩

منگل پوری مانگرول صفحہ ۱۸ شنبھو پرساد ہر پرساد دیسائی پربھاس پرکاش جوناگڑھ ۱۹۹۳ء

۹۶ હિસ્ટ્રી ઓફ મિડિવલ ઇન્ડિયા

ہسٹری آف مڈیول انڈیا

۹۷ سخنوران گجرات ۳۳۱ سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۹۸۱ء

۹۸ تاریخ اولیاء گجرات صفحہ ۱۴۱، ابوظفر ندوی صاحب ۱۹۹۳ء گجرات اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر

۹۹ મંગલપુરી માંગરોલ પૃ-૨૦-૨૧ શંભુ પ્રસાદ હરપ્રસાદ દેસાઇ પ્રભાસ પ્રકાશન જુનાગઢ ૧૯૯૩

منگل پوری مانگرول صفحہ ۲۰-۲۱ شنبھو پرساد ہر پرساد دیسائی پربھاس پرکاش جوناگڑھ ۱۹۹۳ء

۱۰۰ مضامین مدنی صفحہ ۱۲۶ ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی گجرات اردو اکادمی گاندھی نگر ۱۹۹۰ء

۱۰۱ سخنوران گجرات صفحہ ۳۳۲ سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۹۸۱ء

۱۰۲ سخنوران گجرات صفحہ ۳۳۲ سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۹۸۱ء

۱۰۳ મંગલપુરી માંગરોલ પૃ-૨૦-૨૧,૨૨,૨૩ શંભુ પ્રસાદ હરપ્રસાદ દેસાઇ પ્રભાસ પ્રકાશન જુનાગઢ ૧૯૯૩

منگل پوری مانگرول صفحہ ۲۰،۲۱،۲۲،۲۳ شنبھو پرساد ہر پرساد دیسائی پربھاس پرکاش جوناگڑھ ۱۹۹۳ء

۱۰۴ મંગલપુરી માંગરોલ પૃ-૨૩, ૨૪ શંભુ પ્રસાદ હરપ્રસાદ દેસાઇ પ્રભાસ પ્રકાશન જુનાગઢ ૧૯૯૩

منگل پوری مانگرول صفحہ ۲۳، ۲۴ شنبھو پرساد ہر پرساد دیسائی پربھاس پرکاش جوناگڑھ ۱۹۹۳ء

۱۰۵ سخنوران گجرات صفحہ ۳۳۳ ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۹۸۱ء

۱۰۶ મંગલપુરી માંગરોલ પૃ-૬૫, ૬૬, ૬૭, ૬૯ શંભુ પ્રસાદ હરપ્રસાદ દેસાઇ પ્રભાસ પ્રકાશન જુનાગઢ ૧૯૯૩

منگل پوری مانگرول صفحہ ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۹ شنبھو پرساد ہر پرساد دیسائی پربھاس پرکاش جوناگڑھ ۱۹۹۳ء

۱۰۷ મંગલપુરી માંગરોલ પૃ-૬૯ શંભુ પ્રસાદ હરપ્રસાદ દેસાઇ પ્રભાસ પ્રકાશન જુનાગઢ ૧૯૯૩

منگل پوری مانگرول صفحہ ۶۹ شنبھو پرساد ہر پرساد دیسائی پربھاس پرکاش جوناگڑھ ۱۹۹۳ء

۱۰۸ મંગલપુરી માંગરોલ પૃ-૬૯ શંભુ પ્રસાદ હરપ્રસાદ દેસાઇ પ્રભાસ પ્રકાશન જુનાગઢ ૧૯૯૩

منگل پوری مانگرول صفحہ ۶۹ شنبھو پرساد ہر پرساد دیسائی پربھاس پرکاش جوناگڑھ ۱۹۹۳ء

۱۰۹ رسالۂ زبان

۱۱۰ જુનાગઢ અને ગિરનાર પૃ-૧ શંભુ પ્રસાદ હરપ્રસાદ દેસાઇ પ્રવિણ પ્રકાશન ૧૯૭૵-૧૯૯૦

جوناگڑھ انے گرنار صفحہ ا شنبھو پرساد ہر پرساد دیسائی پروِن پرکاش ۱۹۷۵، ۱۹۹۰ء

۱۱۱ જુનાગઢ અને ગિરનાર પૃ-૧,૨ શંભુ પ્રસાદ હરપ્રસાદ દેસાઇ પ્રવિણ પ્રકાશન ૧૯૭૵-૧૯૯૦

جوناگڑھ انے گرنار صفحہ ا شنبھو پرساد ہر پرساد دیسائی پروِن پرکاش ۱۹۷۵، ۱۹۹۰ء

۱۲؎ જુનાગઢ અને ગિરનાર પૃ-૪૮,૪૯
جوناگڑھ انے گرنار صفحہ ۴۸، ۴۹

۱۳؎ જુનાગઢ અને ગિરનાર પૃ-૪૮,૪૯
جوناگڑھ انے گرنار صفحہ ۴۸، ۴۹

۱۴؎ જુનાગઢ અને ગિરનાર પૃ-૧૦૫
جوناگڑھ انے گرنار صفحہ ۱۰۵

۱۵؎ જુનાગઢ અને ગિરનાર પૃ-૯૫
جوناگڑھ انے گرنار صفحہ ۹۵

۱۶؎ જુનાગઢ અને ગિરનાર પૃ-૧૦૮
جوناگڑھ انے گرنار صفحہ ۱۰۸

۱۷؎ ગુજરાતની સલ્તનત પૃ-૧૦૮, ૧૦૯, ૧૧૦ શંભુ પ્રસાદ હરપ્રસાદ દેસાઇ ૧૯૯૧ ગુજરાત સાહિત્ય અકાદમી ગાયત્રી પ્રેસ
گجرات نی سلطنت صفحہ ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰ شنبھو پرساد ہر پرساد دیسائی ۱۹۹۱ء گجرات ساہتیہ اکادمی، گایتری پریس

۱۸؎ તારીખે સૌરઠ પૃ-૫૩૨
تاریخ سورٹھ صفحہ ۵۳۲

۱۹؎ سخنوران گجرات صفحہ ۳۲۹، سید ظہیرالدین مدنی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان ۱۹۸۱ء

۲۰؎ ایضاً ۳۲۹

۲۱؎ ایضاً ۳۲۹

۲۲؎ ایضاً ۳۳۰

۲۳؎ ولی گجراتی مقدمہ پروفیسر محی الدین بمبئی والا صفحہ ۶، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ۲۰۰۴ء گجرات ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر

۲۴؎ ایضاً صفحہ ۷

۲۵؎ ایضاً صفحہ ۷

۲۶؎ ایضاً صفحہ ۷

۲۷؎ ایضاً صفحہ ۸

۲۸؎ رسالۂ زبان (شہر خموشاں سونیٹ)

Gazetteers of Gujarat

Palanpur

1st Addition - 1975

- Printed in India by the Manager. Govt. Printing and Stationery, Palanpur.
- Published by the director, Govt.
- Printing, Stationery and Publications. Gujarat state Ahmedabad.

Bharuch

1st Addition - 1975

- Printed in India by the Manager. Govt. Printing and Stationery, Bharuch.
- Published by the director, Govt.
- Printing, Stationery and Publications. Gujarat state Ahmedabad.

باب ششم

(i) گجرات میں اردو نثر انیسویں صدی میں

(ii) گجرات میں فارسی ادب انیسویں صدی میں

(iii) گجرات میں ہندو ناگروں کی فارسی خدمات انیسویں صدی میں

باب ششم

(i) گجرات میں اردو نثر انیسویں صدی میں

گجرات میں اردو نثری ادب کو کوئی فروغ حاصل نہیں ہوا۔ ولیؔ تک کوئی نثری کارنامہ کافی تلاش و جستجو کے باوجود مہیا نہیں ہوا۔ عبدالولی عزلتؔ سورتی نے (۱۶۹۲ء / ۵۷۷اء) اپنے دیوان کا مختصر دیباچہ اردو میں لکھا تھا۔ اس کی لسانی اہمیت زیادہ ہے اس کے علاوہ منشی لطف اللہ فریدی سورتی (متولد ۱۸۰۲ء) کے دو اردو رسالے ''فوائد العجائب'' جو حکمت جرّاحی پر ہے یہ دراصل مسٹر کاکس کے انگریزی رسالے کا اردو ترجمہ ہے۔ لطف اللہ صاحب نے اس میں اپنی طرف سے مزید اضافے کیے ہیں۔ دوسرا رسالہ مرض ہیضہ کے بارے میں ہے۔ انیسویں صدی میں شاعر محمد منظور (۱۳۰۸ء - ۱۲۱۷ء) کا ایک نثری رسالہ ''گلدستۂ نشاط و سرور'' کی نشاندہی ہوسکی ہے۔ اس کے علاوہ سورت کے میر غلام بابا جن کا اپنے وقت کے عالموں میں شمار ہوتا تھا اور ان کے دربار سے بہت سے ادیب و شعرا حضرات منسلک تھے۔ اور مرزا غالبؔ کے خاص احبابوں میں سے تھے۔ انھوں نے امام غزالی کی ''احیاء العلوم'' کا اردو میں کسی صاحب سے ترجمہ کروایا تھا۔ جو آج تک دستیاب نہیں ہوا۔ اسی صدی کے نصف آخر میں اجیا صاحب عید روس نے ۱۸۸۹ء و تاریخ سورت تصنیف کی۔ اس کا مخطوطہ ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی کے کتب خانے میں ہے۔ سورت کے ایک جدید عالم اور شاعر مولانا نور محمد سورتی نے ۱۹۰۳ء میں ایک مذہبی رسالہ ''مسلم الثبوت فی نسخ القبوت'' تصنیف کیا۔

(ii) گجرات میں فارسی ادب انیسویں صدی میں

یہ صدی گجرات میں فارسی ادب کا دور زوال ہے۔ پھر بھی کچھ تصانیف دستیاب ہوئی ہیں۔ شیخ رضی الدین بخشو میاں (متوفی ۱۸۴۹ء - ۱۲۱۵ء) اپنے زمانے کے مشہور

مورخ تھے۔ انھوں نے دو تاریخی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ''حدیقۃ الہند'' تاریخ عالم اور تاریخ ہند پر مشتمل ہے۔ دوسری ''حدیقۂ احمدی'' اسی خاندان کے کسی صاحب کے پاس پائی جاتی ہیں۔ مگر مزید تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔ قاضی سید محمد نورالدین حسین فائق (۱۸۲۳ء - ۱۸۶۹ء) نے اردو شعراء کا تذکرہ فارسی میں ''مخزن الشعراء'' کے نام سے تصنیف کیا۔ ان کی دو مزید کتابیں ''تذکرۂ سادات شیرازیہ'' اور ''انشاء اسلام خانی'' دستیاب نہیں ہوسکیں۔

(iii) گجرات میں ہندو ناگروں کی فارسی خدمات انیسویں صدی میں

جیسے کہ پہلے عرض کر چکی ہوں انیسویں صدی گجرات میں فارسی زبان و ادب اپنی اہمیت کھو چکا تھا۔ کیونکہ اردو زبان ادبی شکل اختیار کر چکی تھی۔ بلکہ عوام کا بھی ذریعہ اظہار بن چکی تھی۔ لیکن فارسی اس وقت بھی درباری زبان تھی۔ گجرات کی ناگر قوم نے کائستھوں کی طرح جو دیگر صوبوں سے ہجرت کر کے گجرات میں آباد ہو چکے تھے ان کے زیر اثر فارسی سیکھی اور اس میں دسترس حاصل کی۔ نہ صرف یہ بلکہ بعض ناگر اپنی ڈائری فارسی میں لکھتے تھے۔ دراصل ان کا مقصد سرکاری ملازمت حاصل کرنا تھا اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ انیسویں صدی کے صاحب تصانیف دیوان رنچھوڑی نے ''تاریخ سورٹھ'' ''رقعاتِ گوناگوں'' اور ''جنگ نامہ ہولی'' تصنیف کی۔ سارا بھائی ناگر ''احوال گایک واڑ'' و ''مختصر تاریخ گجرات'' کے مصنف ہیں۔ گلاب رائے کا شمار عمدہ شاعروں میں ہوتا تھا۔ ان کے دو شعری مجموعے بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور مخطوطے کی شکل میں دستیاب ہیں۔ ان کے ''را نامہ'' میں ابتدا سے اختتام تک ہر شعر کے آخری لفظ کا آخری حرف ''ر'' ہے۔ دوسرا مجموعہ ''و نامہ'' بھی اسی طرز پر لکھا ہے۔ غرض یہ تمام تصانیف ناگر قوم میں فارسی زبان کی مقبولیت کی غماز ہیں اور گجرات میں فارسی ادب کے فروغ میں کوئی بھی محقق ان کی کارگزاریوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

☆

ماحصل

انیسویں صدی میں بھی اردو شاعری کی مملکت پر غزل نے حکمرانی کی ہے۔ اور امید کی جاسکتی ہے کہ تا قیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اس صدی میں بھی زیادہ تر شعراء نے بہ نسبت دیگر اصناف سخن بہ استثنا مثنوی، غزل کو ہی اپنا پیراٗ اظہار بنایا۔

وحدت اور قومی یکجہتی کو لوگوں کے دلوں پر معمور کیا۔ بلکہ اپنے زمانے کے سماجی تقاضوں کو بھی پورا کیا۔

بابائے غزل ولی گجراتی نے غزل کے ذریعہ نہ صرف لسانی،علاقائی سماجی تقاضوں کو بھی پورا کیا۔ولی کو وہی حیثیت و اہمیت حاصل ہے۔ جو انگریزی ادب کے چوسر کو۔ ولی گجراتی اپنے آپ میں ایک انجمن تھا اور ایک عہد ساز گار تھا۔ ولی نے خود اپنے بارے میں غلط نہیں کہا۔

ولی تجھ طبع کے گلشن میں جو کوئی سیر کرتے ہیں
وہ تحفہ لے کے جاتے ہیں تری گفتار ہر جانب

ولی کے شاگردوں وہمعصروں نے خاص طور سے شمال دکن گجرات میں غزلیہ شاعری کو فروغ دیا اس کے شاگردوں میں اشرفؔ، رضیؔ، ثناؔ، وغیرہ اور ہمعصروں میں صادقؔ، فراقؔ، احمدؔ، عزلتؔ قابل ذکر ہیں۔

انیسویں صدی میں رؤساو امراء اور دیگر مختلف ریاستوں میں آباد علمی خاندانوں کی سرپرستی و سرفرازی سے زبان وادب کو فروغ حاصل ہوا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ گجرات کے شعراء نے شمال کو اپنا استاد مان لیا تھا۔ ان شعراء میں صورت کے سیاحؔ، سجھوؔ، علویؔ، بھروچ کے فائقؔ، بڑودہ کے فداؔ، احمدآباد کے باقرؔ، سہلؔ، کمترؔ وغیرہ وغیرہ قابل تحسین ہیں۔ اس کے علاوہ گجرات کے چند علمی خاندانوں اور ان کی سرپرستی میں اردو کی ترویج و اشاعت میں کافی فروغ ہوا۔

گجرات کے لئے یہ بات بھی قابل ستائش ہے کہ اس نے گجراتی زبان و ادب کو متاثر ہی نہیں کیا۔ بلکہ گجراتی ادب کو غزل کا بے مثال تحفہ عنایت کیا۔جو گجراتی میں ہمیشہ مقبول رہی۔ اور آج مقبولیت کی معراج پر ہے۔

دیکھا جائے تو اس صدی میں شعراء کی دوسری نسل ظہور پذیر ہوئی۔ کیونکہ گجرات شعری فضا کے

لئے نہایت سازگار ثابت ہوا۔ اس عہد کی شاعری میں مشکل پسندی تقلیدی رویہ اور صوفیانہ روش کے باوجود شاعری کی تازگی، زبان وہ بیان کی شگفتگی مجروح نہیں ہوئی۔ بلکہ شعرو ادب کا انتہائی صاف ستھرا اور پاکیزہ ذوق ملتا ہے۔ جو قابل تحسین ہے۔ اس دور میں غالبؔ، داغؔ و آتش وغیرہ استاد شعراء کے تلامذہ کی آوازیں انقلاب زمانہ کے ساتھ ہم آہنگی کا دم بھرتی ہیں۔

گجرات میں مثنوی ادب کی تخلیقات اور اس کی مقبولیت اردو ادب کی شمع روشن رکھنے میں بہت مددگار ثابت ہوا۔ ۱۷۰۰ء سے ۱۸۵۰ء تک میں گجرات میں بے شمار مثنویاں پائی جاتی ہیں۔ اس صنف سخن میں گجرات و دکن کے شعراء بہ لحاظ موضوع و بیان کے ایک دوسرے سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس دور میں موضوع کے لحاظ سے مذہبی و اخلاقی مثنویاں زیادہ لکھی گئیں۔ عشقیہ مثنویوں میں قصۂ یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور مقامی مشہور ہستیوں کی داستانیں قلمبند کی گئی ہیں۔ انیسویں صدی کی ان مثنویوں میں روزمرّہ کی زبان کا زیادہ استعمال نظر آتا ہے۔ مگر تخیل کی بالیدگی و بلند فکری کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

●

کتابیات

نمبر شمار	اسم کتاب	مصنف / مؤلف / مرتب / مترجم	مطبع / سنِ اشاعت (مطبوعہ و غیر مطبوعہ)
(1)	اردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	اسرار کریمی پریس، الہ آباد 1985ء ناشر : بک ایمپوریم، پٹنہ
(2)	آبِ حیات	شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد	مطبع : کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی
(3)	کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید	طارق سعید	ایم اے آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، ایجوکیشنل بک ہاؤس 1991
(4)	تاریخ ادب اردو 1700 تک جلد اوّل	پروفیسر سیدہ جعفر - پروفیسر گیان چند جین	قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نئی دہلی
(5)	مشائخ احمد آباد - جلد اول	مولانا یوسف متالا خادم دارالعلوم	کتب خانہ انور شاہ 1993ء
(6)	مضامین مدنی	ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی	گجرات اردو اکادمی 1990ء
(7)	سخنورانِ گجرات	ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی	قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نئی دہلی
(8)	اردو شاعری کا فنّی ارتقاء	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	ایجوکیشنل بک ہاؤس
(9)	گجری مثنویاں	ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی	گجرات اردو اکادمی 1990
(10)	کائنات فخر	سید فخرالدین فخر قادری	پروفیسر محی الدین بمبئی والا 1999ء
(11)	ولی گجراتی	قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی	مرتب : پروفیسر محی الدین بمبئی والا 2004ء
(12)	متاعِ کلیم	کلیم احمد آبادی	یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ٹھکر دوار نوروزی اسٹریٹ بمبئی۔
(13)	تاریخ ادب اردو (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
(14)	اردو تنقید کا ارتقاء	ڈاکٹر عبادت بریلوی	عامر آفسیٹ پرنٹرز دہلی - ایجوکیشنل بک ہاؤس 1992ء
(15)	مرأۃ سکندری	دیوان جی آتما رام موتی رام	2006 - سورت (سرخیز روضہ)

(16)	حقیقت السورت - گلدستۂ علماء سورت	شیخ رضی الدین احمد بخش عرف بخشو میاں مترجم : محبوب حیسن احمد حسین عباسی	پنڈت وردراج (مہاماتر گجرات اردو اکادمی گاندھی نگر) 2005ء
(17)	اردو شاعر کا تہذیبی وفکری پس منظر (عہد میر تک)	پروفیسر محمد حسن	اردو اکادمی دہلی 1989ء - سیما آفسیٹ پریس، دہلی
(18)	گجرات کی علمی-ادبی اور ثقافتی وراثت (جرنل)	پروفیسر محی الدین بمبئی والا 2007	دہلی قومی کونسل 1998
(19)	اردو شاعری میر سے پروین تک	قاضی مشتاق احمد	ایچ ایس آفسیٹ پریس نئی دہلی - 2002ء
(20)	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین	ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو ویسٹ بلاک آر کے پورم، نئی دہلی 1983
(21)	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ - مترجم : مرزا محمد عسکری ادارہ کتاب الشفاء	
(22)	تاریخ اولیاء گجرات ترجمہ مراۃ احمدی	مترجم : مولوی سید ابوظفر ندوی صاحب تاجر پانچ پٹی احمد آباد	گجرات اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر
(23)	تاریخ ادب اردو اٹھارویں صدی (ج دوم)	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
(24)	شعرائے گجرات	ایم اے شعلہ	1983
(25)	مرأۃ سکندری	اردو اکادمی گاندھی نگر	1985
(26)	تاریخ مصطفیٰ آباد	جناب شیخ غلام محمد ابن عابد میاں صاحب مرحوم	مطبوعہ کریمی پریس بمبئی 1931ء، 1350 ھ
(27)	رسالۂ زبان		خدابخش اورینٹل لائبریری 1926 - 1928
(28)	سابر نامہ		گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر 1985, 1988, 1990, 1999, 2004, 2005, 2006
(29)	مجموعۂ غزلیاتِ منظور		1852ء سورت
(30)	تاریخ پالن پور	سید گلاب میاں صاحب میر منشی	نبان پریس دہلی 1914
(31)	غنچۂ ارم - علوی		1881ء سورت

(32)	جامع الحکایات	محمد عوفی	کھمبات
(33)	دیوان فدا	سید اشرف کچھوچھوی	عثمانی پریس مدراس 1979
(34)	افسر مودودی حیات اور شاعری	سید اشرف کچھوچھوی	عثمانی پریس مدراس 1979
(35)	خزینۃ الانساب	احمد افسوں مہروائی	نظامی پریس بدایوں 1959
(36)	طبقات حسام شاہی	حسام خان	1528 کھمبات
(37)	گلزار طیبہ		کلیم بک ڈپو
(38)	میخانۂ حسین	فخرالدین فخر	احمدآباد
(39)	یادوں کے سائے	محمد نقی جاوید انصاری	خطیب کتاب گھر 2001
(40)	تاریخ فرشتہ	محمد قاسم فرشتہ	
(41)	ગુજરાતની અસ્મીતા	રજની વ્યાસ	અક્ષરા પ્રકાશન - ગુર્જર પ્રકાશન રતનપોળ
(42)	જૂનાગઢ અને ગિરનાર	શંભુ પ્રસાદ દેસાઇ	૧૯૭૫ અને ૧૯૯૦
(43)	ઐતિહાસિક નગરી અમદાવાદ	રત્નમણિરાવ ભીમરાવ જોટે	અકદસ પ્રકાશન બેગમપુરા - ૨૦૦૬
(44)	ગુજરાતની સલ્તનત	સંભુ પ્રસાદ હરપ્રસાદ દેસાઇ	ગુજરાત સાહિત્ય અકાદમી - ૧૯૯૧
(45)	મંગલપુરી માંગરોલ	સંભુ પ્રસાદ હરપ્રસાદ દેસાઇ	પ્રભાસ પ્રકાશન - ૧૯૯૩
(46)	ભરૂચ શહેરનો ઈતિહાસ	ગણપત હિંમતરાય દેસાઇ	જ્ઞાનોદય પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ ૧૯૧૪
(47)	ખંભાત શહેરનો સાંસ્કૃતિક ઈતિહાસ	નર્મદા શહેર ત્રિબેકરામ ભટ્ટ	સ્ટેશન રોડ આનંદ, ચરોત્તર પ્રિન્ટીંગ પ્રેસ - ૧૯૭૬

Catelogue

(1) A discription Catalogue of Arabic, Persian, & Urdu MSS in the library of Mumbai University - 1935

(2) Catalogue of Persian, Arabic & Urdu MSS in Pir Mohd. Shah Library Vol. I to VII

(3) Catalogue of Persian, Urdu & Arabic MSS in the B. J. Institute Ahmedabad. Vol. I & II. By C. R. Naik

(4) Supplementary Catalogue of Persian, Urdu MSS in the B. J. Institute, Ahmedabad. M. G. Qureshi

Gazetteers of India Gujarat State Gazetteers

Surat District.

1st Addition - 1877

- Printed in India by the manager. Govt. Printing and Stationery, Rajkot.
- Published by the Director, Govt.
- Printing, Stationery and Publications. Gujarat state Ahmedabad.

Vadodra

1st Addition - 1879

- Printed in India by the Manager. Govt. Printing and Stationery, Vadodra.
- Published by the director, Govt.
- Printing, Stationery and Publications. Gujarat state Ahmedabad.

Junagadh

1st Addition - 1975

- Printed in India by the Manager. Govt. Printing and Stationery, Junagadh.
- Published by the director, Govt.
- Printing, Stationery and Publications. Gujarat state Ahmedabad.

Ahmedabad

1st Addition - 1984

- Printed in India by the Manager. Govt. Printing and Stationery, Ahmedabad.
- Published by the director, Govt.
- Printing, Stationery and Publications. Gujarat state Ahmedabad.

Palanpur

1st Addition - 1975

- Printed in India by the Manager. Govt. Printing and Stationery, Palanpur.
- Published by the director, Govt.
- Printing, Stationery and Publications. Gujarat state Ahmedabad.

Bharuch

1st Addition - 1975

- Printed in India by the Manager. Govt. Printing and Stationery, Bharuch.
- Published by the director, Govt.
- Printing, Stationery and Publications. Gujarat state Ahmedabad.

فقہی مخطوطات جو منظوم ہیں

- فقہ ہندی از عبدالکریم شیخ اشرف انصاری 1251ھ
- فقہ مبین - یقینؔ 1182ھ کی تصنیف ہے۔
- فقہ آسان - عرفانؔ 1240ھ

ذاتی بیاض - پرنسپال خطیب صاحب مرحوم، گودھرا

ذاتی بیاض - قاضی صاحب مرحوم، بھروچ

●